سویرا

آغازِ سخن

شاید کبھی افشاء ہو نگاہوں پہ تمہاری
ہر سادہ ورق جس سخن کشتہ سے خوں ہے

شاید کبھی اس گیت کا پرچم ہو سرافراز
جو آمدِ صرصر کی تمنا میں نگوں ہے

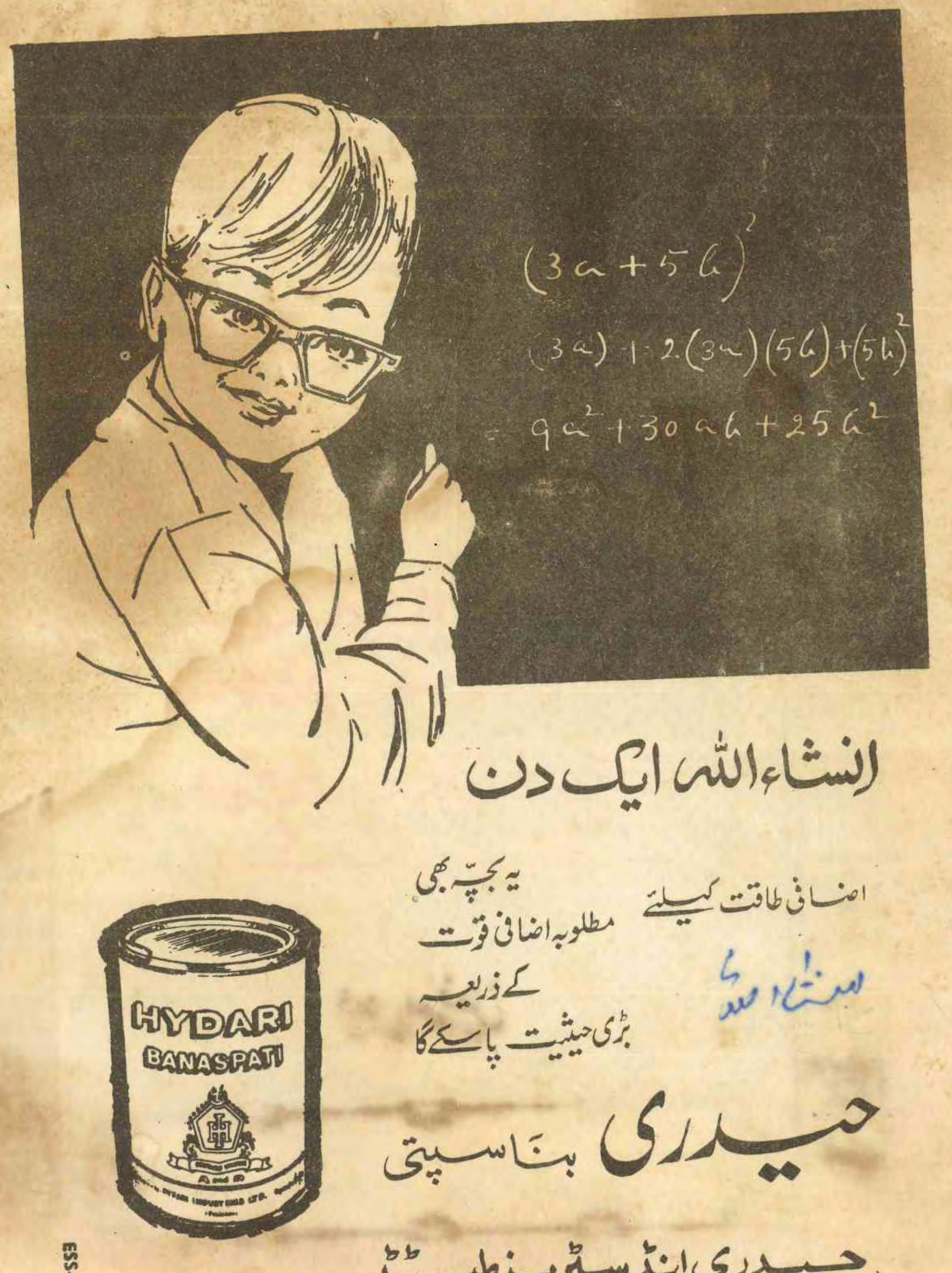
شاید کبھی اس دل کی کوئی رگ تمہیں چبھ جائے
جو سنگِ سرِ راہ کی مانند زبوں ہے

فیض احمد فیض

مدیر: سبط اختر

سالنامہ

ایک روپیہ



$(3a+5b)^2$
$(3a)^2+2(3a)(5b)+(5b)^2$
$=9a^2+30ab+25b^2$
انشاءاللہ ایک دن
یہ بچہ بھی
اضافی طاقت کیلئے
مطلوبہ اضافی قوت
کے ذریعہ
بڑی حیثیت پاسکے گا
HYDARI
BANASPATI
حیدری بناسپتی
حیدری انڈسٹریز لمیٹڈ
ESS-TEE

حیات وکائنات کا ترجمان

منشور

جلد نمبر ۲	مدیر سبط اختر	شمارہ نمبر ۱

سالنامہ

جنوری ۱۹۶۵ء

قیمت فی پرچہ	سال بھر کیلئے	چھ ماہ کیلئے
ایک روپیہ	تین روپے	ایک روپیہ پچاس پیسے

ناشر:- سبط اختر

مطبع:- سپر آرٹ پریس فریر روڈ کراچی

پتہ

منشور:- ایروبیزا ایمپلائز یونین پی آئی اے برانچ کراچی
ایئرپورٹ - فون نمبر ۴۹۱۶۹

اس منشور میں

طنز و مزاح

فلم

عکس و تصوّر

خبرنامہ

تراشے

لوگ کہتے ہیں

کتابت
ادارۂ لوح و قلم
★
ثناء اللہ ذکاء اللہ - 67/13 H پٹیل پاڑہ
کراچی ۵

Habib Bank Limited

(پاکستان میں تشکیل شدہ)
قائم شدہ ۱۹۴۱ء

میں تو بچاتا ہوں

اور آپ؟



روپیہ بچائیے کل کام آئے گا۔

حبیب بینک لمیٹڈ

مشرقی اور مغربی پاکستان میں ۳۰۰ سے زائد شاخیں

.... جنوں کی حکایاتِ خونچکاں

ساتھیو! سالِ کہنہ چلا گیا اور سالِ نو آگیا ہے : مبارک ہو!

حرکت و نمو کی قوتیں، تغیر و تبدل کے اٹل فرمان جاری کرنے سے کبھی نہیں چوکتیں۔ زمین گردش کرتی رہے گی، سورج غروب و طلوع ہوتا رہے گا، پھول مرجھاتے اور کھلتے رہیں گے، بوڑھا ماضی اندھیروں میں گم ہو گیا ہے حال ہمارے سامنے سربسجدہ ہے اور مستقبل کی حسین دیوی ہمارے لئے فرشِ راہ بنی کھڑی ہے۔ آگے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے گذشتہ تجربات فراموش نہ کریں۔ آنکھیں بند کر کے چلنے والوں کے نصیب میں در در کی ٹھوکریں کھانے اور منہ کے بل گرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا ——!

ہر نئی چیز سے اچھی اور نیک امیدیں وابستہ کی جاتی ہیں لہٰذا سال نو کے منصوبے مرتب کرتے اور کمرِ ہمت کستے ہوئے ماضی کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا پشتارہ اٹھا کر پھینک دینا، ہمارا اور آپ کا فرض اوّلین ہے۔ "منشور" نے جنوری سنہ ۶۴ء سے لے کر اب تک جو کچھ حاصل کیا وہ سب آپ کے سامنے ہے۔ نامساعد اور غیر یقینی حالات سے نبٹنے کے ساتھ ہی ساتھ ایک ایسا پرچہ جاری رکھنا آسان نہ تھا جو مزدور تحریک سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی برصغیر ہند و پاک میں اپنا ادبی مقام پیدا کرے۔ ملکی صحافت جس نہج پر چل رہی ہے اور اس وقت یہ جن مشکلات اور پابندیوں سے دوچار ہے انکے پیشِ نظر دراصل لب کشائی کی جرأت کرنا بھی قابل تعزیر جرم کی نوعیت رکھتا ہے۔

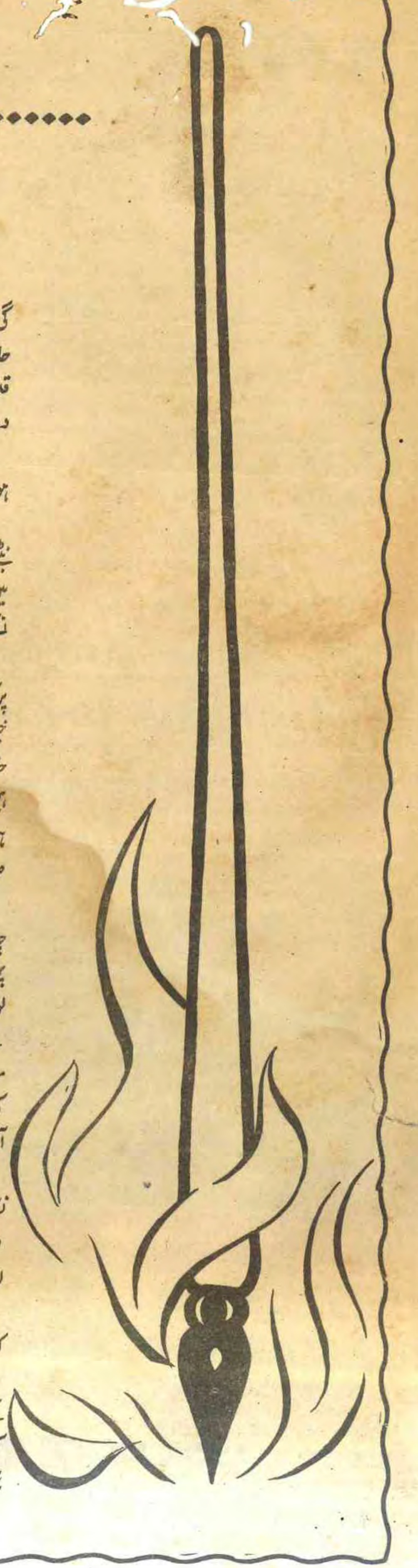
پچھلے سال دنیا میں کیا کچھ ہوا، کتنے انقلاب آئے، عالمی تاریخ اور سیاست کا دھارا کس رخ پر مڑا اور ہماری زندگی و مستقبل پر کیا اثر پڑا۔ یہ ساری باتیں سوچنے اور سمجھنے کی تھیں، سوچا اس انداز میں نہیں کہ غیر ملکی پریس کیا کہتا ہے۔ سرکاری و نیم سرکاری خبر رساں ادارے کیا خبریں دیتے ہیں، زباں بندی کا خوف کرتے ہوئے ہمیں مصلحتاً کیا کہنا چاہیئے بلکہ سوچا اس طور پر کہ حقائق کیا ہیں۔ ان کا بے لاگ تجزیہ کرنے کے بعد منطقی نتائج کیا نکلتے ہیں اور ان نتائج کی روشنی میں ہمارا ردِ عمل کیا ہونا چاہیئے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم نے صاف صاف اور حقیقت پسندانہ اندازِ فکر اختیار کیا۔ ہم نے وہی کچھ کیا جو ہم "حق" سمجھتے تھے۔ یہی ہمارا اصل معیار تھا اور یہی ہماری کھری کسوٹی تھی —— ہم آپ سب کے تہِ دل سے شکر گذار ہیں کہ آپ نے سچائی اور صداقت کے اس برملا اظہار پر ہماری طرف تعاون و اشتراک اور مقبولیت و سرپرستی کے صد بہار پھول پھینکے۔

مظلوم ہموطنو! ہم ان پھولوں کی تر و تازگی اور مہک و خوشبو سے آخر کس طرح لطف اندوز ہوں جبکہ اپنے دیس میں چاروں سمت تاریک اجالے چھائے ہوئے ہیں اور جنگے دھندلکوں میں آج بھی خونِ دہقاں ارزاں ہے، محنت کش، پریشان ہے، چشمِ حوّا، گریاں ہے، دستِ ہنرمند، بے جاں ہے، نکھٹو، صاحبِ ساماں ہے، ظلم و جور، رقصاں ہے لوٹ کھسوٹ فراواں ہے، قصرِ امارت، تاباں ہے۔ فکرِ انساں، حیراں ہے، پٹا ہوا شاطر، جولاں ہے، اجھو رچاک گریباں ہے، صحنِ گلشن، بیاباں ہے، مادرِ گیتی، ترساں ہے، قلبِ اغیار فرحاں ہے اور حق گو، داخلِ زنداں ہے۔ غرضیکہ ملکی مسائل سے چشم پوشی بے اعتنائی اور فرادیت کیہ ساری علامات اور یہ سارے مظاہر ہمارے اس زوال پذیر معاشرہ کی انوکھی سوغات ہیں جنکی وجہ سے ہمارے ذہن تو علم و دانش کی تابناک کرنوں سے منور نہ ہو سکے۔ لیکن ہماری آنکھیں زر و جواہر کی چمک دمک سے ضرور چندھیا کر رہ گئی ہیں۔

ہمسفرو! منزل دور ہے تو کیا ہوا۔ راستہ طویل اور کٹھن ہے تو ہوا کرے۔ ہمیں اپنے پیروں سے کانٹے نکالنے کی خاطر پڑاؤ نہیں ڈالنا، سنگ زنی اور آبلہ پائی سے ہراساں نہیں ہونا اگر ہم شعلہ بداماں رہے اور لیلائے وطن پر قربان ہونے کے لئے ہمارا جذبہ زندہ اور مستحکم رہا تو یہ طے شدہ امر ہے کہ غنیم یقیناً پشیماں اور ہمارا مستقبل لازماً درخشاں ہوگا۔

جنوری سنہ ۶۵ء سے "منشور" ایک نئے دور میں داخل ہو رہا ہے اس وقت ہم ایک بار پھر یہ دہرا ئیں کہ منشور کے صفحات حیات و کائنات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کیلئے کشادہ ہیں وہ تمام عناصر جو حیاتِ انسانی کی راہ میں روڑا بننے کی کوشش کرتے ہیں، جو انسانیت کی اعلیٰ اور ترقی پسند اقدار کے مخالف ہیں، جو انصاف، امن اور آزادی کے دشمن ہیں "منشور" انکا دشمن ہے، ہم انکو ہر قدم پر بے نقاب کریں گے۔ اور وہ عناصر، جو محبت، خلوص، مساوات، بھائی چارہ، تنظیم، تعمیر اور تخلیق کے حامی اور علمبردار ہیں۔ دکھی انسانوں کے دوست ہیں "منشور" انکا دوست ہے ہم انکو ہر ہر گام پر سینے سے لگائیں گے۔

محنت کشوں کے پیغام کی اشاعت، تمام انسانوں تک —— "یہی ہمارا "منشور" ہے۔





ادیب کے مسائل

ممتاز حسین

تبل اس کے کہ ادیب کے مسائل کے متعلق کچھ گفتگو کی جائے اس امر کا تعین ضروری ہے کہ ادب سے کیا مراد ہے اور ادیب کسے کہتے ہیں۔

ادب ہر تحریر و تقریر کو نہیں کہتے ادب کا اطلاق صرف اس قسم کی تخیلی نگارش پر کیا جاتا ہے جس کا اطلاق انسانی روابط سے ہوتا ہے اور جس کا مرکز انسان ہوتا ہے اور جس میں اسلوب کے معیار کو خاص اہمیت دی جاتی ہے چونکہ اس تعریف کے تحت فلسفہ اور تاریخ کی بھی بعض کتابوں کو ادب کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے اس لئے چند جملوں میں ادب فلسفہ — اور تاریخ کے فرق کو بھی واضح کر دینا ضروری ہے۔

تاریخ گذرے ہوئے واقعات کو قلمبند کرتی ہے اس کے برعکس ادب گذرے ہوئے واقعات کو بحیثیت خام مواد کے استعمال کرتا ہے لیکن وہ ان... واقعات کو انسانی نفسیات کے ممکن الوقوع حادثات کی حیثیت سے پیش کرتا ہے نہ کہ عین تاریخی واقعات یا تاریخی خصوصی کی حیثیت سے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ رسم عام کے مطابق ادب تاریخی واقعات کے بجائے تخیلی واقعات سے کام لیتا ہے جنکی واقعیت اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ وہ قانون ممکن الوقوع کے مطابق ہوتے ہیں ادبی تخلیقی واقعات من گھڑت ہوتے ہیں نہ کہ خلاف فطرت۔

فلسفہ اور ادب کا فرق یہ ہے کہ فلسفہ خصوص سے کی طرف گامزن ہوتا ہے جو کہ اسکا منتہائے عمل ہے اس لئے وہ سے لوٹ کر خصوص کی طرف نہیں آتا اس کے برعکس چونکہ ادب کا نصب العین تعمیم نہیں بلکہ تخصیص ہے اس لئے ادب جہاں عالمگیریت اور ابدیت کی خاطر خصوص سے عموم کی طرف بڑھتا ہے وہاں وہ پھر لوٹ کر خصوص کی طرف آجاتا ہے کہ اس کا مقصد حقیقت کی تجسیم ہے نہ کہ تعمیم کچھ لوگوں نے اس فرق کو یوں بھی واضح کیا کہ مجرد فلسفہ فلسفہ ہے اور محسوس فلسفہ ادب ہے کسی حد تک یہ بات صحیح ہے لیکن تمام تر نہیں کیونکہ ادب اپنی اعلیٰ صورت میں یا تو افسانہ ہے یا شاعری اور یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ ان میں تخییل اور احساسات کا عمل بہت ہی واضح صورت میں محسوس کیا جاسکتا ہے اس کے برعکس فلسفہ میں تخییل اور احساسات کو اتنی جگہ نہیں ملتی جتنی کہ فکر محض اور اس کی منطق کو۔ اسمیں شبہ نہیں کہ تخییل کا ایک سرا وجدانی فکر کے ساتھ ملا ہوا ہے جس سے آزاد ہو کر تخییل بے معنی ہے۔ لیکن جس حد تک کہ تخییل میں بصری تصویروں کو خاص اہمیت دی جاتی ہے اس حد تک یہ کہا جاسکتا ہے کہ کم از کم ادبی تخییل کا کام فکر نہیں بلکہ فکر کو محسوس صورت میں پیش کرنے کا ہے چنانچہ یہی سبب ہے کہ اس زمانے میں تخییل کی بھی چار قسمیں کر دی گئی ہیں یعنی سائنسی تخییل فلسفیانہ تخییل تاریخی تخییل اور ادبی تخییل اب آخر میں ادبی اسلوب کے معیار سے متعلق کچھ باتیں اشارتاً کہنا چاہوں گا۔ سوال یہ ہے کہ اسلوب کا وہ کون سا معیار ہے جس کی بنیاد پر کسی تخلیقی نگارش کو ادب کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے اور جسکے نہ پائے جانے سے تخلیقی نگارش بھی ادب کے معیار سے ساقط ہو جایا کرتی ہے کیا وہ شے زبان کی صحت اور درستی ہے؟ تو یہ تو کسی بھی تحریر کی اولیں شرائط میں سے ہے اسکا تقاضہ تو ہر قسم کی صحافتی اور علمی تحریروں میں کیا جاتا ہے اس سے ادبی اسلوب کے پہچاننے میں کوئی مدد نہیں ملتی ہے ادبی اسلوب کی پہچان اس بات میں ہے کہ اس میں کوئی بھی بیان مجرد تعمیمات پر نہیں ہوتا ہے بلکہ محسوس اور مرئی تصور کی بنیاد پر۔ اس میں کوئی بھی ادراک تخییل اور احساسات سے عاری نہیں ہوتا مزید یہ کہ اس میں ایک قوت... اور زندگی ہوتی ہے جو اس امر کی شاہد ہوتی ہے کہ یہ ایک متموج اور... حساس روح کی تخلیق ہے نہ کہ خالصتاً تجریدی ذہن کی اس چیز کو الفاظ کی گھن گرج سے نہیں — بلکہ آہنگ کے مدوجزر لہجہ کی گویائی اور لکھنے والے کے خلوص کی اس سادگی سے محسوس کیا جاتا ہے جو ہر قسم کی دوئی اور حجابات کے منافی ہے — اپنی روح کو دوسروں کیلئے شفاف بنانا اپنی روح کی سچائی کو پہنچنے کے مترادف ہے یہ چیز اسلوب میں ہر قسم کے تصنع اور آرائش کے مخالف ہے۔

لیکن ادب کی یہ ساری تعریف وضعی ہوتی ہے۔ اس سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا ہے کہ سماجی زندگی میں ادب کا کیا کام ہے اور یہ ادبی تخلیق کیوں ہے۔

کچھ فلسفیوں کا کہنا ہے کہ ادب انکشاف ذات ہے بعض مفکرین اسے وافر انرجی کا ایک اخراج بصورت شعل تصور کرتے ہیں یعنی یہ ایک قسم کا کھیل ہے اور بعض ماہرین نفسیات اسے جنسی جذبے کی ایک شکست خوردہ لیکن مرتفع صورت بتاتے ہیں جس کا مقصد اس سے زیادہ نہیں کہ یا تو اس عمل سے تہذیب اور جنس کی مزید کشش پیدا ہو یا تسکین جنس کے عمل کو حقیقت سے اٹھا کر تخیل کی دنیا میں منتقل کر دیا جائے یا پھر اس بات کو اس کا مقصد ٹھرایا جاسکتا ہے کہ لکھنے والا اپنے فنکارانہ کارناموں کے خوبصورت پر لگا کر بقول غالب اس امر کا مدعی بنے ؎

سیکھے ہیں مہ رخوں کیلئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے

یہاں اس کا موقعہ نہیں کہ میں

اس پر بحث کروں کہ ان نفسی اور وجودی توجیہات میں کتنی سچائی ہے میں تو یہاں صرف اس بات کو ابھارنا چاہتا ہوں کہ جب فرد کو پہلے اور سماج کو بعد میں تصوّر کیا جائے گا تو فلسفی لازماً فن کو فنکار کی نفسیات ہی میں تلاش کرے گا لیکن اگر اس طریقۂ فکر کے بجائے اس بات کو مان لیا جائے سماج زندگی نے فرد کو اہمیت بخشی ہے تو پھر فن کے ماخذ کی تلاش کا میدان بھی بدل جاتا ہے۔ آج جب کہ سماجیات اور انسانیات کے اعلیٰ مفکرین یہ بتاتے ہیں کہ انسان کا ذہن اور نطق دونوں ہی اس کی سماجی زندگی کا عطیہ ہے تو کیا اسے باور کرنے میں دشواری ہوتی ہے کہ ان کے تمام فنون کا ماخذ اس کی سماجی فطرت میں تلاش کرنا چاہیئے نہ کہ اس کی حیاتیاتی ______ BIOLOGICAL فطرت میں۔ اس میں شبہ نہیں کہ سماج ایک مجرد تصور ہے لیکن جب ہم اپنی عادتوں، اپنی پسند و ناپسند اپنے جذبات و اقدار حتیٰ کہ افکار اور زبان پر غور کرتے ہیں تو پھر ہمیں سماج کا ہات ہر جگہ نظر آتا ہے۔ سماج ایک خاندان بھی ہے اور ایک قبیلہ - ایک بستی ایک شہر اور ملک بھی۔ انسان حیاتیاتی نقطۂ نظر سے صرف عمومی میلانات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اس سے آگے اس کا تی وجود اسے کچھ بھی نہیں دیتا چلنا بولنا سوچنا محبت کرنا نفرت کرنا محسوس کرنا خوش و ناخوش کرنا یہ ساری باتیں وہ اپنی سماجی زندگی سے ہی حاصل کرتا ہے چنانچہ اگر وجودی مفکرین کے اس نظریہ کو مان بھی لیا جائے کہ فن لطیفہ انکشاف ذات ہے تو پھر اس سماجی نقطۂ نظر سے جس کی وضاحت میں نے اوپر کی ہے وہ اس کی سماجی ذات کا انکشاف ہے نہ کہ اسکی حیاتیاتی ذات کا جو ایک وجود فی الذات منجملہ اشیائے بے شعور ہے نہ کہ وجود برائے خود یا باشعور۔ یہ اصطلاحات انہیں فلسفیوں ہیں اب سوال یہ ہے کہ اس فن کا جو سماجی ذات کے انکشاف کا ایک ذریعہ ہے سماجی کام کیا ہے؟ ایک شعبدۂ حرف و صوت کہ تماشا کہیں جسے ——— ؟" یا یہ کہ "آئینہ دہم بدست محفل، کہ نظارہ کہیں جسے؟ ادب ایک آئینہ ندامت اور ایک آئینہ آرزو دونوں ہی ہے انسان وہ واحد حیوان ہے جو آدرش کار بھی ہے وہ نئی سے نئی منزل حیات کا تعیّن کرتا رہتا ہے اور ایسا ظالم تمنا شکار ہے کہ ہر شکست آرزو پر اک نئی آرزو کا خالق بنتا ہے۔ ہم انسان کی اس فطرت سے گریز نہیں کر سکتے اس سے یہ ظاہر ہوا کہ ادیب کا کام اگر ایک طرف آئینے کو صیقل کرتے رہنا ہے یعنی فن کو برابر ترقی دیتے رہنا ہے تو دوسری طرف اصلاح تہذیب اور ترقی حیات بھی اس کا کام ہے دور حاضر میں ادبی نظریات کی کش مکش ان دو متوازن نظریوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک طرف جذبہ ندامت سے چور اپنی پستی پر مسرور ایک گروہ شکست آئینہ اور شکست تہذیب

میں ایمان رکھتا ہے تو دوسرا انسان کی بلندی پر سرشار صیقل آئینہ اور تزئین حیات پر ایمان رکھتا ہے چونکہ انسانی زیست کی سچائی کوئی ایسی معروضی سچائی نہیں ہے جسے انسان کے عزم و ارادے سے آزاد کر کے دیکھا جا سکے اس لئے ان نظریات میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے میں جہاں کچھ خارجی اسباب کام کرتے ہیں وہاں اس کے آزادیٔ انتخاب کو بھی دخل ہے یہ اپنے اپنے حوصلہ کی بھی بات ہے۔

تو قصّہ یہ ہے کہ جس کو آشوب آگہی کے اظہار کا حوصلہ ہوا اور جس کو فطرت نے بھی اس منصب کیلئے ودیعت کیا ہو کہ فطرت اس معاملے میں بہت بخل سے بھی کام لیتی ہے تو وہ دو باتوں کو خاص طور سے گرہ کرے۔ ذہنی تخلیق کا عمل نہ تو میکانکی ہے اور نہ ذہنی تخلیق کوئی مادی تخلیق ہے جس کو بازار میں بیچ کر گذارہ کیا جا سکے اس کا ناتا پیغمبری سے ملتا ہے پیغمبر اپنی اُمّت پیدا کرتا ہے نہ کہ اپنی پیغمبرانہ صلاحیتوں کا کوئی معاوضہ یا کسی مصلحت کے دار پر فروخت کرتا ہے شاعر کی پیغمبری کو اس وجہ سے نہیں جھٹلایا گیا ہے کہ اس کا کلام جھوٹا ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہ کلام اور کردار میں تضاد ہوتا ہے۔ وہ گفتار کا غازی ہوتا ہے نہ کہ کردار کا کیا یہ کمزوری شاعر کی فطرت کا کوئی ایسا اصول ہے جو ناقابل اصلاح ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر اس کو کوئی اس کی تذلیل سے روک نہیں سکتا۔ اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ وہ ایسا اس لئے ہے کہ وہ چیزوں کو ان کے آدرشی پہلو سے دیکھتا ہے نہ کہ عملی پہلو سے۔ اور اس سے آدرش اور حقیقت کے تضاد میں مبتلا رہتا ہے تو پھر ہمیں اس کی فطرت پر سختی نہ کرنی چاہیئے کہ وہ ناظم جماعت سیاست داں تحمل کا آدمی نہیں ہے بلکہ اپنی بیکاری سے فائدہ اٹھا کر سوچنے اور خواب دیکھنے کا کام کرتا ہے اس کیلئے بیکار ذہنی تخلیق کیلئے اتنی ہی اہم ہے جتنا کہ کسی عملی آدمی کیلئے کوئی کام اور کسی خالی الذہن کیلئے کوئی شغل۔ وہ چوبیس گھنٹے سوتے جاگتے اپنے ہی خیال سے الجھا رہے گا۔ اور ایک جھگڑا زمین و آسمان سے مول لے گا وہ کوئی دوسرا کام بجز اس کے کیا کر سکتا ہے کہ اپنے اس جھگڑے کو نمٹاتے۔ چنانچہ اس سلسلے میں اس کو وہ تمام سہولتیں بہم پہنچانی چاہیئں۔ جن کا وہ اپنے اس کام کی نسبت سے حقدار ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس کی ذمہ داری بھی عظیم ہے وہ ناقد حیات ہے نہ کہ بادہ فروش اقتدار۔ اس کا کام زندگی کی قدروں اور اس کے مقاصد کی تقریظ ہے نہ کہ کسی جبر و ترغیب کے زیر اثر خیال فروشی اور ضمیر فروشی — اس کے اس عمل کا احتساب عوام کرتے ہیں نہ کہ ریاست کی کوئی مشینری۔ کیونکہ ریاست خواہ وہ کسی فلاحی مملکت ہی کی کیوں نہ ہو ہمیشہ جبر کا ایک آلۂ کار رہتی ہے اور اس کا

ایک تضاد عوام سے موجود رہتا ہے چنانچہ سچے ادیبوں کی ایک کشمکش ہمیشہ ریاست یا حکومت کے ساتھ رہتی ہے کیونکہ وہ زندگی کے تضاد کو پیش کرتے ہیں اور حال سے مطمئن رہنے کے بجائے مستقبل پر نظر رکھتے ہیں ادیب ہمیشہ نکتہ چیں ہوتا ہے چنانچہ اس کی دوستی عوام سے بھی اسی لئے ہوتی ہے کہ وہ حکومت کا آدمی نہیں ہوتا اور جہاں یہ لیبل کسی شاعر یا ادیب پر چسپاں ہوا اس کی ساکھ ختم ہو گئی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر وہ حکومت کی مشینری کا حصہ نہیں بن پاتا ہے اور اسے کسی خیال فروشی کے کام میں بھی استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تو پھر حکومت کیوں اس کے ساتھ مربیانہ سلوک کرے۔ یہ ایک اہم سوال ہے۔ لیکن اس کا جواب اتنا پیچیدہ ہے کہ میں اسے بہت آسان بنا کر پیش کرنے سے قاصر ہوں — اگر حکومت عوام کی ہے اور اسے عوام نے اس خدمت پر معمور کیا ہے کہ وہ سوسائٹی کے قسم کے استحصال کا قلع قمع کرے اور پوری سوسائٹی کو ایک آزاد فضا میں کسی ایسے جمافتی نصب العین کی طرف آگے بڑھائے جسکی تشکیل میں عوام کی اکثریت نے خود حصہ لیا ہے تو پھر اس حکومت کے فرائض میں یہ شامل ہے کہ وہ ناقدین حیات کی آزادی کی ضمانت دے آئینی اور رسمی دونوں طرح کی اور انہیں وہ تمام سہولتیں بغیر ممنون احسان کئے ہوئے بہم پہنچائے جس کے وہ اپنے کام کی نوعیت کی رو سے حقدار ہیں۔ لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ اپنی ضروریات کو اپنے کام کی نوعیت کے حدود ہی میں رکھیں گے اور اپنی غیر مقید آزادی اور سہولتوں کو غیر ذمہ داری کے رویہ میں تبدیل نہ کریں گے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں باتوں کی روک تھام کو سماجی احتساب پر چھوڑنا چاہیئے کہ عوام کی نکتہ چینی اور احتساب حکومت کے احتساب سے بھی زیادہ موثر ہے وہ عوام ہی سے نیک نام اور عوام ہی سے بدنام ہیں، یہ خوف ان میں نظم و ضبط خود احتسابی ذمہ داری ان میں سے ہر چیز پیدا کرے گی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی جدوجہد جس میں آزادی ذمہ داری کا سرچشمہ ہو اور جس میں احتیاج سے وابستگی آزادیٔ تخلیق کی ضامن ہو۔ ہر اس ادیب کے لئے لازمی ہے جو اپنے فن کو آئینۂ حقیقت تصور کرتا ہے اور اس امر کا مدعی ہے کہ اسکا بنیادی کام انسان کی آزادیوں کو وسعت دیتے رہنا ہے کہ انسانی وجود کا جوہر اس کی آزادی ہی ہے عبارت ہے حیوانی وجود سے انسانی وجود کی چھلانگ فطرت کے جبر سے آزادی کی ایک جست ہے اور یہ آزادی انسان کی غیر محدود بصورت شعور ہے۔ وہ اپنی آزادی کا حلقہ بہم وسیع کرتا رہتا ہے — اور ہر

بندش کو توڑ دیتا ہے جو اس [illegible] میں مزاحمت پیدا کرتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان بت گر و ہم و خیال بھی ہیں لیکن اسے کیوں [illegible] بھلا دیا جائے۔ کہ وہ فرزند آذر بھی ہے اور چونکہ ادیب کا ہاتھ زندہ انسانوں کی نبض پر ہوتا ہے نہ کہ مجرد تعمیمات پر اس لئے وہی اکثر آگے بڑھ کر ان بتوں کو توڑتے بھی ہیں۔ خوش نصیب ہے وہ معاشرہ جنہیں ایسے دو چار دیوانے موجود ہوں انہیں گھیر گھار کر خاموش رکھنا، توڑنا، غیر جانبدار بنانا اس قسم کے دوسرے ہتھکنڈوں سے کام لینا جس سے وہ اپنے ضمیر کے مجرم ہو جائیں معاشرے کے حق میں سخت مضر ہے اور اب صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہیں نہ کہ حیات جاوداں کی قوت اور اس کی موج در موج رفتار کو۔ جن کو جنت کی فضا راس نہ آئی ہو صرف اس لئے کہ اس میں جبر ہی جبر تھا اور اختیار نہ تھا وہ کیسے اس جنت کی آرزو کر سکتا ہے جس میں جبر ہی جبر ہو اور اختیار نہ ہو ادیب اسی۔ آزادی کا ایک سمبل ہے چنانچہ ادیب کا کوئی بھی مسئلہ بجز ان آزادیوں کے حصول کے ہے لیکن میں یہ بات لکھ ہی رہا تھا کہ غالب نے آواز دی ؏

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

اور پھر کہیں دور سے یہ آواز آئی ؂

پیٹ بڑا بدکار ہے بابا

اس آواز کو سنتے ہی نظیر اکبر آبادی کی وہ ساری نظمیں سامنے آ گئیں جو انہوں نے روٹی اور پیسے کے فلسفے کے متعلق لکھی ہیں اور دل یہ چاہا کہ اس بدکار پیٹ سے متعلق بھی کچھ فوری تجاویز بھی پیش کر دوں لیکن جب فوری تجاویز کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا تو بات اس سے آگے نہ بڑھ پائی کہ کیوں نہ تعلیم عام کر دی جائے کیوں نہ قومی زبانوں کو ان کا صحیح درجہ دیدیا جائے اور ان کے وجود کو موثر بنا دیا جائے کیوں نہ عوام کا معیار زندگی اتنا بلند اور تہذیب آشنا کر دیا جائے کہ کوئی بھی گھر کتاب سے خالی نہ ہو تاکہ ادیبوں کی کتابیں بک سکیں اور وہ ان کی آمدنی سے اپنے ولدر دور کر سکیں اور اگر اس ضمن میں کسی کا یہ خیال ہے کہ فوری طور سے یہ بھی ممکن نہیں کہ ہم لوگ اپنی غفلت شعاریوں کے مارے ہوئے ہیں۔ اور رسن بستہ ہیں تو پھر میں اس سے آگے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ جس سے کشادہ رزق ہو سو وہ بھی ہے شاعری اور جس سے ہر رزق کی ہر راہ بند ہو سو وہ بھی ہے شاعری اور جس سے نمود جسم ہو سو وہ بھی ہے شاعری اور جس سے فروغ جاں ہو تو سو وہ بھی ہے شاعری اور اگر ایسے میں کسی کو لاغری والی شاعری سے ہی پالا پڑ جائے اور اس پر پیغمبری وقت ہی ٹوٹ پڑے تو اس سے نمٹنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے پیغمبر کی سنت اختیار کرے۔

جوشؔ ملیح آبادی

کب تک

فقہ کی گرمیٔ بازار رہے گی کب تک — دست مجذوب میں تلوار رہے گی کب تک
سازِ تحقیق سے نکلے گی نہ تا کے آواز — تارِ تقلید میں جھنکار رہے گی کب تک
ذہن کے پاؤں کی زنجیر کٹے گی کس روز — سر پہ گرتی ہوئی دیوار رہے گی کب تک
مردہ اقوال کے سیلے ہوئے تہ خانوں میں — زندگی نقش بہ دیوار رہے گی کب تک
قصرِ افکار پہ اسلاف کے گھن کی آواز — ذہنِ اخلاف کی معمار رہے گی کب تک
جس کے گاہک مہ و خورشید ہیں آخر وہ نگاہ — سنگ ریزوں کی خریدار رہے گی کب تک
جنس کاسد کو گھنی چھاؤں میں رکھنے والو — دھوپ میں دولتِ بیدار رہے گی کب تک
نور کو خضر کا منصب نہ ملے گا تا چند — تیرگی قافلہ سالار رہے گی کب تک
آخر اس معرکۂ نفس کشی کی رو میں — قوم کی قوم خود آزار رہے گی کب تک
دامِ باطل سے جوانوں کو چھڑا سکتی ہے — پا بہ زنجیر وہ گفتار رہے گی کب تک
بول اے خسروِ انصاف کہ گلبانگ شعور — مستحقِ رسن و دار رہے گی کب تک
پیش زہادِ جنوں پیشہ و شمشیر بکف — سرنگوں جرأتِ انکار رہے گی کب تک
اے امیرِ افق و داورِ صبح تاباں — یہ گھٹا ٹوپ شبِ تار رہے گی کب تک
آخر اس آدمِ سر خفتہ کی پیشانی پر — شکنِ سبحہ و زنار رہے گی کب تک
اے مرے ولولۂ وحدتِ نوعِ انساں — ملک و ملت پہ یہ تکرار رہے گی کب تک

لے یہ سر رشتۂ کونین ہے اے ذوقِ جدل
آخر آپس میں یہ پیکار رہے گی کب تک



کرشن چندر

روح کی ساتھی



پریم کمار

نے پریم تو بہت سے کئے تھے لیکن شادی آج تک کسی سے نہیں کی تھی اگر وہ بے وفا نہیں تھا ہر بار جب اس نے کسی لڑکی سے پریم کیا سچا پریم سمجھ کر ہی کیا (یہ بات الگ ہے کہ اپنی چالیس برس کی زندگی میں اس نے اتنی بار سچا پریم کیا تھا کہ اب وہ ان کی گنتی بھی بھول چکا تھا) — لیکن یہ سچا پریم ہر بار جھوٹا پریم ثابت ہوا — اسمیں غلطی نہ پریم کمار کی تھی نہ لڑکی کی — مگر ہر بار پریم کمار کو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے جسم سے جسم تو ملے لیکن روح سدا پیاسی رہی، کچھ

ایسا لگا جیسے روح سے روح نہیں ملی، آتما آتما کی ساتھی نہیں بن سکی۔ (کوئی اس بھلے مانس سے پوچھے کہ جب روح سے روح نہیں ملی تو تمہیں جسم سے جسم ملانے کا کیا حق تھا) لیکن پریم کمار ایک کامیاب ہیرو تھا۔ صفِ اول کا ہیرو تھا۔ ہر سال لاکھوں روپے کماتا تھا اور کروڑوں لوگوں کے دلوں کا دیوتا تھا۔ ایسے دیوتا سے کوئی کیسے پوچھے؟ کہ مسٹر پریم کمار تم جو ہر سال دس لڑکیوں سے عشق کرتے ہو اور ہر موسم کے بدلنے پر اپنی لڑکی بدل لیتے ہو اور لڑکی کا دل یوں توڑ دیتے ہو جیسے عمدہ ڈنر کھانے کے بعد لکڑی کا خلال توڑ دیا جاتا ہے۔ تو صاحب یہ تمہاری محبت ہے کہ ہوس؟ مگر دیوتاؤں سے اور نیتاؤں سے اور ... سے ایسی باتیں کون پوچھ سکتا ہے۔؟

اس لئے چالیس سال تک پریم کمار سچا پریم کرتا رہا اور لڑکیاں بدلتا رہا اور کامیابی کے زینہ پر چڑھتا رہا اور فلموں میں کام کرتا رہا اور جہاں جاتا رہا سچا عشق کرتا رہا اور عشق کرتے کرتے چالیس برس کا ہو گیا لیکن کہیں اسے اپنی پسند کی لڑکی نہیں ملی۔ ایسی لڑکی جس کی روح اس کی روح سے میل کھاتی ہو۔ ہاں اسے جسم بہت ملے، درجنوں بلکہ سینکڑوں جسم، نوجوان اور خوبصورت جسم، بھولی مسکراہٹوں اور البڑ اداؤں والے جسم، من موہنے، حسین، دلکش جسم، اور اس کی کوئی شب جسم کے بغیر خالی نہ گئی۔ مگر اس کی روح سدا پیاسی اور خالی رہی اور وہ اپنے ساتھی کی تلاش میں ڈھونڈتا ڈھونڈتا چالیس برس کا ہو گیا۔ لیکن اسے اپنی روح کا ساتھی نہ ملا، لوگ اسے خوش قسمت سمجھتے تھے لیکن اس کا دل ہی جانتا تھا کہ وہ کتنا بدنصیب ہے۔ بینک میں تیس لاکھ رکھنے کے بعد بھی کتنا بدنصیب ہے۔ ہر روز ایک نئی لڑکی کے ساتھ سونے کے باوجود کتنا بدنصیب ہے؟ بعض لوگ بڑے بدنصیب ہوتے ہیں۔ پریم کمار کو دیکھ کر مجھے اکثر اس پر بڑا رحم آیا ہے اور اس پر ترس کھا کر کئی بار میں نے سوچا ہے، کاش پریم کمار کی بدنصیبی مجھے مل جاتی اور میری خوش قسمتی اسے! مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ میں پریم کمار کا دوست ہوں مگر ایک دوست بھی اپنی زندگی دوسرے کو نہیں دے سکتا۔ حالانکہ ایک دن میں نے اس کا ارادہ بھی کر لیا تھا اور اپنی خوش قسمتی اور اس کی بدنصیبی کا خیال کرتے ہوئے اس سے کہہ دیا تھا "دوست اگر تم چاہو تو تم میری زندگی لے سکتے ہو، میری بھینگی بیوی اور اس کے سات بچے لے سکتے ہو۔ میری کھولی معہ دو ٹوٹی ہوئی چارپائیوں، تین بستر اور دو زنگ آلود ڈرم لے سکتے ہو ... ساڑھے پانچ ہزار کا قرض جو مجھ پر واجب ہے وہ بھی لے سکتے ہو۔ اور تھرڈ کلاس لوکل ریلوے کا پاس بھی جو میں ہر ماہ بنواتا ہوں اور جس کے سہارے میں فٹ بورڈ پر لٹکے لٹکے باندرہ سے چرچ گیٹ تک جاتا ہوں تم وہ بھی لے سکتے ہو۔! دوست مگر مجھ سے تمہاری بدنصیبی دیکھی نہیں جاتی۔ روز رات کو وہسکی کی بوتل کھول کر جس طرح تم بلک بلک کر عورت کی روح کے لئے روتے ہو وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا! تم بتاؤ میں کیا کروں؟ جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب تم لے سکتے ہو!"

پریم کمار نے میری فراخ دلی سے متاثر ہو کر فوراً مجھے گلے سے لگا لیا اور سسک سسک کر بولا۔

"دوست ہو تو ایسا! تمہارا لاکھ لاکھ شکریہ مگر دوست کون کسی کے نصیب سے اپنا نصیب بدل سکا ہے؟ جس روح کی سچی محبت کی مجھے تلاش ہے وہ اگر خود سے مجھے نہیں مل سکی تو تمہارے سہارے سے کیا ملے گی۔ اور جہاں تک تمہاری عورت کا تعلق ہے میں اپنی بھابی کی بہت عزت کرتا ہوں لیکن اس بیچاری کے منہ میں دانت تو رہے نہیں روح کیا رہے گی۔؟ میں تمہارے بچے بھی تم سے نہیں چھین سکتا کیونکہ مجھے معلوم ہے تمہیں اپنے بچوں سے کتنا عشق ہے! تمہاری کھولی بھی میں تم سے نہیں چھینوں گا ورنہ تمہیں فٹ پاتھ پر رہنے سے بڑی تکلیف ہو گی اور میں اپنے کسی دوست کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا! تمہارا قرضہ بھی میں نہیں لوں گا ورنہ تم اور قرضہ چڑھا لو گے اور یہ تم سے دوستی نہیں دشمنی ہو گی۔ تمہارا تھرڈ کلاس کا پاس بھی نہ لوں گا ورنہ تم بلا ٹکٹ پکڑے جاؤ گے۔ غرضیکہ دوست کسی طرح سے ہم دونوں اپنی زندگیاں نہیں بدل سکتے، مگر تم زیادہ غم نہ کرو۔ میں اب چالیس برس کا ہو چکا ہوں۔ اب میں زیادہ دیر تک اپنی بدنصیبی کی صلیب اکیلے نہ اٹھا سکوں گا۔!"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اب میں بہت جلد شادی کر لوں گا یہ میں نے طے کر لیا ہے!"

"کس سے۔؟"

"یہ تو طے نہیں کیا ہے!"

"پھر بھی نظر میں تو کوئی ہو گی۔؟"

"فی الحال میری نظر میں دو لڑکیاں ہیں اور دونوں میری دو مختلف فلموں میں ہیروئن کا کام کر رہی ہیں۔ اور فی الحال میں دونوں سے محبت کر رہا ہوں۔!"

"دونوں سے، وہ کیوں؟"

وہ اس لئے کہ کیا معلوم ان دونوں میں سے کس کی آتما میری آتما سے مل جائے؟ اس لئے احتیاطاً دونوں سے محبت کر رہا ہوں اور اب میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اب اپنی زندگی میں زیادہ دیر تک بھٹکنا نہیں پڑے گا اور اب میری تلاش ان دونوں لڑکیوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ یقیناً ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک لڑکی ضرور ایسی ہو گی جو میری روح کی ساتھی ہو گی۔

ہولی کے دن اس نے بہت سے فلمی ستاروں کو پارلے ہل کی اپنی شاندار کوٹھی میں مدعو کیا تھا۔ دلیپ کمار، راج کپور، شمی کپور، راجندر کمار، بھارت بھوشن، دیو آنند، سادھنا، آشا پاریکھ، سائرہ بانو، جبیں جلیل، وحیدہ رحمان، جے راج، ڈیوڈ، کے این سنگھ، پران، اوم پرکاش، جانی واکر، سبھی فلمی ستارے اس نے بلائے تھے۔ کئی سال سے یہ روایت بن چکی تھی کہ ہولی کے دن سب لوگ اس کے گھر اکھٹے ہوتے تھے کیونکہ اس کی کوٹھی کا SWIMMING POOL بہت شاندار تھا۔ بہت بڑا تھا اور زیرِ آب رنگا رنگ روشنیوں سے اس طرح جھلملاتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ سوئمنگ پول کے پانی میں دھنک کے ساتوں رنگ بکھر گئے ہیں۔ اس سوئمنگ پول میں خفیہ ٹونٹیاں لگوائی گئی تھیں جن سے بوقتِ ضرورت طرح طرح کے رنگ دار پانی تالاب میں چھوڑے جا سکتے تھے۔ گلابی، سبز، نیلا، پیلا، جامنی، نارنجی رنگوں کے پانی چاروں سمتوں سے اندر کی ٹونٹیوں سے فوارے کی طرح زور سے نکل کر جب تالاب میں آ کر ملتے تو رنگوں کی کہکشاں سی بن جاتی۔ ہولی کے دن اس تالاب میں سب کو نہلایا جاتا تھا۔ اور جو نہانے پر تیار نہیں ہوتے تھے ان کو زبردستی تالاب میں پھینک دیا جاتا تھا۔ پھر بڑے زور کا قہقہہ بلند ہوتا۔ تالیاں بجتیں، ڈھول پیٹے جاتے اور آئی، ایس جوہر، مکری اور اوم پرکاش ملکر بھنگڑا شروع کرتے جس میں ہولے ہولے سارے فلم اسٹار شامل ہو جاتے۔

آج ہولی کی تقریب میں پریم کمار نے آرتی بالا اور آرادھنا دونوں کو بلایا تھا۔ آجکل وہ ان دونوں سے محبت کر رہا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک سے شادی کرے گا۔ مگر ابھی وہ ذہنی طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ کس سے شادی کرے!

کبھی تو اسے آرتی بالا بہت پسند آتی، کیونکہ آرتی بالا بہت ہی ہنس مکھ، شوخ اور چنچل لڑکی تھی بہت باتونی، ہر دم مذاق کرنے والی، قہقہے لگانے والی اور خوش رہنے والی اور چھیڑ چھاڑ کرنے والی، وہ کبھی خاموش نہیں بیٹھتی تھی۔ اگر شوٹنگ نہیں ہے تو سیر ہے، پکنک ہے سینما ہے، دعوت ہے۔ کسی کے ہاں کھانا ہے، یا کسی کو اپنے ہاں کھلانا ہے۔ یا کوئی دوسرا پروگرام قوالی ہے یا تھیٹر ہے۔ اسے ہر دم کوئی نہ کوئی مشغولیت چاہیئے۔ وہ چپ چاپ رہنے والے بور لوگوں کو قطعی پسند نہیں کرتی تھی۔ اگر پریم کمار کبھی سنجیدہ اور خاموش نظر آتا تو وہ فوراً اسے گدگدانے لگتی۔ اس پر تکیہ، تاش، جوتا، قلم، جراب، کتاب جو سامنے آ جائے پھینکنا شروع کرتی۔ یا تو اسے ہنسا دیتی یا خفا کر دیتی اور خفا کر کے تو بہت خوش ہوتی، کیونکہ جھگڑنے میں اسے بڑا مزا آتا تھا۔ جھگڑا کر کے وہ بہت سی انٹ شنٹ باتیں پریم کمار کو کہہ رہا تھا "بس ایک سو روپے کی بلائنڈ چلتا ہوں۔!"

کے این سنگھ بولا۔ "میں اپنی دونوں آنکھوں سے بلائنڈ چلتا ہوں۔"

مکری نے کہا "میں ایک آنہ کی بلائنڈ چلتا ہوں۔"

اوم پرکاش نے پوچھا "ایک آنہ ایک سو روپے

کے برابر کیسے ہو سکتا ہے!"

مکری بولا "ہو سکتا ہے اگر ہم سب لوگ ایمانداری سے ٹیکس دینے لگیں تو ایک آنہ ایک سو روپے کے برابر ہو سکتا ہے!"

اس پر شمی کپور نے وحیدہ رحمان اور سادھنا کو پانی میں غوطہ دے دیا اور سوئمنگ پول کے کنارے راگی اینڈ پوائنٹر کا بینڈ زور زور سے بجنے لگا۔ یہ روایت تھی کہ جب کبھی کوئی فلم ہیروئن پانی میں گرائی جاتی تھی کنارے پر بینڈ زور زور سے بجتا تھا اور لوگ پانی میں تیرتی ہوئی ہیروئن کی طرف پھول گجرے اور ہار پھینکتے تھے۔ پھر راج نے جبین اور شیاما کو پانی میں دھکا دیدیا۔ اور بینڈ زور زور سے بجنے لگا۔!

چند منٹ میں بیشتر فلمی تارے پانی میں کود گئے اور سوئمنگ پول کی ٹونٹیوں سے طرح طرح کے رنگ دار پانیوں کے فوارے چھوٹنے لگے اور وہ لوگ جھلملاتی ہوئی رنگین روشنیوں میں نہاتے ہوئے ایک دوسرے پر پانی پھینکتے ہوئے ہنستے ہوئے قہقہے لگاتے ہوئے ہولی کی بہاروں میں کھو گئے۔!

اتنے میں لوگوں نے دیکھا کہ ڈائیونگ بورڈ پر پریم کمار آرتی بالا کو لئے کھڑا ہے اور ہات کے اشارہ سے بینڈ کو دھن چھیڑنے کے لئے کہہ رہا ہے۔!

آرتی بالا نے ایک لمحہ کے لئے کسی طرح کی حجت نہیں کی۔ وہ مسکراتے ہوئے پریم کمار کے شانے پر ہات رکھے ہوئے ڈائیونگ بورڈ پر آئی۔ اس نے ہلکے جامنی رنگ کا ایک پھولدار بکنی سوٹ پہن رکھا تھا اور وہ بار بار اپنی کمر کو لچکاتے ہوئے اٹھلا رہی تھی۔ باتیں کرتے کرتے پریم کمار نے اسے دھکا دیا اور لوگوں کے شور کے درمیان آرتی بالا ایک ابابیل کی طرح بازو پھیلائے ہوئے ہوا میں اڑتی نظر آئی اور دوسرے لمحے میں دھم سے پانی میں کود گئی!

چند منٹ کے بعد پریم کمار ڈائیونگ بورڈ سے غائب ہو گیا حالانکہ پانی کی سطح سے ہات پھیلا پھیلا کر آرتی بالا اسے نیچے ڈائیو کرنے کو کہہ رہی تھی گویا اسے اپنی آغوش میں اترنے کو کہہ رہی تھی۔ مگر پریم کمار اب آرادھنا کو پانی میں گرانے کی فکر میں تھا اور سوئمنگ پول چھوڑ کر آرادھنا کو ڈھونڈنے کے لئے چلا گیا تھا اسے دیکھ کر آرادھنا اسی کے گھر کے ایک کمرے میں چھپ گئی تھی۔ کیونکہ وہ سوئمنگ پول میں نہانا نہیں چاہتی تھی۔ بڑی مشکل سے پریم کمار نے اسے ڈھونڈا۔ مگر آرادھنا کسی طرح تیار نہ ہوئی۔!

ستاتی تھی۔ روٹھ جاتی تھی، روتی تھی اور بڑی مشکل سے منائی جاتی تھی۔ اسے روٹھ کر من جانے میں بڑا لطف آتا تھا وہ تین لاکھ کی ایکٹریس تھی حالانکہ اس کی عمر صرف بائیس سال کی تھی۔!

لیکن پریم کمار کو آرادھنا بھی بہت پسند تھی۔ ایک تو اس کی عمر بھی کم تھی مشکل سے سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی مگر اٹھارہ برس کی عمر میں بھی جوانی گھٹا بن کر آرادھنا پر برسی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جوانی سے آرادھنا کا انگ انگ ٹوٹا جا رہا ہو۔ پریم کمار کو ایسا محسوس ہوتا کہ اگر اس نے آرادھنا کو ہات لگایا تو وہ ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔ اس کی جوانی اس کے سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ وہ زیادہ بات تو نہیں کرتی تھی۔ لیکن اس کا جسم بہت بولتا تھا اور اس کی آنکھیں بہت بولتی تھیں۔ اور اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں انگاروں کی سی آنچ تھی۔ آرادھنا بولتی کم تھی مگر کھینچتی بہت زیادہ تھی۔ اس کی کشش ایک مقناطیس کی طرح تھی۔ اور جب پریم کمار اس کے ساتھ سیٹ پر کام کرتا تو ساری دنیا کو بھول جاتا۔ اسے معلوم ہوتا کہ اس کی باہنوں میں کوئی عورت نہیں ہے سلگتا ہوا ایک انگارہ ہے جس سے اس کا سارا بدن جل جائیگا۔

پریم کمار آرادھنا اور آرتی ان دونوں کے بیچ میں لٹک رہا تھا۔ اور فیصلہ نہ کر سکتا تھا کہ کس سے شادی کرے دونوں لڑکیاں ہیروئن تھیں۔ اٹھتی ہوئی اور شہرت کی اونچی منزلوں کی جانب رواں دواں۔ خود پریم کمار کی عمر چالیس سے تجاوز کر گئی تھی۔ اس لئے اب وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اب اسے اپنے مستقبل کی خاطر کسی نوجوان ہیروئن سے جلد شادی کر لینی چاہیے اب وہ اس انڈسٹری میں تین چار سال سے زیادہ نہیں چل سکے گا۔ اس لئے گھر میں کوئی تو ہو جو اس کے بجائے فلم انڈسٹری میں چل سکے ورنہ گھر کیسے چلے گا۔؟ اس طرح کے خیال اب اسے ستانے لگے تھے۔ اگر وہ چاہتا تو کسی پکی عمر کی پکے ہوئے پھل کی طرح رسدار ہیروئن سے شادی کر سکتا تھا، مگر وہ بھی دو چار سال چلکر رہ جائے گی۔ اس لئے زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ وہ کسی نوعمر ہیروئن سے شادی کرے جسے فلم انڈسٹری سے باہر جاتے ہوئے کم سے کم بارہ سال تو لگیں اس سے آگے کی بھگوان جانے۔!

اس لئے پریم کمار آرادھنا اور آرتی بالا کے بیچ میں لٹک رہا تھا اور اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اسے کس سے سچی محبت ہے۔ آرادھنا سے۔ یا آرتی بالا سے۔؟ مگر اب وہ اپنی عمر کی اس خطرناک منزل پر پہنچ گیا تھا جہاں اسے بہت جلد اپنی محبت کا فیصلہ کر دینا ہوگا۔ اور ان دونوں میں سے کسی ایک سے شادی کر لینی ہوگی۔ آج ہولی کے دن اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لینے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔

سوئمنگ پول کے چاروں طرف بے حد شور تھا کچھ لوگ بھنگ پیکر لان پر مدہوش تھے۔ اودم پرکاش

"گھبراتی کیوں ہو؟" پریم کمار نے کہا۔ "تمہارا جسم تو سب سے خوبصورت ہے۔ چلو سوئمنگ پول میں۔ مرد دیکھتے ہی مر جائیں گے۔ عورتیں جل جائیں گی۔!"

"نہیں مجھے شرم آتی ہے!" آرادھنا گھبرا کر بولی۔

"ہولی کے دن شرم کیسی" پریم کمار نے پوچھا۔

"مجھے تیرنا نہیں آتا" آرادھنا نے دوسرا بہانہ کیا۔

"میں تمہیں پانی میں سنبھالے رہوں گا" پریم کمار نے وعدہ کیا۔

"نہیں ....!"

"چلو" پریم کمار آرادھنا کو سوئمنگ پول کی طرف گھسیٹنے لگا۔

"نہیں نہیں" آرادھنا برابر ناں کرتی رہی اور پریم کمار اسے زبردستی سوئمنگ پول کی طرف لیجاتا رہا اسی کشمکش میں آرادھنا کا بلاؤز پھٹ گیا اور اس کا جوڑا کھل گیا اور وہ سسک سسک کر رونے لگی۔!

یکایک پریم کمار کو اس پر رحم آ گیا اس نے یکایک اپنا ہات روک دیا۔ آرادھنا کو چھوڑ دیا۔ آرادھنا سکڑی سمٹی لجاتی خوفزدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اور رک رک کر بولی "جانے کیوں مجھے لاج آتی ہے۔ پریم مجھے وہاں مت لے جاؤ۔!"

پریم نے اسے اپنے دونوں بازوؤں میں لیکر پیار کیا۔ اس کے آنسو پونچھے۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ڈائیونگ بورڈ پر لے گیا۔ اور چلا کر کہنے لگا۔

"لیڈیز اینڈ جینٹلمین۔ میٹ مائی وائف!"

"MEET MY WIFE!"

چند لمحے تو حیرت کا مکمل سکوت رہا۔ پھر سوئمنگ پول میں اس غضب کا طوفان آیا گویا سوئمنگ پول کا سارا پانی اچھل کر تالاب سے باہر آ جائے گا۔!

جب میں نے رات کو پریم سے پوچھا "تم نے یہ فیصلہ کیسے کیا؟"

تو وہ بولا "آرادھنا اور آرتی بالا میں سے آرادھنا کی روح زیادہ شرمیلی ہے۔ وہ فلم اسٹار ہو کر بھی لوگوں کی نظروں سے بچنا چاہتی ہے۔ اس کی روح کے اندر ایک شریف عورت کی پاکیزگی ہے۔ یقیناً آرادھنا ہی میری سچی محبت کے لائق ہے! میں اس سے شادی کر رہا ہوں!"

اسی رات آرادھنا نے اپنے بھائی سے جو دراصل اس کا شوہر تھا کہا "میں پریم کمار سے شادی کر رہی ہوں۔! تمہیں ایک لاکھ دے کر الگ کر رہی ہوں۔ تم شادی کے بعد فوراً یہاں سے چلے جاؤ گے۔ اور پھر کبھی یہاں نہیں آؤ گے۔!"

"ایک لاکھ دے دو میری رانی، میں تو کل ہی چلا جاتا ہوں۔!"

"کل نہیں۔ شادی کے بعد!"

"شادی کے بعد میری کیا ضرورت ہے؟"

"واہ، شادی کے دن بھائی کی ضرورت ہوگی ماں باپ تو ہیں نہیں میرے۔ تم میرے بھائی بنکر میرا کنیادان نہیں کرو گے تو مجھے بڑی لاج آئے گی؟"

فراق گورکھپوری



غزل

دورِ افلاک کا شباب ہے تو
آفتابوں کا آفتاب ہے تو

ٹھہری ٹھہری سی موجِ برقِ جمال
چھلکی چھلکی شرابِ ناب ہے تو

روپ ایسا حسین جیسے گناہ
خلق کا حاصلِ ثواب ہے تو

نرم جھنکار سازِ قامت کی
اک کھنکتا ہوا رباب ہے تو

ہیں جو اوجھل نگاہِ غیب سے بھی
ان فضاؤں میں باریاب ہے تو

جو بہاروں کے دل سے اٹھتے ہیں
انھیں شعلوں کا پیچ و تاب ہے تو

ہیں عبارت تجھی سے رنج و نشاط
ستم و لطفِ بے حساب ہے تو

چمن اندر چمن ہے پہلوئے ناز
کس کھلے باغ کا گلاب ہے تو

یہ ستارے ترے پسینے کے
شب کا دہکا ہوا شباب ہے تو

پگھلی چاندی میں شعلوں کی کروٹ
موجِ برقِ تہِ سحاب ہے تو

موجزن نرمیٔ صباحتِ حسن
سینۂ کہکشاں کا خواب ہے تو

اف یہ مہکی ہوئی سہانی رات
چہرۂ شب کی آب و تاب ہے تو

جیسے زیرِ شفق چراغاں ہو
آج یوں مائلِ حجاب ہے تو

رنگ رس ادھ کھلے شگوفوں کا
مسکراتا ہوا شباب ہے تو

جن پہ پڑتی نہیں خزاں کی چھاؤں
ان بہاروں کی آب و تاب ہے تو

آنکھ پڑتی ہے اک زمانے کی
بزمِ امکاں میں انتخاب ہے تو

جیسے نغمے لبِ فراق پہ سوئیں
سیج پر یوں ہی محوِ خواب ہے تو

سید محمد تقی



تصورِ جمہوریت کا منطقی تجزیہ

آج بھی جبکہ بیسویں صدی اپنے علم وخبر کی وسعتوں کی بناء پر انسان سے زیادہ باشعور ہونے کا تقاضہ کرتی ہے۔ اس کرۂ ارض کے بہت سے لوگ جمہوری نظام کی منطق کو صحیح سمجھنے سے اپنے آپ کو معذور پاتے ہیں۔ جمہوریت کی ضرورتوں اور اس کے تقاضوں سے یہ ناواقفیت — بے تعلقی یا تنفر تاریخی اسباب بھی رکھتا ہے۔ جدید عہد کا فکری ماضی جمہوریت دشمنی کے نظریوں سے بوجھل رہا ہے۔ افلاطون نے اب سے ۲۴ سو سال پہلے یہ نعرہ وضع کیا تھا کہ — دو سو گدھوں کے مجموعے سے ایک انسان وجود میں نہیں آسکتا۔ تاریخ کے اکثر مفکروں میں یہ نعرہ رہ رہ کر سنائی دیتا رہا اور فکرو دستوں کی خاصی بڑی تعداد اس بات پر زور دیتی رہی کہ عوام کو جمہوری حقوق دینا دانشمندی کی بات نہیں ہے۔ یہ نقطۂ نظر ان حالات کے پیش نظر قابل فہم تھا جن میں رہ کر یہ مفکرین سوچ رہے تھے۔ سماجی زندگی فرد کے فکری ڈھانچوں پر بڑا گہرا اثر ڈالتی ہے۔ علاوہ بریں خارجی حالات اس بات کے متقاضی نہ تھے کہ ان عوام کو فیصلہ کے حقوق دیدیئے جائیں۔ جن کا شعور تجربہ کی بھٹی میں پختگی نہ حاصل کر سکا تھا۔ اس لئے ماضی جدید طرز کے جمہوری تصور کو اپنانے میں کامیاب نہ ہو سکا تاہم ایک بہتر معاشرہ کی تشکیل کا سوال ایک ایسا سوال تھا جو نزاع اور بحث کی سطح سے بلند تھا۔ خود افلاطون نے جس مثالیہ کو سوچا ہے وہ بہتر معاشرہ کی تشکیل کی سمت میں ایک تاریخی سعی کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اچھے معاشرہ کے قیام کی یہ کوشش ایک تو جدید عہد کے عظیم الجثہ سماجوں کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی۔ دوسرے وہ چند ایسے مفروضوں پر مبنی ہے جو آج کی سائنسی بحث ونظر کے نتیجہ میں غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ تاہم یہ مثالیہ ان حالات سے ناراضگی کے واضح ردعمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جن میں افلاطون اور اس کا استاد سقراط زندگی گذارتے تھے۔ یہ حالات ناکافی جمہوریت نے مہیا کئے تھے جسکی خرابیوں کے خلاف افلاطون کے استاد نے بغاوت کرکے اپنی جان کی قربانی پیش کی تھی۔ اس نوع کے کوئی پانچ مثالیئے افلاطون کے بعد پیش کئے گئے جن میں — زندگی جیسی کہ وہ ہے — کے خلاف ناراضگی کا ردعمل خیالی جنتوں کی شکل میں سامنے آیا تھا۔ ان تمام مثالیوں میں بہت سے اختلافات کے باوجود ایک بات مشترک ہے۔ یہ سارے مثالئے

-ناانصافی- دور کرنے پر زور دیتے ہیں- افلاطون کا مثالیہ تو ناانصافی -کی جڑ کی تلاش کے نتیجہ ہی میں وجود میں آسکا تھا- اٹھارویں صدی کے جمہوری تصورات بھی انھیں مثالیوں کی ذیل میں آتے ہیں جو انسان اب تک سوچ چکا تھا جمہوری تصورات میں بھی ناانصافی کے خلاف احتجاج اور سماجی عدل کے قیام کی خواہش بنیادی عامل کی حیثیت رکھتی ہے-

دراصل ناانصافی انسان کے منطقی ذہنی تقاضوں کے خلاف ہے- اسلئے جتنے مثالئے قائم کئے گئے وہ ناانصافی کے خلاف ردعمل کی حیثیت رکھتے تھے- اس بات کو اگر ہم زیادہ وسیع سطح پر سوچنا چاہیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ تہذیب میں جتنی عوامی تحریکیں چلیں وہ سب کی سب ناانصافی کے خلاف احتجاج کے طور پر ابھری تھیں- مذاہب بھی دراصل اس شعوری احتجاج کا ایک رخ ہیں- ژند میں زردشت نے لکھا ہے کہ ہم ہراس تحریک کے حامی ہیں جو ظلم کے خلاف اب تک چلی- چل رہی ہے یا آئندہ چلے گی- دوسرے ارباب مذاہب بھی ناانصافی اور ظلم کے خلاف اسی قسم کے الفاظ میں اپنے احتجاج تاریخ کے سپرد کر گئے ہیں-

اٹھارویں صدی کی جمہوری تحریکیں اپنے جوہر میں جس اصول سے چلی ہیں وہ یہ ہے کہ ہر شخص انسانی حقوق کے باب میں ہر شخص کے برابر ہے- یہ اصول سیاسی زندگی میں بالغ رائے دہندگی اور عوام کی حکومت، عوام کیلئے اور عوام کے ذریعہ ـــ کے نظریوں میں سامنے آیا ہے لیکن جمہوریت صرف سیاسی دائروں میں محدود ہو کر نہیں رہ سکتی- اس لئے کہ انسانوں کا مسئلہ صرف ووٹوں کا مسئلہ نہیں ہے- ووٹ بذات خود تو کوئی مقصد نہیں ہوتے- وہ کسی اور مقصد کا صرف ذریعہ بنتے ہیں اور اس لئے بات سیاسی جمہوریت پر آکر نہیں رک جاتی یہ منطق سیاسی جمہوریت سے آگے بڑھ کر سماجی اور معاشی جمہوریت تک پہونچتی ہے- اس لئے کہ اگر اس منطق کو معاشی و سماجی جمہوریت تک نہ بڑھایا جائے تو پھر خود جمہوریت اپنا مفہوم کھو بیٹھے گی اور وہ مقصد حاصل نہ ہو سکے گا جو جمہوری تصورات حاصل کرنا چاہتے ہیں یعنی یہ کہ ـــ انسانی حقوق کے معاملے میں ہر ایک فرد ہر دوسرے فرد کے برابر ہے-

جمہوریت کی منطق کا صرف یہ ایک ہی رخ ہے- لیکن اس بحث کا دوسرا رخ بھی ہے اور یہ وہ رخ ہے جو جمہوری نظام کی دوسرے نظاموں پر برتری ثابت کرتا ہے جبکہ بدقسمتی سے اس رخ کو ان تمام مفکروں نے نظر انداز کر دیا ہے جو شریف انسانوں کے معاشرہ کی تشکیل پر غور کرتے رہے ہیں- انسانی سماج کا ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ افراد کے مسئلے طاقت اور تغدّد سے حل کئے جائیں یا دلیل و منطق سے- دلیل و منطق کا مطلب یہ ہے کہ ـــ کیا کسی مسئلہ میں مخالف نقطۂ نظر کو سننا صحیح ہے یا نہیں- اگر صحیح ہے تو پھر جمہوری تصور زندگی کو اپنانا صحیح ہوگا- جبکہ اس کے برعکس اگر فیصلہ کیا جائے کہ ـــ کسی مسئلے میں مخالف نقطۂ نظر سننے کی اجازت نہ ہونی چاہیئے ـــ تو پھر جمہوری نظام اپنی ساری منطق کھو بیٹھے گا اور جمہوریت پر دوسرے نظاموں کو فوقیت دینی پڑے گی- بالفاظ دیگر جمہوریت آزادیٔ رائے کا نظام ہے- جمہوریت صرف صحیح اقدامات کرنے کا حق ملنے کا نظام ہی نہیں ہے وہ فرد کے غلطیاں کرنے کے حق کو بھی تسلیم کرنے کا نظام ہے- بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جمہوریت- فرد کی غلطیاں کرنے کی تائید نہیں دلیلیں دینے کا حق محفوظ کرنے کا نظام ہے- لیکن اس بات سے کہ جمہوریت فرد کو غلطی کرنے کا حق دیتی ہے- اسکی اہمیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا- اس لئے کہ کسی شخص کا یہ دعویٰ کہ اس کی رائے صحت پر مبنی ہے- اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا جتنا کسی دوسرے شخص کا یہ دعویٰ کہ اس کی رائے صداقت پر مبنی ہے- ایک دعویٰ- دعوے کی حد تک کسی بھی دوسرے دعوئے کے برابر ہے- اس دعوے کی اہمیت دلیل سے پیدا ہوتی ہے اور دلیلوں کی صحت صرف اسی وقت طے ہونی ممکن ہے- جب مخالف دلیلیں سامنے ہوں ـــ ان مخالف دلیلوں میں سے جو بھی کمزور ہوگی غلط قرار دی جائیگی لیکن صرف اس لئے کہ وہ غلط ہے پیش کئے جانے کے حق سے محروم نہیں ہو سکتی- اس لئے کہ اس کے غلط ہونے کی منزل دلیل کے پیش ہونے کے بعد آتی ہے پہلے نہیں-

اس ضمن میں جو قضیہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے وہ یہ ہے آیا دنیا میں کوئی شخص ایسا ہو سکتا ہے جس کی ہر رائے صحت پر مبنی ہو- اب سے تین سو سال پہلے تک اس قضیہ کا جواب اثبات میں دیا جاتا تھا- جب لوگ عقل کے بجائے سند (اتھارٹی) کو مانتے تھے- لیکن جدید عہد اس بات پر متفق ہے کہ کوئی بھی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اسکی رائے صحت پر مبنی ہے- جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر دوسرے شخص کو اظہار رائے کا حق حاصل ہے- اس لئے کہ ممکن ہے متعلقہ مسئلہ میں صداقت اس دوسرے شخص کی طرف ہو- تو بہرحال جب طے یہ ہوا کہ کوئی شخص- عقل کل- اور مکمل صحیح الرائے- ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا تو اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ کسی کو طاقت کے ذریعہ اپنی رائے دوسروں سے منوانے کا حق بھی نہیں ہے- اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ جس رائے کو طاقت کے ذریعہ منوایا جارہا ہو وہ صحت پر مبنی نہ ہو- گویا یوں بھی یہی ثابت ہوا کہ آزادی رائے فرد اور سماج کا بنیادی حق ہے-

جمہوریت آزادیٔ رائے کے اسی حق سے پیدا ہوتی ہے اور اس لئے وہ ہر مسئلہ کو دلیل و بحث سے طے کرنے کی حمایت کرتی ہے- جبکہ آمریت کی اساس یہ ہے کہ ہر وہ رائے صحت پر مبنی ہے جو حکمرانوں کی طرف سے پیش کی جائے- آمریت اپنے جوہر میں اتھارٹی- یعنی سند کو مانتی ہے جبکہ جمہوریت دلیل و منطق کو اساس تسلیم کرتی ہے- جمہوریت کا یہ اصول کہ ایک مہذب سیاسی ڈھانچہ میں کم سے کم دو پارٹیوں کا ہونا ضروری ہے- دراصل اس بات کا اظہار ہے کہ صحیح الرائے ہونا کسی ایک شخص کا اختصاص نہیں ہے- ایک سے زیادہ آدمی صحت رائے کا دعویٰ کر سکتے ہیں یا اسی بات کو یوں کہہ لیجئے کہ کسی مسئلہ کا صرف ایک رخ ہی اہمیت کا حامل نہیں ہوتا- اس کے دوسرے رخ بھی اہمیت کے متقاضی ہو سکتے ہیں- اس لئے یہ ممکن ہے کہ ان میں سے ایک رخ کوئی ایک پارٹی جبکہ دوسرا رخ کوئی دوسری پارٹی زیادہ صحت کے ساتھ دیکھ سکتی ہو-

کسی ایک فرد یا پارٹی کا اس بات پر اصرار کہ اسکی بات صحیح ہے لازماً قابل فہم ہے- اس لئے کہ اگر کسی کو اپنی رائے کی صحت کا یقین ہی نہ ہو تو پھر اس رائے کے قائم کرنے کا جواز باقی نہ رہے گا- رائے تو اسی وقت قائم کیجاتی ہے- جب اسکی صحت کا یقین ہو- لیکن یہ بات کہ ہر شخص اپنی رائے کی صحت پر یقین رکھتا ہے ـــ ایک عام قضیہ ہے- عام قضیہ کا مطلب یہ ہے کہ اس ـــ ہر شخص ـــ میں ـــ ہر شخص ہی کو شامل ہے- اس ـــ ہر شخص ـــ کا مطلب ـــ کوئی مخصوص شخص ـــ تو نہیں ہے- اور جب ہر شخص کو اپنی رائے صحیح سمجھنے کا حق حاصل ہے تو پھر کسی ایک آدمی یا پارٹی کو یہ حق مخصوص نہیں کر لینا چاہیئے کہ چونکہ صرف وہی صحت پر مبنی ہے اسلئے کسی اور کو اپنی رائے جسے وہ صحیح سمجھتا ہے ظاہر کرنے کا حق نہیں پہونچتا- آمریت کسی ایک شخص یا پارٹی کو صحیح الرائے ہونے کا حق دیتی ہے اور اس لئے وہ طاقت کے بل پر اس رائے کو منوا لینا جائز خیال کرتی ہے- یوں آمریت مآل کار طاقت پر تکیہ کرتی ہے- جبکہ جمہوریت دلیل کو آخری سند مانتی ہے- دلیل ہمیشہ دو مخالفوں کے درمیان دی جاتی ہے- اس لئے جمہوریت میں ایک سے زیادہ پارٹی کا ہونا ضروری ہے- لیکن آمریت مخالف کے وجود کو برداشت نہیں کرتی یہی وجہ ہے کہ آمریت میں دلیل نہیں پنپ سکتی- ان وجوہ سے آمریت ہمیشہ طاقت کے نظام کو کہتے ہیں- جبکہ جمہوریت دلیل و منطق کے سہارے کھڑی ہوتی ہے- پچھلے تین سو سال میں انسانوں نے علم و تحقیق کی دنیا سے سند اور اتھارٹی کو نکال دینے میں کامیابی حاصل کر لی ہے- اب جدید انسان کو سیاست کے دائرہ سے سند اور اتھارٹی کو نکالنے کا کام کرنا ہے- علم و تحقیق کے دائرہ میں بھی سند اور اتھارٹی طاقت کے ستونوں پر کھڑی تھی اور سیاست کی دنیا میں بھی طاقت ہی اس کا واحد سہارا ہے- علم و تحقیق کی دنیا سے طاقت کے اصول کو بے دخل کر دینے کے بعد اب انسانوں کو سیاسی فلسفہ سے بھی طاقت کے نظریہ کو نکالنے کی جدوجہد کرنا ہے- اور جس طرح سند و اتھارٹی کے نظریہ کی شکست انسانی ارتقاء کا سبب بنی تھی اسی طرح آمریت کی شکست انسان کی ترقی کا باعث بنے گی-

سردار جعفری

برہنہ پا ہے بہار

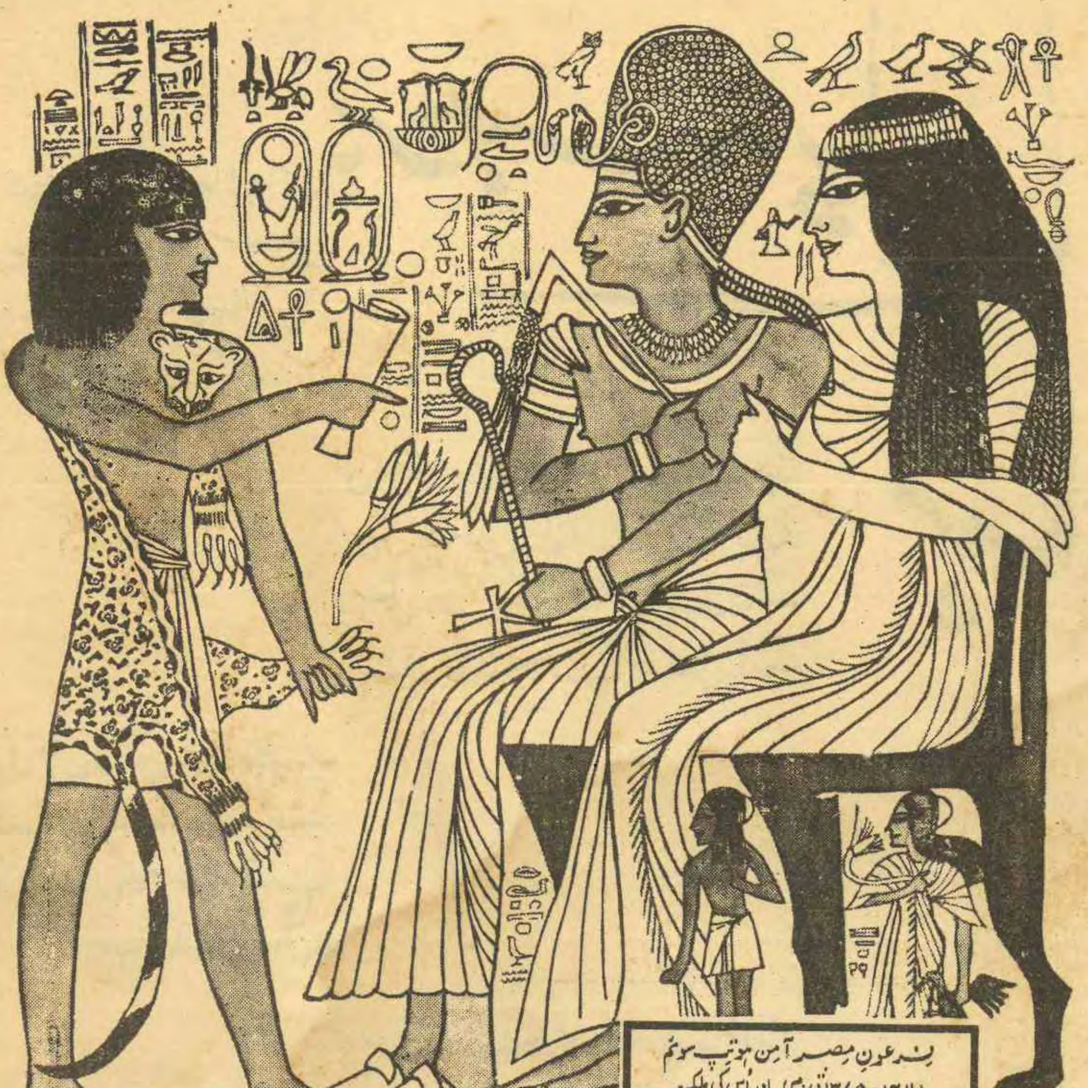
تمہارے تن پہ سلامت تمہارا پیراہن
ہمارے پاس یہ دامانِ تار تار سہی
تمہارے زیرِ قدم فرشِ گل بساطِ بہار
ہمارے پاؤں میں دشتِ جنوں کے خار سہی

کسی کی بھوک سے بھرتے نہیں ہیں پیٹ اپنا
کسی کی پیاس سے لب اپنے تر نہیں کرتے
برہنگی سے کسی کی لباس کیوں لیں گے
بہشت پر بھی ہوس کی نظر نہیں کرتے

ہمارے دل کی تپش سے چراغ جلتے ہیں
ہماری تشنہ لبی میکدے بناتی ہے
نگاہِ ساقیِ نامہرباں کا شکوہ کیا
ہمارے نام کی صہبا چھلک ہی جاتی ہے

تمہیں خبر بھی ہے آوارگانِ کوچۂ شوق
شکستہ دل ہیں، شکستہ دلوں کے یار بھی ہیں
بلا کشانِ محبت کا احترام کرو!
خراب حال سہی، فخرِ روزگار بھی ہیں

ہماری طرح گریبانِ صبحِ نو بھی ہے چاک
فروغِ چاکِ گریباں ہے اہلِ دل کا شعار
ہماری طرح سے گلزار و دشت و صحرا میں
برہنہ سر ہے صبا اور برہنہ پا ہے بہار



فرعونِ مصر آمن ہوتپ سوئم
(۱۴۱۱ - ۱۳۷۵ ق م) اور اُس کی ملکہ۔
ایک وزیر رُو برُو کھڑا ہے

کایا پلٹ



عصمت چغتائی



" اے تو اسی سال تو بی ایس سی کیا ہے۔ نوکری کی تلاش میں ہے "۔

" ایسے بی ایس سی نہ جانے کتنے جھک مارتے پھرتے ہیں۔ بہت سے بہت ڈیڑھ سو کی نوکری مل جائیگی۔

" کیوں جی فسٹ پاس ہوا ہے کہ نہیں "؟

" ارے تم تو گھاس کھا گئی ہو۔ فسٹ کلاس پاس ہونا کون سی بڑی بات ہے۔ تشی کا نصیب پھوڑنا چاہتی ہو ـ"؟

" اے تو کون سا ابھی بیاہ ہوا جاتا ہے۔ نوکر چاکر ہوجائے تب دیکھا جائے گا "۔

" اجی وہ سونے میں بھی منڈھ کر آجائے تو میں اپنی بیٹی اسے نہیں دونگا۔ سردیپ جی ادھر سوائی مادھو پور میں لڑکا ہے اس کے لئے جان توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ بس دسہرے تک بات پکی ہوجائے گی "۔

" اور جو تشی کو لڑکا نہ پسند آیا تو ــ"

" مجال ہے تشی کی چوں بھی کرجائے۔ اس کنگال سے شادی کرکے ساری عمر کا رونا۔ جبھی تو تم سے کہتا ہوں کہ اسے منع کیوں نہ کیا۔ یہ بھی کوئی طریقہ ہے ـ ؟"

" اے جی تو مجھے کیا معلوم تھا کہ تم لڑکی کی بات کہیں اور کر رہے ہو۔ کون ہے لڑکا ـ کیا کرے ہے ؟"

" راشن آفس میں کہیں نوکر ہے۔ چار سو کماتا ہے آگے اور ترقی ہوگی ـ"

" چار سو کی ایسی راشن آفس میں کیسی نوکری ہے "۔

" جبھی میں نے ساری اوپر کی آمدنی لگا کر بتایا ہے

یہی سروپ جی کہتے ہیں۔ اچھی آمدنی ہو جاتی ہے بس کم سے کم چار سو سمجھو۔"

"ابھی تو وہ ایم اے کرنے کو کہہ رہے ہے۔"

"بس جی بس ایم اے ویم اے کچھ نہیں کرنا ہے۔ زیادہ پڑھانے سے لڑکیاں بالکل ہی ہاتھ سے نکل جاتی ہیں ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں اور آپ کی لاڈلی ابھی تک نہ جانے کہاں گل چھرّے اڑا رہی ہیں۔"

"بس رہنے بھی دو۔ خواہ مخواہ بکواس کئے جا رہے ہو۔ میری لڑکی ایسی چھچھوری نہیں ہے۔"

"ارے آجکل کی ساری لڑکیاں آوارہ ہوتی ہیں گھر سے بہانہ کر کے چلی جاتی ہیں اور نہ جانے کیا کیا بدکاریاں کرتی پھرتی ہیں۔"

"شرم نہیں آتی اپنی بیٹی کو بدکار کہہ رہے ہو" شریمتی جی کا گلا بھر آیا۔

"تم ہی سوچو ساڑھے آٹھ بج گئے اور لڑکی غائب ہے"۔ شریمان جی جھنجھلا اٹھے۔ "کہے دیتا ہوں ساری عمر سر پکڑ کر روؤگی۔ میں تو ایک گھڑی اپنے گھر میں نہیں ٹکنے دوں گا۔ کھڑے کھڑے نہ نکال دیا ہو تو نام نہیں۔ آج ذرا آجائے بے شرم کہیں کی۔" شریمان جی غصے پھنکارتے ہوئے ٹہلنے لگے

"بڑے آئے نکالنے والے ۔۔ بے شرم خود ہو جو معصوم بچّی پر الٹے سیدھے عیب تھوپ رہے ہو"۔ شریمتی جی دہاڑ دہاڑ رونے لگیں۔

"ارے ابھی تو دیکھتی جاؤ کیسا سر پکڑ کر لڑکی کی جان کو روؤگی۔ کیا وہ میری بیٹی نہیں ہے؟ میں اس کا دشمن ہوں؟ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو کہیں منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہوں گا ـــ تم تو گھر میں بیٹھی رہتی ہو۔ دنیا کے طعنے تو مجھے ہی سننا پڑینگے اب اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ کچھ کھا کر سو رہوں۔ بس تم ماں بیٹی کے کلیجے میں تو جیسے ہی ٹھنڈک پڑے گی۔"

"بھگوان کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے۔ بس نہیں ملی ہوگی یا ٹرین چھوٹ گئی ہوگی۔ اسی مارے دیر ہو گئی ہوگی۔ بس آتی ہی ہوگی۔"

"خاک آتی ہوگی"۔ جلسہ کبھی کا ختم ہو چکا ہوگا۔ آنا ہوتا تو آجاتی۔"

"آوے گی کیوں نہیں؟ بُرے شگن منہ سے نہ نکالو۔"

"اب میں تم سے کیا کہوں بیکار پریشان ہو جاؤگی خود ہی سوچو۔ جوان لڑکی راتوں کو غائب رہے۔ ان حرکتوں کا کیا انجام ہوگا۔ زمانہ بڑا خراب ہے۔ ان لفنگے لڑکوں پر بھروسہ کرنا سخت حماقت ہے۔ انگریزی فلمیں دیکھ دیکھ کر وہی بدمعاشیاں"

"ہے بھگوان مجھے تو موت ہی آجائے"۔ شریمتی جی بے قابو ہو گئیں۔

"موت آجائے تو بڑے بھاگ سمجھنا۔ موت سے بھی بری گت ہوگی۔ آئے دن ایسے واقعے ہوتے رہتے ہیں کہ لڑکی کو کوئی بدمعاش بہکا کر لے گیا اور ـــ"

"میری بیٹی ایسی نادان نہیں۔"

"ایک تم بڑی ودوان ہو اور دوسری تمہاری بیٹی صاحبہ ہیں۔ ذرا سوچو ڈوب مرنے کی بات ہے یا نہیں۔ کیا سمجھتی ہو تم آجکل کے نوجوانوں کو۔ لڑکی آخر کو جوان ہے۔ بچّی تو نہیں۔ سچ بتاؤ کیا تم قسم کھا کر کہہ سکتی ہو تمہاری لڑکی تم سے کہے بغیر کچھ نہیں کرتی ـ؟ یہ راتوں کو جو غائب رہتی ہے تو کیا لڑکے کے ساتھ بیٹھ کر گیتا کا پاٹ کیا کرتی ہوگی۔ چوما چاٹی تو ہوتی ہوگی۔ اور کون جانے۔"

"بھگوان نہ کرے میری لڑکی ایسی نیچ نہیں۔"

"ارے آجکل کا یہی فیشن ہے۔ اندھیرے اجالے کیا کچھ نہ ہوتا ہوگا۔ جبھی تو تم سے کہتا ہوں۔ جب انسان پر شیطان سوار ہو جاتا ہے تو پھر بیچاری لڑکی۔ اب تم سے کیا کہوں؟ یہ بمبئی شہر ہے۔"

"ہو۔ ہو۔" شریمتی جی رونے لگیں۔

"اور ایسے موقعہ پر نوجوانوں کو اپنے اوپر قابو نہیں رہتا اگر لڑکی شریف ہو اور انکار کرے تو پھر بالکل راکھشس بن جاتے ہیں۔ آئے دن ایسے کیس ہوتے رہتے ہیں کہ لڑکی نے بے چیں چپڑ کی اور دھر کے دبا دیا ٹینٹوا۔ نہ سالی زندہ رہے گی نہ پوچھ تچھ ہوگی۔ ریپ اور مرڈر کے کتنے واقعات ہوتے ہیں۔ ابھی اسی دن اخبار میں نکلا تھا کس بُری طرح گلا کاٹا تھا لڑکی کا کر بس۔"

"اے بھگوان۔ اسے موت آئے ستیش کے بچے کو انگ انگ سے کوڑھ پھوٹے۔ اس کے ہٹے کٹے چھوٹیں۔ اسے میری لونڈیا کو ہاتھ تو لگا کر دیکھے۔ چھاتی پر چڑھ کے لہو نہ پی جاؤں گی۔ اسے آنے تو حرام خور کو۔ مجھے کیا معلوم تھا یوں آستین کا سانپ بن کر ڈسے گا۔ ہائے میری شرواسی تشی ـــ اے جی تم نے مجھ سے پہلے کیوں نہ کہا۔؟"

"تم میری سنتی کب ہو جو تم سے کچھ کہتا۔ بھئی آزاد خیال کٹم کی بیٹی ہو۔ تمہارے ہاں تو سب ہی کچھ چلتا ہے تمہاری سگی بہن کھلے بازار ناچتی پھرتی ہیں۔ سارے یورپ میں ٹانگیں اچھالتی پھرتی ہیں۔ بھیا تمہارے طبلچی۔"

"طبلچی کا ہے کو ہوتا ـــ ستار۔"

"ارے وہ ستار ہوا یا سارنگی طبلہ ہوا ایک ہی بات ہے تم لوگ تو انھیں کلاکار ہی کہتے ہو۔ ہاں جی تم لوگوں کا کیا کہنا اونچے لوگ ٹھہرے۔ اور ہم بیچارے پرانے زمانے کے لوگ۔ مگر اتنا یاد رکھو تم نے اور تمہاری بہنا نے اگر میری لڑکی کو پیشہ کرایا تو سات پیڑہی تک کو جیتا نہ چھوڑوں گا۔"

"اے تمہارے منہ میں خاک۔ پیشہ کریں تمہاری اماں بہنا۔ خبردار جو تم نے میری بچی کو کچھ کہا۔"

"تمہاری ہی بچی ہے۔ میری کوئی نہیں لگتی؟ بس تم اپنی سی کروگی اور میں بیٹھا منہ تکوں گا؟"

"اے ابھی تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں بڑا سُور آدمی ہوں۔ بھگوان کی سوگند آج اس بدذات لونڈیا کو آنے دو اور اس کے یار کو کھود کے نہ گاڑ دیا ہو تو۔"

شریمتی جی نے دھڑا دھڑ منہ پیٹ لیا۔ ہائے ان کی پھول سی بچی۔

"ارے بھگوان کے لئے پولیس کو فون کیجئے۔"

"ہوں اب کورٹ کچہری میں بھی منہ کالا کرواؤگی؟ نہیں بس آج فیصلہ ہو کر رہے گا ـــ" دھڑ دھڑ کرتے شریمان جی بیڈ روم میں گئے اور پستول نکال کر دھڑا دھڑ گولیاں بھرنے لگے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں" شریمتی جی پیلی پڑ گئیں۔

"وہی جو ایک شریف آدمی کو کرنا چاہیئے۔" گولیاں بھر کر پستول انھوں نے سامنے میز پر رکھ دیا۔

"ہے بھگوان ـــ ہے گوپال ۔ ہے پرمیشور۔"

"کیا چاہتی ہو؟" شریمان جی جھنجھلا اٹھے "کیا وہ آئے تو اسے شاباشی دوں کہ واہ بیٹی تو نے کٹم کی لاج مٹی میں ملا دی۔ یہ میرے اوپر بڑا احسان کیا۔" شریمتی جی ہچکیوں سے بین کر کر کے رونے لگیں۔

"ہائے میری تشی کیا اسی دن کے لئے پالا تھا تجھے۔ ارے تجھے موت کیوں نہ آگئی۔"

شریمان جی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پیروں پر قابو نہ تھا لڑکھڑا کر صوفے پر گر رہے۔ کبھی کھڑکی کی طرف دیکھتے کبھی دروازے کی طرف۔ پھر غصے سے لال آنکھیں پستول پر پلٹ کر جم جاتیں۔ پونے نو ہو چکے تھے۔ پالی ہل پر سناٹا ہو گیا تھا۔ اکا دکا بس گذر جاتی اور پھر خاموشی۔ ان کے کان سنسنا رہے تھے، کنپٹیاں پھٹی جا رہی تھیں۔ شریمتی جی عورت تھیں رو کر جی کی بھڑاس نکال رہی تھیں مگر وہ تو بھوں بھوں رو بھی نہیں سکتے تھے دل کی وحشت دور کرنے کے لئے اخبار اٹھا لیا۔

"سمندر سے ایک گمنام لاش۔" اوہ یہ تو کل کی بات ہے۔ یقیناً تشی کی لاش نہیں ہو سکتی۔" ساس سے جھگڑا بہو نے کپڑوں میں آگ لگا کر ـــ"

مگر تشی کی تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اگر شادی ہو چکی ہوتی تو اس وقت وہ کسقدر بے چین سے بیٹھے کراس ورڈ کا معمہ حل کر کے لاکھوں کمانے کے پلان بنا رہے ہوتے اور شریمتی جی بجائے بھوں بھوں رونے کے نواسے کے لئے سویٹر بن رہی ہوتیں ـــ نواسہ ۔ اف ۔

تشی کے بال بکھرے ہوئے ہیں ماتھے سے خون جاری ہے۔ پتاجی میں لٹ گئی ۔ دھڑ سے زمین پر گرتی ہے۔!

چونک کر شریمان جی نے ڈراؤنے سپنے کو جھٹک دیا ـــ تشی ـــ تشی ـــ میلے کچیلے چیتھڑوں میں یہ ننھی سی جان ـــ پتاجی ۔ ماتاجی ۔ یہ پھول ۔ میری بھول کا پھول ۔ شما کیجئے ۔ شما کیجئے ۔

انھوں نے لپک کر پستول پر ہاتھ ڈالا ۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک اٹھے ۔ بازار کا بھاؤ ۔ گر رہا ہے ۔ گر رہا ہے ۔ چڑھ رہا ہے ۔ اتر رہا ہے ۔

ایک دم سے ان کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ تھم گئی۔ اسکالرشپ ـــ پانچ برس کے لئے ۔ لندن

اُف ـــ ان کے ہاتھوں سے اخبار گرتے گرتے بچا ۔

ستیش کو پانچ سال کے لئے اسکالرشپ۔

"ارے ..... یہ ..... یہ اخبار آج ہی کا تو ہے۔ نہیں کل کا ہے۔ اوہ آج پندرہ ہے نا؟ ارے بولتی کیوں نہیں ہو ــــ؟"

"کیا ہے جی۔" شریمتی جی کراہ کر بولیں "ایوننگ نیوز آپ ہی تو لائے ہیں ابھی۔"

"اوہ۔ ہاں ــ پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

"ہاں وہ اس بھاگن تشی کے جھگڑے میں بھول گئے اچھا اخبار بعد میں پڑھئے گا۔ آپ کو میری جان کی سوگند جاکر پولیس میں رپٹ لکھوا دیجئے۔"

"رپورٹ نہ کیوں؟"

"ارے نو بج رہے ہیں لڑکی کا اب تک پتہ نہیں۔"

"تو اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے اکیلی تو نہیں گئی۔"

"اسی شیطان کے بچے ستیش کے ساتھ گئی ہے۔"

"گالیاں دے کر کیوں زبان گندی کرتی ہو۔"

"گالیاں نہ دوں تو کیا موئے کی بلائیں لوں۔ دو گھڑی کی آئے مونڈی کاٹے کو۔ میری لونڈیا کو نہ جانے ماٹی ملا کہاں لے گیا۔ ارے سنتے ہو جی۔"

"ہاں ہاں سن رہا ہوں۔ تم عورتوں کو تو ہر بات کا ہول سوار ہو جاتا ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو جی ــ وہ شیطان میری لونڈیا کا جیون نشٹ کر دے اور ــــ"

"تشی۔ چہ چہ چہ۔ ایسی اوٹ پٹانگ بکواس سے کیا فائدہ۔" بڑے دھیرج سے بولے۔

"مگر ابھی تو خود ہی کہہ رہے تھے کہ ــ"

"ہاں ہاں میں نے اگر تشی کی بھلائی کے لئے کچھ کہا تو اس کے یہ معنی تو نہیں کہ بس۔ کہ بس بالکل ہی لڑکا نکما ہے۔ میرے خیال میں تو ستیش ایسا زیادہ برا بھی نہیں جتنا ہم سمجھ رہے ہیں۔ اور ماں کے ناطے کوئی دبدھا تمہارے دل میں ہو تو اسے نکالنے کی کوشش کرو۔"

"کیوں؟ کالا منہ ستیش کے بچے کا۔ آئے تو سہی نہ جوتی لیکر مونڈی کاٹے کا منہ توڑ کے رکھ دوں تو کہنا نو بج رہے ہیں اور ......"

"بڑا رش ہوتا ہے بوری بندر پر بس نہیں ملی ہوگی۔"

"تو ٹرین سے آجاتے۔" شریمتی جی چڑھ گئیں۔

"جلسہ دیر سے ختم ہوا ہوگا۔"

"میں پوچھتی ہوں بات کیا ہے۔ ابھی تو کہہ رہے تھے ....." شریمتی جی بگڑ کھڑی ہوئیں۔

"چہ اوہو تم تو بال کی کھال نکالتی ہو ــ لو شاید وہ لوگ آ گئے۔ ستیش کی ہنسی معلوم ہوتی ہے۔"

"لاؤ مجھے وہ پستول۔ میں موئے کے کلیجے میں گولی مارونگی ــــ"

"کیا پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہو ــ سنو اس وقت تم انھیں کچھ نہ کہنا۔" انھوں نے جھٹ پستول دراز میں رکھ دیا۔

"کیوں ــ؟ کیوں نہ کہوں؟" شریمتی جی الجھنے لگیں۔

"میں جو کہتا ہوں۔"

"مگر ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ ــ"

"اوہو ــ وہ تو بھئی غصہ میں کہہ ہی جاتا ہے انسان۔"

"یہ بات کیا ہے ایکدم یہ پلٹا کیوں لیا۔"

"معلوم ہو جائے گی بات ــ" شریان جی نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

"ہلو ڈیڈی ــــ" تشی برساتی کا پانی جھاڑتی داخل ہوئی ــ "اف بس اسٹینڈ پر کھڑے کھڑے مر گئے۔ کیا لمبا کیو تھا۔ جلدی سے کھانا ملے گا۔"

شریمتی جی کچھ بوکھلائی ہوئی تھیں کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ جلدی سے شری مان جی بولے۔

"ہاں ہاں ستی تم بھی کھالو۔"

"جی۔ مگر۔ تشی اگر آپ اجازت دیں تو۔"

"میں نے کہہ دیا ستو ڈیڈی اتنی رات کے لئے اجازت نہیں دیں گے تم چلے جاؤ ڈنر پہ ــ میں نہیں جا سکوں گی۔"

"تو پھر میں بھی نہیں جاؤں گا۔"

"ہونہہ مت ــ" تشی تنک کر بولی۔

"کیا بات ہے۔ کیسا ڈنر ــ؟" شریان جی بڑی نرمی سے بولے۔

"میرے ایک دوست کی شادی ہے۔ ڈنر پر ہم دونوں کو بلایا ہے۔"

"یہ بھی تو بتاؤ کہ قوالی بھی ہے بارہ بج جائیں گے۔" تشی بولی۔

"نہیں ساڑھے دس تک کھانا ہو جائے گا۔"

"آتے آتے گیارہ بجیں گے ــ اور اب دیر بھی ہو رہی ہے تمہیں تم چلے جاؤ ــ"

"چلی جاؤ تشی۔"

"مگر ڈیڈی دیر ہو جائے گی تو۔"

"ستیش تمہارے ساتھ ہوگا یا نہیں؟"

"جی ہاں۔"

"تو بس پھر چلی جاؤ۔"

"ہائے ڈارلنگ ڈیڈی۔ چلو ستو۔" تشی نے لپک کر برساتی اٹھالی۔

"میری گاڑی لے جاؤ۔ یہ رہیں چابیاں۔ دھیان سے نکالنا گاڑی کہیں ٹکر دکر نہ لگے۔" پیار سے بولے۔

"مگر، میں بس کھانے کے بعد چلی آؤں گی۔ قوالی تو نہ جانے کب تک ہوگی۔"

"تو کیا ہوا سنکر ہی آنا ــ یہی تو لوگوں میں خرابی ہے اپنے دیش کی کلا کی کوئی قدر نہیں کرتے۔"

"نہیں جی۔ یہ رات گئے تک غیر گھر میں رہنا ٹھیک نہیں۔" شری متی جی نے تیوریاں چڑھائیں۔

"ارے بھائی جانے بھی دو۔ اسمیں حرج ہی کیا ہے۔" شریان جی نے بیوی کا ہاتھ دبایا۔

"یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔"

"جاؤ جی تم لوگ۔"

"مگر ممی۔" تشی نے سہم کر ماں کو دیکھا۔

"نہیں جی تمہاری ممی تو یونہی کہہ رہی ہیں ــ آخر تمہاری ماسی اتنی بڑی کلاکار ہیں۔ سارے یورپ میں ان کا نام ہے۔ ایک تم ہو کہ کلا کے نام لٹھ بھی نہیں آتا۔ جاؤ۔ قوالی سنکر آنا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔" ان دونوں کے جانے کے بعد شری متی جی بکھر گئیں۔

"تمہاری سمجھ میں آتا ہی کیا ہے۔ بس سوائے چولہے چکی کی باتوں کے اور کسی طرف عقل ہی نہیں چلتی۔"

"ہاں جی ایک تم ہو عقل کے ٹھیکیدار۔ مگر میں کہتی ہوں یہ کایا پلٹ کیوں ہو گئی۔ ابھی تو توپ بندوق تانے بیٹھے تھے۔ کہ گھڑی بھر میں شیرہ شکر ہو گئے۔ کیوں جانے دیا اس وقت لڑکی کو۔"

"تم نہ سمجھو گی۔" شریان جی مسکرائے۔ "آج کا اخبار بھی دیکھا؟"

"کیا دیکھوں، آگ لگے اخبار میں؟"

"میرا سر ــــ یہ دیکھو ستیش میرچندانی کو پانچ سال کے لئے سرکاری وظیفہ دے کر ولایت بھیجا جا رہا ہے۔ جانتی ہو ولایت پلٹ کو آجکل کیا گریڈ ملتا ہے۔؟"

"میری جانے بلا نہ جانے کیا کہہ رہے ہو۔"

"جبھی تو کہتا ہوں تم نہیں سمجھو گی۔ لڑکی کے بھاگ جگ اٹھے۔ شادی کر کے سنگ ہی بھیجدوں گا میں تو۔ تم عورتوں کے پاس تو عقل جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی۔"

"اور جو سوائی مادھو پور میں بات چل رہی ہے۔"

"ارے مارو گولی سالے سوائی مادھو پور کو ــ تشی اور ستیش کا جوڑ بھی اچھا رہے گا۔"

"لے جی تو تم نے ستیش کے سامنے ہی ذکر کیوں نہ کیا؟"

"بھئی بڑی ہی موٹی بدھی پائی ہے۔ اری عقل کی دشمن اگر اس کے سامنے ذکر کر دیتا تو وہ سمجھتا ہم اس لئے تشی کو رات کے وقت اس کے ساتھ بھیج رہے ہیں کہ اسے اسکالرشپ ملا ہے۔"

"اوہ سمجھی!"

"شکر ہے بھگوان کا کچھ تو سمجھیں۔ بھئی اپنی تشی کو اتنا اچھا لڑکا کہاں ملتا؟ اور پھر دونوں کا پیار ہے جہیز پر بھی جھگڑا نہیں ہوگا۔"

"کچھ بھی ہو۔ رات گئے وقت جوان لڑکی کو بھیجنا ٹھیک نہیں۔ کون جانے۔"

"تم تو بس اسے اپنے کولہے سے لگائے بیٹھی رہو۔ تشی کوئی نادان ہے۔"

"مگر میرا تو جی ڈر رہا ہے کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو۔"

"نہیں جی ایسی ویسی بات کچھ نہیں ہو سکتی۔ ستیش بہت شریف بچہ ہے۔"

"جو شیطان ہی سوار ہو جائے تو؟"

"تم عورتوں کے دل میں تو فضول کے وہم بھرے

ہوتے ہیں۔ اتنا نہیں سمجھتیں کہ ستیش جان بوجھ کر اپنے پیروں پر کیوں کلہاڑی مارے گا۔"

"کیا مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ اتنا بڑا اسکالرشپ ملا ہے بھگوان نہ کرے کوئی اسکینڈل ہو جائے تو سارا کیریر ختم ہو جائے گا ان باتوں کی بڑی چھان بین ہوتی ہے۔ دوسرے اسمیں ہمارا کیا نقصان ہوگا پھر تو اسے شادی کرنا ہی پڑے گی۔ تم خاطر جمع رکھو وہ کوئی چھچھوری بات نہیں کرے گا۔ اور پھر اپنی تشی کو پسند بھی کرتا ہے۔ نہ جانے کس جنم کا لیا دیا کام آگیا۔ بیٹھے بٹھائے اتنا اچھا لڑکا مل گیا۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ کہاں ہے ستیش کا نام؟"

شریمتی جی اخبار پلٹنے لگیں۔

"اُنہہ یہ سامنے ہی تو ہے۔ تیسرے پیج پر۔ ستیش میر چندانی ——"

"ہائے رام۔ یہ تو ستیش میر چندانی ہے۔"

"اور میں کیا کہہ رہا ہوں ——؟ میں بھی تو ستیش میر چندانی ہی کہہ رہا ہوں۔"

"پر اپنا ستیش تو رام چندانی ہے۔"

"رام چندانی ؟ — یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم نے پہلے سے کیوں نہ کہا"؟

"اے تو مجھے کیا معلوم تھا کہ ——"

"تمہیں تو کچھ معلوم ہی نہیں۔ نتھی ہونا۔ کتنی دفعہ کہا تم سے لڑکی کو ان سندھیوں سے نہ ملنے دیا کرو — ہمارا ان کا کیا جوڑ۔ کمبختوں کے کیا اوٹ پٹانگ نام ہوتے ہیں۔ آنے دو حرام زادے کو۔ کیا سمجھ رکھا ہے۔"

"........" شریمتی جی روہانسی ہوگئیں۔

"........" شریمان جی غرائے۔

"........" شریمتی بسوریں۔

"......" شریمان پھنکارے۔

"......" شریمتی جی بھوں بھوں رونے لگیں۔

"....." شریمان نے دراز کھول کر پستول نکال لیا۔



ظہیر کاشمیری

کہاں کا محمود کہاں کا ایاز

ایاز ایک منبجۂ نظر نواز و دلنشیں   وہ بارگاہِ غزنوی کا اک چراغِ دلبری
وہ زر خرید کج کلاہ و خاکِ پائے غزنیاں   کہاں جمالِ داشتہ کہاں جلالِ قیصری

وہ فلسفی عجیب تھا کہ جس نے جوشِ فکر میں   ایاز و غزنوی کو ایک صف میں لا کے رکھ دیا
درونِ سجدہ گاہ دونوں صف بصف تو تھے مگر   برونِ سجدہ گاہ ان میں فرقِ کاہ و ماہ تھا

کہاں پرندِ نرم پر، کہاں عقابِ تند خو   کہاں لباسِ بوریا، کہاں حریرِ مشک بو
کہاں غلیظ ٹھیکرا، کہاں زمردیں سبو   غریب کے لہو سے کب ملا ہے شاہ کا لہو

جلال و غیظ غزنوی، جلال و غیظ ہی رہا   کوئی اسے ہزار فطرتِ ادا شناس دے
مزاجِ غزنوی اگر ذرا سا بھی ہو مشتعل   ایاز کی وہ دم زدن کا کلیں اتراش دے

ایاز جب بھی گنگ تھا ایاز اب بھی گنگ ہے   وہ آج بھی نظامِ زر کے غزنوی کا ہے غلام
ہے طمطراقِ غزنوی اگرچہ دو جہاں شکن   میں ہوں حریفِ غزنوی مرا ایاز کو سلام

؎ پا از گلیمِ خویش بناید دراز کرد   تیغِ جفا ببیں چہ بہ زلفِ ایاز کرد   (صائب)



ایک خواب کا نفسیاتی تجزیہ

رئیس امروہوی

افسانہ یا واقعہ کل رات کا ہے شب کے آخری حصہ میں جب کہ میں عموماً شعوری طور پر نہیں تو تحت الشعوری طور پر کسی قدر بیدار ہو جاتا ہوں - میں نے اپنے کو امروہے میں پایا - جس وقت میں یہ الفاظ تحریر کر رہا ہوں - اس دلچسپ خواب کے مناظر - وضاحت کے ساتھ میرے حافظے کی شاہراہ سے گذر رہے ہیں - میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ویزا لئے بغیر امروہے پہنچ گیا ہوں اور ایک ایسی گلی سے گذر رہا ہوں جو مانوس بھی ہے نامانوس بھی - عالم خواب کی اس گلی سے گذرتے ہوئے مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ ویزا لئے بغیر میرا یہاں چلا آنا اک جرم ہے اچانک ایک شخص مجھے ملتا ہے - گندمی رنگ کا کوئی نوجوان میں خواب میں پوری طرح پہچان لیتا ہوں کہ یہ فلاں شخص ہے۔ یہ شخص مجھ سے ادھر ادھر کی گفتگو شروع کر دیتا ہے اسکی گفتگو میں بار بار اس قسم کے اشارے ملتے ہیں کہ آپ ویزا لئے بغیر یہاں آئے ہیں اور عجب نہیں کہ پولیس آپ کی گھات میں ہو - اس شخص کی گفتگو تھکا دینے والی بھی ہے اور کھولا دینے والی بھی ہے - میرا جی چاہتا ہے کہ اس گستاخ دخل در معقولات کرنے والے راہ گیر کو ڈانٹ دوں - لیکن فوراً اندر سے خوف کی ایک لہر ابھر کر میرے تمام وجود کا احاطہ

کرلیتی ہے۔ میں اپنے کو لعنت ملامت کرتا ہوں۔ اپنی کوتاہ اندیشی اور جلد بازی پر الجھتا اور بگڑتا ہوں کہ یہ آخر میں نے کیا کیا۔ مجھے ویزا لئے بغیر کراچی سے امروہے آنے کی کیا ضرورت تھی۔؟ اگر ہندوستانی پولیس نے مجھے گرفتار کرلیا تو میرے ان عزیزوں کو کتنی روحانی تکلیف ہوگی جو امروہے میں آباد ہیں۔ عجب نہیں انھیں بھی گرفتار کرلیا جائے اس الزام میں کہ انھوں نے ایک پاکستانی جاسوس یعنی خاکسار کو پناہ دی ہے۔ پھر خیال آیا کہ جب میری گرفتاری کی خبر کراچی پہنچے گی تو اعزا و احباب کیا کیا بیوقوف نہ بنائیں گے کہ آپ ویزا کے بغیر امروہے گئے ہی کیوں تھے؟ خواب کا سلسلہ جاری ہے میں اسی گلی سے گذر رہا ہوں۔ وہ گندمی رنگ زبان دراز شخص مجھ سے مسلسل بے تکی ہانکے جا رہا ہے اور اس کی گفت گو سے میری بیزاری اور جھنجھلاہٹ ہے کہ برابر بڑھ رہی ہے۔ یکایک میں نے اپنے کو مع اسی شخص کے تھانے میں پایا۔ یعنی میں عالم خواب میں خواب سمیت گلی سے تھانے میں منتقل ہوگیا۔ یہ امروہے کا تھانہ ہے میں اسے بخوبی پہچانتا ہوں۔ بڑا پھاٹک ایک طرف حوالات دوسری طرف محرر تھانہ کا کمرہ۔ میں اور وہی شخص (جو گلی میں میرے ساتھ تھا) ایک بینچ پر بیٹھے ہیں اور محرر تھانہ کاغذات کی الماری کے قریب کھڑے ہوئے کچھ فائلیں الٹ پلٹ رہا ہے مجھے یقین ہے کہ یہ فائل میرے متعلق ہے اس فائل میں وہ تمام کاغذات موجود ہیں جو ہندوستانی پولیس نے میرے فرضی جرائم کے متعلق مرتب کئے ہیں۔ اس وقت تشویش و اضطراب سے میرا عجیب حال ہے۔ بغیر ویزا کے ہندوستان میں داخلہ جاسوسی کا جرم۔ ذرائع کی کمی۔ وسائل کا فقدان۔ لاحول ولاقوۃ کس ابتلا میں پھنس گیا۔ یکایک خواب کا منظر تبدیل ہو جاتا ہے میں اپنے امروہے کے آبائی مکان میں ہوں اور اپنے بڑے (چچیرے) بھائی سے وہ تمام واقعہ نقل کر رہا ہوں جس سے مجھے آج دوچار ہونا پڑا تھا۔ میرے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ اگر مجھے امروہے میں گرفتار کرلیا گیا تو یقیناً پاکستانی ہائی کمیشن اس معاملہ میں مداخلت کرے گا۔ اور پاکستانی اخبارات اس ناحق گرفتاری پر خاموش نہ بیٹھیں گے ابھی میں اپنے چچیرے بھائی سے جوش و خروش کے عالم میں گفتگو کر رہا تھا کہ یکایک میں نے محسوس کیا کہ میں خواب کی دنیا میں اس تجربے سے گذر رہا ہوں اس احساس کے ساتھ ہی میرے شعور کی سطح کس قدر بلند ہوگئی۔ اور میں نے محسوس کیا کہ خواب کی تہہ سے بیداری کی سطح کی طرف (آہستہ آہستہ) سفر کر رہا ہوں جیسے کوئی شخص تاریک سرنگ سے دھیرے، دھیرے دھیرے دھیرے —— دھیرے دھیرے کسی روشن وادی کی طرف آرہا ہو۔ خواب کی گھپ اندھیری سرنگ سے بیداری کی دھوپ سے چمکتی ہوئی شعوری چوٹی تک پہنچنے میں مجھے دو تین سکنڈ نہیں اس سے بھی کم شاید ایک سکنڈ کا وقفہ لگا ہوگا۔ اس ایک سکنڈ کا ذہنی تجربہ مجھے اب تک یاد ہے میں نے اس ایک سکنڈ بلکہ اس ایک سکنڈ کے ساٹھویں حصے تک کو گذرتے ہوئے محسوس کیا۔ یکایک میرے دماغ کے شعوری حصے بیدار ہو گئے۔ اور میں نے استدلال۔ تصور، حافظے وقوف اور احساس کی تمام ذہنی قوتوں کو کام کرتے ہوئے پایا۔ میں ایک سکنڈ قبل عالم خواب میں امروہے کے اندر بغیر ویزے کے موجود تھا کبھی گلی سے گذر رہا تھا۔ کبھی تھانے میں محرر تھانہ سے گفت گو کر رہا تھا۔ اور کبھی اپنے بوسیدہ آبائی دیوان خانے میں بھائی صاحب قبلہ سے گفتگو کر رہا تھا

خواب اور بیداری۔ بے شعوری۔ اور خود شعوری دو مختلف براعظم ہیں۔ میں نے ان دونوں براعظموں کو ایک سکنڈ میں طے کرلیا۔

جاگنے کے بعد میں نے دل کو دھڑکتے، سانس کو تیز تیز چلتے اور جسم کے بعض اعضا کو تھرتھراتے ہوئے پایا۔ آخر امروہے سے کراچی تک کا سفر ایک سکنڈ میں جو طے کیا تھا۔ جسم کی یہ حالت نہ ہوتی تو کیا ہوتی؟ جاگنے کے بعد اپنے کو عروس البلاد کراچی کے ایک آرام دہ مکان کے اس سے زیادہ نرم و گرم بستر میں خود کو محفوظ پاکر رئیس امروہوی کو اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی خوشی سچ مچ بیداری کے عملی تجربے کے بعد ہوتی۔ یہ ہے وہ خواب جو میں نے کل دیکھا صبح پانچ بجے کے قریب جب کہ میں عموماً شعوری طور پر نہیں تو تحت الشعوری طور پر یا نیم شعوری طور پر کسی قدر بیدار ہو جاتا ہوں۔ میں نے اپنے بہت سے خوابوں میں سے اس خواب کو اس لئے چنا ہے کہ یہ تازہ ذہنی تجربہ ہے اور اس کی بعض تفصیلات مجھے یاد ہیں۔ اب میں اس خواب کی بعض خصوصیات پر خواب کی سائنس (علم الرویا) کی روشنی میں کچھ روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

اس خواب سے انسانی نفس کی بعض اہم اور قابل غور خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے۔

انسانی نفس جسم میں کیمیاوی اور عضوی تبدیلیاں پیدا کرنے کی عجیب و غریب صلاحیت رکھتا ہے۔ میں نے خواب میں اپنے کو ہولناک واقعات سے دوچار پایا اور نفس پر جو کیفیات وارد ہوئیں۔ انہوں نے دل کی دھڑکن اور سانس کی رفتار کو تیز تر کر دیا۔ خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں نفسِ انسانی کی جذباتی کیفیات جسم کے عضویاتی اور خون کے کیمیاوی عمل پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

خواب۔ ہمارے نفس کی ایک غیر معمولی حالت کو کہتے ہیں۔ ہم نے اس حالت کو غیر معمولی اس لئے کہا کہ نفس خواب میں جن خصوصیتوں کا مظاہرہ کرتا ہے وہ بیداری کے مظاہرے سے بہت حد تک مختلف ہوتی ہیں۔ ہم بیداری میں زمانہ (ٹائم) اور مکان (اسپیس) کی پابندیوں میں محدود رہتے ہیں۔ لیکن خواب کے عالم میں نفس ان تمام حدود کو توڑ کر زمان اور مکان دونوں کو اپنی مرضی اور صواب دید کے مطابق استعمال کرتا ہے۔

خواب مختلف ٹکڑوں میں دیکھا جاتا ہے۔ مثلاً میرا یہی خواب۔ امروہے کی گلی سے گذر رہا ہوں۔ تھانے میں موجود ہوں۔ آبائی مکان میں اپنے برادر محترم سے بحث کر رہا ہوں۔ خواب کے یہ تینوں ٹکڑے مکانی اور زمانی حیثیت سے الگ الگ تھے۔ مگر ہمارے نفس میں جو منطقی استعداد پائی جاتی ہے اس نے خواب کے ان تینوں ٹکڑوں کو ذہنی تجربے کے ایک رشتۂ مسلسل میں جوڑ دیا۔ لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ خواب کے مختلف اجزا کے درمیان ایک اندرونی منطقی ربط پایا جائے۔ اکثر خواب کے ٹکڑے ایک دوسرے سے بالکل بے ربط ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص نے پہلا خواب دیکھا کہ وہ پہاڑ پر چڑھ رہا ہے پھر خواب ہی میں دیکھا کہ اسکول میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہے۔ پھر دیکھا کہ کھانا کھا رہا ہے۔ خواب کے ان تینوں ٹکڑوں میں جو یکے بعد دیگرے ذہن کی سطح سے گذرے کوئی مقصدی اور منطقی ربط نظر نہیں آتا۔ تاہم ان کی تہہ میں بھی ایک مسلسل مقصدی اور معنوی ربط پایا جاتا ہے اور خواب کی نفسیاتی تعبیر دینے والے کا کام یہ ہے کہ وہ اس رشتہ کو دریافت کرکے خواب دیکھنے والے کی حقیقی ذہنی وحدت کا پتہ چلائے۔

خواب کی نوعیت اور کیفیت کے متعلق بھی چند اہم باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ خواب اپنی ساخت اور تعمیر کے دوران دو مرحلوں سے گذرتا ہے۔ پہلا مرحلہ ہے خواب دیکھنا۔ یعنی انسانی نفس کے بحالت خواب مختلف تجربے۔ دوسرا مرحلہ ہے نفس کے ان مختلف ذہنی تجربوں کو ایک معنوی وحدت کی شکل دینا تاکہ انسانی شعور نفسِ خوابیدہ کے ان مختلف تجربات کا عقلی ادراک کرسکے خواب کے واقعات ہمارے لاشعور میں رونما ہوتے ہیں۔ جب لاشعور میں رونما ہونے والے یہ واقعات شعور کی سطح پر آتے ہیں تو ان کی تنظیم ثانی ہوتی ہے اور یہیں سارا خواب ایک مسلسل واقع کی شکل میں نظر آتا ہے۔

خواب کے دو مفہوم ہوتے ہیں۔ ایک مفہوم وہ جو خواب کی چھال۔ خول یا ظاہری وضع سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا مفہوم وہ جس کا تعلق خواب کے مغز۔ تخم اور معنی سے ہے۔ خواب کا ظاہری مفہوم اس کے باطنی مفہوم سے بالکل یا بہت حد تک مختلف ہوتا ہے اور تعبیر دہندہ کا کام یہ ہے کہ وہ خواب کے ظاہر و باطن یا اس کے مغز و تخم کو ایک دوسرے سے متمیز اور الگ کرکے خواب کی حقیقی غایت کی نشاندہی کرے۔

انسان خواب کیوں دیکھتا ہے۔ مرزا غالب تو اپنے خاص انداز میں اس کا یہ جواب دیدیں گے کہ

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اور میں اپنا حقیر مجموعہ کلام کھول کر۔ بطور تفاول یہ شعر نکال لاؤں گا۔

دل وارفتہ شب ہجر کوئی خواب ہی دیکھ
خواب بھی مایۂ بیداریٔ جاں ہوتے ہیں

لیکن یہ سب شاعرانہ چٹکلے ہیں۔ شاعرانہ چٹکلے نہ سہی فلسفیانہ نکتے سہی۔ علمائے نفسیات نے خواب کے محرکات پر بحث کرتے ہوئے خواب دیکھنے کے کچھ اور

سی مقاصد کی طرف اشارہ کیا ہے مثلاً عام خیال یہ ہے کہ انسانی نفس عالم بیداری میں جن خواہشوں کی تکمیل نہیں کر سکتا وہ سوتے میں ان خواہشوں کو پورا کر لیتا ہے مثلاً بلی کو چھیچھڑوں کے خواب نظر آیا کرتے ہیں۔ یا مشہور کہاوت ہے رہیں جھونپڑوں میں خواب دیکھیں محلوں کے۔ بچوں کے خواب بالعموم اسی وضع کے ہوتے ہیں سادہ۔ فوری اور تسکین بخش۔ بے شک انسانی نفس عالم خواب میں ناآسودہ خواہشوں کی تکمیل کی کوشش کرتا ہے اور اکثر خوابوں کی تہہ میں اس قسم کی دبی ہوئی لاشعوری الجھنیں پائی جاتی ہیں لیکن یہ صرف خواب اور تعبیر خواب کا ایک پہلو ہے اس کے کچھ اور بھی پہلو ہیں۔ ہر خواب تسکین بخش نہیں ہوتا بعض خواب سخت ڈراؤنے اور ہولناک ہوتے ہیں۔ مثلاً میرا بیان کیا ہوا خواب۔ اس خواب کے ذریعہ میرے نفس نے مجھے کسی خطرے کی طرف سے متنبہ کیا ہے۔ وہ خطرہ کیا ہو سکتا ہے۔ صرف اجزائے خواب کی تحلیل کے بعد ہی اس امر کا پتہ چل سکتا ہے کہ اس مہیب خواب کی تہہ میں کون سی مہیب حقیقت چھپی ہوئی ہے۔

اب یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ نفس انسانی میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ مستقبل کی جھلک دیکھ سکے۔ یہ کوئی فوق الفطرت قوت نہیں بلکہ دماغی عمل کا ایک حیرت انگیز مظہر ہے۔ چونکہ عام طور پر ہم اپنی اس دماغی قوت کو استعمال نہیں کرتے اس لئے مستقبل کے کشف کو لوگ معجزہ سمجھنے لگے ہیں یہ معجزہ نہیں صرف فرق عادت یعنی سپر نارمل ایک چیز ہے۔ سچی مستقبل نما خوابوں کی مثالیں تاریخ میں بھی مل سکتی ہیں۔ دیومالائیں بھی ادب میں بھی اور عام زندگی میں بھی۔

بعض خواب۔ کسی حیاتیاتی ضرورت کی تکمیل کرتے ہیں۔ مثال کے طور بعض امراض کی تشخیص بعض خوابوں کے ذریعہ کی جا سکتی ہے۔ یا خواب کے ذریعہ پتہ چل سکتا ہے کہ خواب دیکھنے والے کو اپنے کسی خاص طرز عمل یا انداز فکر کی بنا پر کسی قسم کے خطرے کا اندیشہ لاحق ہے۔ اگر کوئی شخص پے در پے بار بار ٹریفک کے حادثات کو خواب میں دیکھے تو اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ شخص سڑک پر چلتے ہوئے بے احتیاطی سے کام لیتا ہے اس بے احتیاطی کے خلاف نفس نے بذریعہ خواب وارننگ دی کہ اس شخص کو سڑک پر چلتے یا چوراہوں کو پار کرتے ہوئے زیادہ ہوشمندی کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔

خواب کی اہم خصوصیت ہے علامتوں اور استعاروں کا استعمال۔ ہمارے نفس میں تخییل و تصور کی جو استعداد کارفرما ہے وہ ہمیشہ استعارہ سازی اور علامت طرازی کے ذریعہ جذبات کی شدت کا اظہار کیا کرتی ہے۔ درحقیقت خواب اور شعر۔ یہ دونوں عمل یکساں نوعیت رکھتے ہیں فرق ہے بیداری اور خواب کا۔ بیداری میں نفس انسانی اپنی شدت جذبات کا اظہار۔ مبالغے۔ شدت اور وسعت و ہمہ گیری کے ساتھ کرنا چاہتا ہے۔ معمولی کلام کے ذریعہ یہ مقصد حاصل ہوتا نہیں لہٰذا کلام میں شدت اور تاثیر پیدا کرنے کے لئے مبالغے اور اغراق کی کیفیت پیدا کی جاتی ہے۔ یہ کیفیت استعاروں اور علامتوں کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے مثلاً آپ غصے کی کیفیت کا اظہار ان لفظوں میں نہیں کریں گے کہ مجھے غصہ آ رہا ہے۔ بلکہ میں غصہ میں کھول رہا ہوں کا استعمال کریں گے یا مزید شدت پیدا کرنے کے لئے "کھول رہا ہوں" کے استعارہ کو اور لطیف و شدید کر دیں گے۔ مثلاً میرے آگ لگ گئی۔ آگ لگ گئی۔ ان تین لفظوں نے اس شدت و تپش کو ظاہر کر دیا جو غصے سے آپ محسوس کر رہے ہیں۔

انسانی ذہن کی یہ صلاحیت استعارہ طرازی بیداری ہی میں نہیں عالم خواب میں بھی بروئے کار آتی ہے اور جب ہم سوتے میں اپنی کسی شدید جذباتی کیفیت کا اظہار بذریعہ خواب کرنا چاہتے ہیں تو ذہن اس کیفیت کی ترجمانی کے لئے کوئی نہ کوئی علامت تلاش کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر خواب میں سانپ کو دیکھنا دشمن کی علامت ہے۔ سفر موت کا استعارہ ہے۔ یوں سمجھئے کہ بیداری کے عالم میں زندگی کے اہم واقعات کو بیان کرنے کے لئے نثر و نظم میں ہم جن استعارات۔ علامات اور تشبیہات کا سہارا لیتے ہیں۔ بحالت خواب بھی انہی علامتوں کو استعمال کرتے ہیں کسی قوم کے مخصوص استعارے جو اسکی کہاوتوں دیومالائی کہانیوں۔ مذہبی قصص اور ادبی و شعری تخلیقوں میں ملتے ہیں انہیں کے پیش نظر اس قوم کا علم تعبیر خواب مرتب ہوتا ہے۔

تعبیر خواب کے سلسلے میں ایک بات اور یاد رکھنی چاہیئے وہ یہ کہ خواب کے فوری محرک کو پچھلے چوبیس گھنٹے یا دو تین روز کے تاثرات میں تلاش کرنا چاہیئے۔ فرض کیجئے۔ آج دن میں دفتر میں اپنے افسر سے میری جنگ ہو گئی اور اس نے مجھے دھمکی دی کہ خبردار میں تمہارے "کیریر" کو تباہ کر دوں گا۔ افسر کی دھمکی سے میں شدید طور پر متاثر ہوا۔ لیکن شعور نے اس تاثر کو لاشعور میں دبا دیا۔ اب ہو سکتا ہے کہ شب میں یہ خواب دیکھوں کہ میں دفتر میں اپنی میز پر بیٹھا ہوا کام کر رہا ہوں یکایک کسی کام سے میز کی دراز کھولی تو ایک سانپ پھنکارتا ہوا نکلا۔ اور اچھل کر مجھ سے لپٹ گیا۔ اس خواب میں سانپ افسر کا استعارہ ہے اور کسی کاغذ کی تلاش میں میز کی دراز کھولنا اپنی دفتری کارکردگی کی علامت۔ تو خواب کی تعبیر یہ ہوئی کہ میری دفتری کارکردگی (کیریر) کو افسر سے خطرہ ہے۔

اب ان حقائق کی روشنی میں اس خواب کی تعبیر پیش کرنی چاہیئے میں نے خواب اور ہلکی بیداری کے درمیان کے لمحے میں اپنے کو ویزا کے بغیر امروہے میں پایا۔ یہ خواب تین ٹکڑوں میں دیکھا گیا۔۔ (الف) گلی سے گذر رہا ہوں (ج) تھانے میں پیش ہوں (د) اپنے آبائی مکان میں چچیرے بھائی سے بحث کر رہا ہوں۔ اس خواب کا مستقل کردار وہ شخص ہے جو خواب میں ہر مرحلے پر میرے ساتھ ہے اب سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس خواب کا فوری محرک کیا تھا؟ میں نے پچھلے ۲۴ گھنٹے کے واقعات پر نظر ڈالی اور اس لاشعوری خطرے کی تلاش شروع کر دی جو سوتے میں خواب کا روپ بدل کر سامنے آیا تھا۔ سوچتے سوچتے یہ خطرہ ذہن میں واضح طور پر آ گیا۔ آجکل سیاسی جدوجہد کا زمانہ ہے اور میں قوم کی اس عام سیاسی جدوجہد کے زمانہ میں مسلسل ذہنی اور دماغی خطرات کے انجان خطوں میں سفر کرتا رہا ہوں۔ ذہنی اور دماغی خطرات کے یہ انجان خطے قدم قدم پر موجود ہیں۔ میرا ہر قدم ایک پر از خطر وادی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ اس خواب کے نظر آنے سے قبل ایک ایسے شخص نے (جس کی نیت پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا اور جس سے ہمیشہ خطرہ محسوس ہوتا رہا ہے) مجھے ان خطرات کی طرف سے متنبہ کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ قلم کا میدان ہو یا قدم کا۔ آپ دونوں میدانوں میں اپنے لئے دشواریاں پیدا کر رہے ہیں اس نے مجھے ترغیب دی کہ ان خطرات سے بچنے کے لئے کیا کیا کرنا چاہیئے۔ مجھے یاد آیا کہ اس شخص کا انداز گفتگو بھی کسی حد تک اشتعال انگیز تھا۔ پھر یہ بھی کہ مستقبل کے جن ہولناک امکانات کی نشاندہی کی گئی تھی وہ اگر یقینی نہیں تو ممکن الوقوع ضرور تھے۔ اس خطرناک گفتگو سے میں نے بلاشبہ تاثر قبول کیا اور نفس کے اندر اس خطرے کی پرچھائیاں کلبلانے لگیں۔ جو صحافت و شعر کے میدان میں میرے غیر محتاط طرز عمل سے مستقبل میں پیدا ہو رہا تھا میں نے شعوری کوشش سے اس خطرناک تاثر کو لاشعور میں دبا دیا اور اپنے کو یہ کہہ کر بہلا دیا۔ تسکین ذہن کر لی۔ خود کو فریب دیدیا کہ نہیں مستقبل میں اس قسم کا کوئی خطرہ درپیش نہیں ہے اور یہ کہ عملی زندگی کے میدان میں میرا موجودہ طرز عمل ہرگز غیر محتاط نہیں ہے۔ شعور نے استدلال کی قوت سے کام لیکر خود کو مطمئن کر لیا۔ مگر نفس کی اندرونی تہوں میں خطرہ کا بچھو رینگ رہا تھا۔ خواب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ مستقبل کے لئے انتباہ (وارننگ) کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ نفس نے عالم خواب میں مجھے متنبہ کیا کہ غیر محتاط طرز عمل مستقبل میں اہم خطرات پیدا کر سکتا ہے۔ اب یہ اہم خطرات خواب کے روپ میں نظر آئے۔ اب آپ بیداری کے خطرناک امکانات کا ترجمہ خواب کے واقعات میں کیجئے۔ امروہے میں ویزے کے بغیر داخلے کے معنی یہ ہیں کہ میں موجودہ عملی زندگی کے کسی پر از خطر خطے میں سفر کر رہا ہوں ایسے خطے میں جہاں داخلہ ممنوع ہے۔ وہ تنگ گلی جس سے (خواب میں) اپنے کو گذرتے ہوئے پایا۔ صحافت کی وہ تنگ شاہراہ ہے جس میں گذر رہا ہوں۔ اور تھانہ؟ تو یہ ایک استعارہ ہے کسی بالا اقتدار کا جو مجھے کسی وقت بھی چیلنج کر سکتا ہے۔ وہ شخص جو خواب میں تنبیہ کر رہا تھا بیداری کا وہ ناصح مشفق تھا جس نے بڑے اشتعال انگیز لہجے میں میرے مستقبل کے بارے میں پیش گوئیاں کی تھیں میں نے خواب کے آخر میں اپنے چچیرے بھائی سے اپنے کو پرجوش تقریر کرتے ہوئے پایا تھا۔ یہ تھی میرے نفس کی وہ قوت مدافعت جس نے خواب میں ممکنہ خطرات کے خلاف میرا بچاؤ کیا۔ اس تعبیر کی روشنی میں آپ ہر خواب کے نفسیاتی پہلوؤں کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

ملک میں پہلی بار

عازمین حج کیلئے

سعودی ریال

ٹریولرز چیک

نیشنل بینک آف پاکستان

کی طرف سے جاری کئے جا رہے ہیں

☐ یہ ٹریولرز چیک آسانی سے حاصل ہو سکتے ہیں اور آسانی سے بُھنائے جا سکتے ہیں۔
☐ ریال کی طرح سعودی عرب میں ہر جگہ قابلِ قبول ہیں۔ ☐ سعودی عرب کے کسی بھی بڑے بینک یا جدّہ میں نیشنل بینک کی شاخ میں پوری قیمت پر بُھنائے جا سکتے ہیں۔
☐ ان کی قیمت پر شرح مبادلہ کی کمی بیشی کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ ☐ گم ہو جانے یا ضائع ہو جانے کی صورت میں فوراً دوبارہ حاصل کئے جا سکتے ہیں ☐ ان کے بُھنانے کی مدّت پر کوئی پابندی نہیں۔

نیشنل بینک آف پاکستان

قومی ترقی میں معاون

United

غزل



بیہوشیوں کو ہوش بنا کر چلے گئے — ایسی شراب آج پلا کر چلے گئے
سو فتنے اک نگہ میں اٹھا کر چلے گئے — کعبہ کہا جو دل کو تو ڈھا کر چلے گئے
وہ آئے بھی تو منہ کو چھپا کر چلے گئے — برباد آرزو کو مٹا کر چلے گئے
اتنی خطا پہ عید کا چاند ان کو کیوں کہا — بس دور ہی سے شکل دکھا کر چلے گئے
کہنے کو آئے تھے وہ تسلّی کے واسطے — کچھ اور اضطراب بڑھا کر چلے گئے
مستانہ چال، لب پہ تبسّم نظر میں کیف — یوں آئے اور ہوش اڑا کر چلے گئے
پوچھا جو دل کو ہائے رے شوخی کہ ناز سے — دستِ حنائی اپنے دکھا کر چلے گئے
حیرت ترے سپرد ہے اب کاروبارِ شوق — وہ جلوۂ جمال دکھا کر چلے گئے
مطلب یہ تھا کہ شوق میں شامل ہو اضطراب — آغوشِ انتظار میں آ کر چلے گئے
اپنے شہیدِ ناز کو گلہائے زخم سے — اک پیکرِ بہار بنا کر چلے گئے
وہ نازنیں ہی نہیں نازآفریں بھی ہیں — دل کو سب اپنے طور سکھا کر چلے گئے
وہ لذّتِ خلش ہے کہ تڑپا ہی کیجئے — اس نازکی سے دل کو دکھا کر چلے گئے
پھر جذبۂ لطیف ہوا ہے لطیف تر — رنگینیوں میں کیف ملا کر چلے گئے
تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصلِ بہار کو — دیوانے تیرے دھوم مچا کر چلے گئے

آزردہ ہیں کہ پردے میں اشعار کے اثرؔ
سب اپنی سرگزشت سنا کر چلے گئے

راجہ مہدی علی خاں



ایکٹریس بننے سے پہلے

(۱)

فلم میں کام کروں میں مجھے مجبور نہ کر
سیم و زر کے لئے آنکھوں سے مجھے دور نہ کر

اس چمن میں جو کلی بن کے مہک جاؤں گی
چلیں الفت کی ہوائیں تو چٹک جاؤں گی
کہیں نظروں نے پلادی تو بہک جاؤں گی
میں تیرے پیار کی راہوں سے بھٹک جاؤں گی

سحر باتوں کا چلا کر مجھے مسحور نہ کر!
فلم میں کام کروں میں مجھے مجبور نہ کر

جانِ جاں قتل نہ کر اپنے ہی ہاتوں سے مجھے
کیا کروں لگتا ہے ڈر عشق کی گھاتوں سے مجھے
نہ لبھالے کوئی الفت بھری باتوں سے مجھے
نیند اس غم میں نہ آئی کئی راتوں سے مجھے

حسن کا چاند ہوں ہنس کر مجھے بے نور نہ کر
فلم میں کام کروں میں مجھے مجبور نہ کر

وہ کمانوں کی کمیں گاہ وہ تیروں کی زمیں
وہ تو ہے "جرم محبت" کے اسیروں کی زمیں
میں تو سنتی ہوں وہ ہے عشق کے پیروں کی زمیں
مست رانجھاؤں کا وہ دیس وہ ہیروں کی زمیں

ان کی اک ہیر بنانا مجھے منظور نہ کر!
فلم میں کام کروں میں مجھے مجبور نہ کر

آرزو ہے کہ تیری خوشیوں کا پیغام رہوں
منتظر میں تیری آمد کی سرِ شام رہوں
تیرے ہونٹوں کے قریں بن کے حسیں جام رہوں
میں ترے پیار کی دنیا ہی میں گمنام رہوں

اپنی گمنام کو ہر شہر میں مشہور نہ کر
فلم میں کام کروں میں مجھے مجبور نہ کر

شمع ہوں دیکھ مجھے بھیج نہ پروانوں میں
حسن کے نور کو پہنچا نہ شبستانوں میں
اپنی لیلیٰ کو یوں ہی رہنے دے ویرانوں میں
تیری اپنی ہوں مجھے بھیج نہ بیگانوں میں

اجنبی خاک کو اس ماتھے کا سیندور نہ کر!
فلم میں کام کروں میں مجھے مجبور نہ کر

بن کے بت آ نہ سکوں گی کبھی بت خانے سے
پھر نہ سمجھوں گی کبھی میں تیرے سمجھانے سے

"چراغ کہاں" "روشنی کہاں"

...ھی الجھوں کی ظالم تیرے سلجھانے سے
...ں نہیں آتا کبھی پچھتانے سے
... ک

ایکٹریس بننے کے بعد

"غیر کی باہوں میں ظ...
فلم میں کام کر...

اب بصد شرم و حیا...
لاکھ آنکھوں نے ...
ہر طرف آئی نظر بزم...
اس کو "ساحل" سے ... ے ہی"
...ے شرماتی ہوئی مجھ سے ذرا دور ہوئی
اپنی دل پھینک اداؤں سے وہ مشہور ہوئی

اس چمن میں وہ کلی بن کے مہکنے بھی لگی!
چلیں الفت کی ہوائیں تو چٹکنے بھی لگی
جو نگاہوں نے پلادی تو بہکنے بھی لگی
پھر میرے پیار کی راہوں سے بھٹکنے بھی لگی

اس طرح سے مۓ الفت میں وہ مخمور ہوئی
جس نے دل اس کو دیا اس کی وہ مشکور ہوئی

زلف کی قید سے ہنس کر مجھے آزاد کیا
مسکراتے ہوئے ہر غیر کا دل شاد کیا
خود تو شیریں نہ بنی اور مجھے فرہاد کیا
اس نے مجھ کو نہیں۔ میں نے اسے برباد کیا

میرے غم سن کے نہ اک لحظہ وہ رنجور ہوئی
نرگسیں آنکھ وہ اشکوں سے نہ بھرپور ہوئی

اب تو موٹر بھی ہے کوٹھی بھی ہے اور نام بھی ہے
سیر جوہو کے کنارے پہ سرِ شام بھی ہے
ساتھ اغیار کے ہونٹوں کے قریں جام بھی ہے
اور میرے ذکر پہ میرے لئے دشنام بھی ہے

شمع محفل بنی۔ شعلہ بنی مغرور ہوئی
کتنے غم دے کے مجھے ہائے وہ مسرور ہوئی

پھر کبھی لوٹ کے آئی نہ وہ بت خانے سے
اس نے سمجھی نہ کوئی بات بھی سمجھانے سے
اور بھی مجھ سے الجھتی گئی سلجھانے سے
تیر واپس کبھی آتا نہیں پچھتانے سے

ایک بجلی تھی نگاہوں سے جو مستور ہوئی
میری جنت سے بہت دور میری حور ہوئی



پرکاش پنڈت

چونگی خانہ



جی ہاں میں یہاں چونگی خانے میں محرّر ہوں۔ — یہی کوئی تیرہ چودہ برس سے — کام؟ — کام وام نہ پوچھئے۔ دن بھر مسافروں کی تلاشیاں لینا، بدلے میں چنگی منڈی گالیاں دینا، محصول وصول کرنا اور ہر لٹے سیدھے طریقے سے رشوت کے پیسے بٹورنا، یہی میرا کام ہے —

اچھا کام نہیں ؟ اجی صاحب اچھا ہو یا برا کام آخر کام ہے اور بزرگ کہہ گئے ہیں کام کوئی برا نہیں ہوتا۔ اپنا اپنا خیال ہے جناب۔ آپ چاہے جو کہیں میں تو یہی کہوں گا کہ یہ سب کھاتے پیتے لوگوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ دوسروں کو الو بنا کر اپنا الو سیدھا کرنے کا درمیانی راستہ! ورنہ اخلاق نام کی چڑیا پھر سے اڑ جاتی ہے اگر ہڈی مضبوط نہ ہو اور دو دن کا فاقہ ہو جائے۔ آپ ہی بتایئے اس برکتوں بھرے زمانے میں جب کہ آٹا روپے کا دو سیر بھی نہ ملے اور میں آدمی کو سوکھے اسی روپے مہینہ اور گھر میں پون درجن جاتے کی پیٹھ اور آتے کا منہ دیکھتی ہو۔ اگر رشوت لینا بداخلاقی ہے تو گھر کے پیٹ والوں کا پیٹ نہ پالنا۔ آپ ہی بتایئے آپ اسے کیا کہیں گے ـــ ؟ جی نہیں ـــ جی ہاں ،

ایک طرح سے محرری مجھے ورثے میں ملی ہے۔ دادا محرری کے ساتھ ساتھ ساہوکاری کرتے رہے۔ باپ نے گاؤں کا کچا مکان پکا بنوایا۔ سنا ہے سیٹھ سوداگر اشرفیوں کی پوٹلیاں پیش کرتے تھے لیکن آفرین ہے میرے بااخلاق بزرگوں پر کہ کبھی من میں میل نہیں آنے دیا۔ جی ؟ جی یہ تو میرے بزرگ ہی جانیں یا ان کا خدا جس نے ان کے پہنچتے ہی جنت کے دروازے چوپٹ کھول دیئے ہوں گے اور بذات خود مسند سے اتر کران کے خیر مقدم کو پہنچا ہوگا۔ البتہ اپنے بارے میں میں جانتا ہوں کہ۔ جی نہیں، اس میں بزرگوں کی توہین کی کیا بات ہے بلکہ اگر آپ غور فرمائیں تو آپ کو اس میں براہ راست میری توہین نظر آئے گی۔ معاف کیجئے گا۔ میں اور آپ پیداوار ہی اس زمانے کی ہیں جس میں رشوت نہ لینا پرلے درجے کی حماقت ہے۔ بلکہ میں تو اسے ڈھٹائی کہوں گا اجی نہیں، آپ کو معلوم نہیں۔

شروع شروع میں میں نے بھی حد درجہ ڈھٹائی کا ثبوت دیا تھا۔ بیوی چیتھڑے لٹکاتی تھی اور بچے پیٹ بجاتے تھے لیکن میں خوش تھا کہ باپ دادا کا نام روشن کر رہا ہوں۔ خیر، اسے چھوڑیئے۔ آپ جس کام سے یہاں آئے ہیں پہلے وہ ہونا چاہیئے باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔ چلیئے آپ کو یہاں کی سیر کرا لاؤں۔ کچھ لسی پانی ؟۔ واہ یہ خوب کہی آپ نے۔ آپ اس کی فکر نہ کیجئے جناب۔ اگر ایک بار باپ دادا کا نام ڈبو دیا ہے تو دو چار ڈبکیاں اور دینے سے انھیں کون سا اچھو آ جائے گا۔ ابھی صبح ہی ایک آسامی ہتے چڑھ گئی تھی۔ دو روپے محصول کی اشیاء پر بارہ لے لیکر بخش دیا۔ کیا فرمایا ؟ نہیں صاحب وہ تو صاف جل دے جانا چاہتا تھا۔ جی ہاں۔ ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ آپ یہ کہتے ہیں۔ بعض اوقات تو ایسے ایسے اکھڑ اور کاٹیاں لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے کہ آپ چاہے گاتے گاتے کلونت ہو جائیں ان کے کان پر جوں نہیں رینگتی لاکھ انھیں کے فائدے کے لئے سر پٹخو پر مجال ہے جو ٹس سے مس ہو جائیں۔ کوئی پوچھے کہ بھلے آدمی ڈبل روپے کی جگہ چھ آنے میں چھٹکارا ہو رہا ہے تو اتنے بکھیڑے کی کیا ضرورت ہے بے چارے ضمیر کو کیوں خواہ مخواہ تکلیف دیتے ہو اور حکومت صرف تمہارے چند ٹکوں کے سہارے بالکل جی نہیں رہی۔ وہاں تو کچھ پوچھ پڑتال ہی نہیں۔ لیکن نہیں مانیں گے بلکہ مزے کی بات دیکھیے کہ الٹا ڈانٹیں گے۔ دھمکی دیں گے کہ اپنی نوکری کی خیر مناؤ اس وقت تمہیں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ جب تھانے میں بے بھاؤ کی پڑیں گی۔ لیکن صاحب آپ جانیں، آخر ہم بھی تو کچی گولیاں نہیں کھیلے اور حکومت نے ہمیں بھی تو کچھ اختیارات دے رکھے ہیں ان کی اول فول کے جواب میں جوں ہی ہم قانون کے رنٹ سنٹ شکنجے کھڑاتے ہیں کہ سارا پتہ پانی پولیس کپتان کے قریبی رشتہ دار اور صدر ریاست ملک رسائی رکھنے والے تیس مار خاں منٹوں میں مٹی کے مادھو بن جاتے ہیں۔ ایسی سٹی گم ہوتی ہے کہ ساری جیبیں جھاڑ لیجیئے اور تف کہہ دیجئے اگر جھینک تک آ جائے ـــ لیجئے صاحب، دوکان تو آ گئی۔ کیا پہچانیں گے آپ ؟ جی نہیں۔ اسکا نام رام لبھایا ہے۔ لالہ رام لبھایا لاہوریا۔ داڑھی تو اس نے شوقیہ بڑھا رکھی ہے۔ اجی آپ اُدھر دھیان نہ دیجیے۔ حلوائی بیچارے تو گندے ہوتے ہی ہیں۔ کام ہی ایسا ہے اور کام کے بارے میں آپ جانیں۔ بزرگ کہہ گئے ہیں ......

.... ہاں ہاں وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن آپ مجھے یہ بتایئے کہ آخر ایسی کون سی جگہ ہے جہاں گندگی نہیں۔ اسکی لسی پیئں گے تو پتہ چلے گا۔ ہونٹ چاٹتے رہ جائیں گے۔ جی ہاں، بالکل اسی طرح دن بھر گاہکوں کا تانتا بندھا رہتا ہے اور صاحب کیوں نہ بندھے چیز بھی تو بس ایک بناتا ہے۔ آپ ذرا صبح آتے پھر دیکھتے، باقاعدہ کیو میں کھڑا ہونا پڑتا۔ وہ، وہ چھوکرا اس کا ملازم ہے۔ بڑا نمک حرام ہے یا جی کسی دوسری ملازمت کی تاک میں ہے نہیں جی، آپ اسے نہیں جانتے۔ بس شکل سے ہی مسکین نظر آتا ہے۔ سالے کی ساری مسکینی نکل جائے گی۔ جب رام لبھایا کھرپی مار حرامی کا سر پھوڑ دے گا۔ یونہی، نہیں یوں تو کوئی خاص وجہ نہیں۔ جی ؟ چھ روپے اور روٹی کپڑا۔ نہیں صاحب، میں پھر آپ سے کہتا ہوں کہ آپ اسے نہیں جانتے۔ ایسا چونچال ہے کہ ابھی آپ کے سامنے بیٹھا جو ٹھے گلاس اور بالٹیاں مانجھ رہا ہے کہ رس گلوں کی مہک نے آ ستایا۔ بس پھر دیکھئے یوں پلک جھپکنے میں رہی یا دودھ کا برتن لانے کے بہانے اندر سے دو ایک رسگلے چٹ کر آئے گا۔ جی ہاں سو تو ٹھیک ہے۔ پہاڑ پر یہ سب نہیں تھا۔ وہاں باپ بھوکا رہتا تھا اور مارتا تھا۔ ماں بھوکی رہتی تھی اور روتی تھی اور اپنے باقی کے پانچ سات نونہالوں کے ساتھ اسے بھی پچکار پچکار کر سلانے کی کوشش کرتی تھی۔ یہ تو صاحب آپ نے میرے منہ کی چھینی کہ پچکارنے سے پیٹ نہیں بھرتا۔ یہ جو ہم محرروں کی اسی روپے بطور تنخواہ ملتے ہیں تو انھیں بھی آپ اسی پچکارے ہی سمجھ لیجیے ـــ کیا کہا، اس چھوکرے کی کہانی سنیے بڑے چٹخارے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ اجی ؟ جی بس اتنا ہی۔ کہ دن بھر کے فاقے کے بعد ایک دن جب اس کے باپ نے اسے مرغا بنایا اور اوپر سے جوتے پھٹکارے تو اسی رات اپنے ایک ساتھی کے ساتھ یہ گھر سے سٹک گیا۔ ساتھی ؟ جی وہ تو اب اس کے ساتھ نہیں، اللہ میاں کے ساتھ رہتا ہے۔ ہوا یوں کہ گھر سے بھاگنے کے بعد اس کے ساتھی کو ایک صاحب کے یہاں خانساماں کی جگہ مل گئی ہفتہ دس دن دونوں نے خوب گلچھرے اڑائے لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ صاحب نے اسے ایسا دھر کے پیٹا، ایسا پیٹا کہ وہیں کا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ یہ تو اس کی قسمت اچھی تھی جو بچ نکلا ورنہ یہاں کے بجائے اس سے کبھی ہماری ملاقات اللہ میاں کے یہاں ہی ہوتی۔ اجی کہاں، یہ بھلا اتنی دور کالے کوس کہاں پہنچ سکتا تھا۔ وہ تو رام لبھایا کے ایک بھانجے کی دوکان اس قصبے میں تھی۔ رام لبھایا اس کے بیٹے کے منڈنوں پر وہاں گیا ہوا تھا کہ صبح اسے بھی بھٹی پر سینے سے ٹانگیں لگائے ٹھٹھرتے دیکھ یہاں اٹھا لیا اور اب یہاں عیش کرتا ہے۔ کیا کہا۔ احساس کمتری ! اگر آپ مجھے معاف فرمائیں تو میں آپ سے عرض کروں گا کہ میں آپ کی طرح زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ یہ احساس کمتری کیا چیز ہوتی ہے صاحب ؟ اوہ ـــ تو اسے کہتے ہیں ہاں صاحب یہ تو اندھوں کو بھی دکھائی دیتا ہے کہ یہ اپنے مالک رام لبھایا سے زیادہ جان کھپاتا ہے کیا فرمایا، تین آنے کی مزدوری پر تین روپے کا کام اجی صاحب ایسے چلتے ہوئے جملے آپ صرف کہانیوں میں ہی لکھ سکتے ہیں۔ باہری دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ انصاف ! کس بات کا انصاف !! انصاف ونصاف کی چھوڑیئے۔ یہاں تو بے انصافی بھی انصاف سے ہوتی۔ چلیئے، آپ ہی انصاف سے بتایئے۔ رام لبھایا نے اسے پورے دو سال تک دوکانداری سکھائی۔ گاہک سے بات برتاؤ کا سلیقہ مٹھائی بنانے کی کاریگری۔ سب کچھ سیکھ چکنے کے بعد اگر یہ دو ٹکوں کے لالچ میں سب نیکیوں پر پانی پھیر جائے۔ تو بتایئے، آپ اسے کیا کہیں گے بے اطمینانی ! کمال کرتے ہیں آپ بھی !! اجی صاحب! بے اطمینانی کا احساس ان کھوپڑیوں کے لئے نہیں بنا۔ یہ کھوپڑیاں تو کھرپیوں اور ڈنڈوں ہی کی محتاج ہیں ـــ خیر جی چھوڑیئے۔ دے جائے دغا، پھر کون ساوہ ہو جائیگا

اس ایسے سیکڑوں تلوے چاٹنے آئیں گے۔ کیا فرمایا آپ نے ؟— بلونی! کون سی بلونی! اوہ، ہاں وہ بسی بلونے کی بلونی۔ جی ہاں، یہ بلونی اس چھوکرے ہی کے رحم پر ہے لیکن یوں چلیں گے صاحب تو یہ سلسلہ کہیں ختم نہ ہوگا۔ بلونی چھوکرے کے رحم پر ہے۔ چھوکرا رام سبھایا کے رحم پر ہے رام سبھایا میرے اور آپ کے رحم پر ہے اور ہم جس کسی کے رحم پر ہیں خوب ہیں۔ نہیں جی، پہلے یہ کہاں اس پھرتی سے کام کرتا تھا۔ آپ نے اسے اس حالت میں نہیں دیکھا۔ صبح چلتے چلتے بلو رہا ہو چاہے رات کو کڑاہی مانجھ رہا ہو۔ یوں برتنوں میں گھس گھس کے اونگھتے لگتا تھا کہ ..... جی نہیں؛ اب ایسا نہیں ہوتا۔ ایک دن رام سبھایا نے اسی بلونی سے جو دن بھر اس کے رحم پر ہوتی ہے۔ اسکی ہڈی پسلی ایک کردی تھی۔ اس دن سے رام سبھایا نے اسے تاکید کر رکھی ہے کہ صبح چار بجے اٹھا کرے اور رات کو ایک دو بجے سینما کا دوسرا شو ختم ہونے کے بعد اگر دودھ دہی سب بک جائے تو دوکان بڑھا کر آرام سے سو رہے شروع شروع ؟ ہیں تو..... وہ — وہ سب تو بیکار لوگ ہیں صاحب — اڈے کے مزدور ہیں۔ انھیں چھوڑ دیئے پہلے مجھے بتایئے کہ میں نے جو اتنی دیر سے حلق میں زبان نہیں اٹھائی تو کچھ آپ کے مطلب کی بات کبھی ملی یا بس یونہی وقت برباد ہوا ؟ — جی نہیں، آپ بھول رہے ہیں یہاں بھلا کہانی کا پلاٹ کیا خاک ملے گا۔ باتیں اور کیا۔ یہ تو اسی طرح دن رات باتیں کرتے رہتے ہیں۔ لیجیے، مجھے کیا معلوم کہ کیا باتیں کرتے ہیں۔ وہ ؟— وہ ؟ اچھا تو وہ ؟ وہ بھی نہیں تو پھر آپ ہی بتایئے کہ کون ؟۔ اوہ وہ — وہ چاچا ہے۔ جی ہاں چاچا۔ جی نہیں، میرا چاچا وہ کیوں ہونے لگا۔ وہ تو از راہ مذاق سبھی اسے اس نام سے پکارتے ہیں یہ تو خیریت جانیئے جو اسے ماموں نہیں کہتے ورنہ ان کی بھلی پوچھی۔ دیکھیئے، چلم کا دم کیا گھونٹ کے لگا رہا ہے۔ نہیں جی۔ گالیاں نہیں دے رہے، اس سے جشن مانگ رہے ہیں۔ پار سال جو اس کے یہاں بچہ ہوا تھا تو اس نے ہاتھ تنگ ہونے کا بہانہ کر کے جان چھڑائی تھی۔ اس بار اس کا پنڈ نہیں چھوٹنے کا بلکہ اس بار تو وہ خود کہتا ہے کہ ساتھی تاڑی کی کہتے ہیں میں انھیں چٹے دارو کی سالم دے گا اور کہتا ہے بھاگوان کی تو یہ اچھا ہے کہ محلے بھر میں بتاشے بٹیں۔ گانا بٹھانا جائے۔ بھاگوان۔ جی، اس کی گھروالی۔ بڑے زوروں کے نصیبے والا ہے صاحب۔ دو دن ہوئے کسی نے یونہی مذاق میں کہہ دیا کہ سنا چاچا، آپ کے شاید یہ تیسرا بچہ ہے کہ بس بگڑ کھڑا ہوا کہ ہٹیں ہٹیں تو نے یہ کموٹی بات منہ سے کیوں نکالی۔ دو تو پہلے کے ہیں سو اور تیرا خیال ہے چاچا اتنا گیا گزرا ہے کہ چار برس میں صرف تین بچے پیدا کرے گا۔ آپ ہنس رہے ہیں۔ لیکن جناب وہ تو یہ سب کہتے ہوئے کبھی نہیں ہنستا۔ بڑھیا نے۔ بڑھیا جی اس کی گھروالی۔ بڑی زرخیز عورت ہے صاحب وہ جو میں نے ابھی کہا تھا کہ اس کے پہلے کے دو بچے ہیں تو وہ جڑواں پیدا ہوئے تھے۔ پہلا گھروالا بھی ابھی اڈے پر مزدوری کرتا تھا۔ کیا بتاؤں صاحب۔ یہ تو اس کا ڈبل تھا۔ چاچا تو اس کے سامنے پدی پتنگ بھی ہیں۔ بیچارا لاری تلے دب کے نہ مرگیا ہوتا تو بڑھیا آج درجن بھر بچوں کا منہ دھوتی۔ جی ہاں سولہ آنے بلکہ وہ تو کہتا ہے، وہ عمر بھر بلونی کے ان بچوں کو یہ بتانے کا نہیں کہ ان کا باپ وہ نہیں کوئی دوسرا تھا۔ اس کے خیال میں بڑے ہو کر انھیں کو اس کی لاٹھی تھامنا ہے نہیں صاحب، بڑھیا اتنی گری ہوئی نہ تھی۔ ہوا یوں کہ پہلے گھر والے کی موت کے بعد جب اس کے لئے بھیک مانگنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تو چاچا نے بڑے جتنوں سے کہہ کہلوا کر اس پر چادر ڈال لی۔ کہتا تھا دن بھر اس کا چلانا اور ہاتھ پسارنا اس سے نہیں دیکھا جاتا۔ جو ہو، اب وہ اپنی گھروالی کو۔ جس کے ہاں اسکے چھٹا بچہ ہونے جا رہا ہے پیار سے بھاگوان کہتا ہے اور کہتا ہے کہ بھاگوان کی کرپا سے یا بھاگوان کے بھاگ سے اب ہاتھ پاؤں بھی خوب چلنے لگے ہیں۔ چار برس پہلے بالکل مست ملنگ تھا صاحب۔ دین دنیا کی ہوش نہ تھی۔ جہاں دن ہوتا دن گذرتا، رات ہوتی رات کٹ جاتی۔ ایک بار جو کرتہ پہنتا تو جب تک تار تار نہ ہو جاتا، جسم سے الگ نہ ہو پاتا۔ پسینے کی اور میل کی گندگی سے کپڑوں میں جوئیں پڑ جاتیں۔ لیکن اب اسے دیکھ رہے ہیں نا۔ کیسا لکر بنا بیٹھا ہے۔ اب گھروالی ہر ہفتے کپڑے پھٹک دیتی ہے۔ کہیں سے ادھڑ پھٹ جائیں تو پیوند لگ جاتے ہیں۔ آمدنی! ہاں آپ نے پتے کی بات پوچھی۔ یہی ڈیڑھ دو روپیہ اور کیا۔ میں تو صاحب سخت حیران ہوں کہ پورے کنبے کا خرچ چلتا کیونکر ہے۔ میری طرف دیکھیے تنخواہ کے علاوہ روگا کر مہینہ میں ساٹھ پینسٹھ سے کچھ اوپر ہی بنا لیتا ہوں لیکن جانے کون سی بلوں میں جا گھستے ہیں۔ میرے بچے دیکھیے آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ وہ کسی محرر کے بچے ہیں یا اودبلاؤ کی اولاد۔ اور دیکھیے میں اگر اس خیال سے کہ کھاؤں گا نہیں تو کماؤں گا کیسے، کچھ نسی پانی زہر مار کر لیتا ہوں تو ان کی ترستی ہوئی نظریں کھایا پیا نہیں لگنے دیتیں — لیجیے۔ بتایئے۔ اب تو آپ نے اپنے کانوں سے سن لیا نا! ذرا ان کی اوقات دیکھیے اور اس پر یہ معرفت کی باتیں۔ پاجی کس شان سے اگل رہے ہیں کہ دس ناخن کی کمائی میں ہی برکت ہے۔ وہ اس کونے میں دیکھ رہے ہیں نا آپ — وہ جو ٹیڑھا سا منہ کیے بتیسی دکھا رہا ہے۔ اجی وہ، بالکل میری انگلی کی سیدھ میں۔ یہ سب اسی کو سنایا جا رہا ہے پورے اڈے میں صاحب، سچ پوچھیے تو وہی ایک دم خم کا آدمی ہے آپ کا چھڑی چھاتا چھوٹ جائے یا بیگ بستر۔ یوں منٹوں میں ٹھکانے لگا آئے گا کہ کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ مزدوری پر اسے اتنا بھروسہ نہیں جتنا اٹھائی گیری پر۔ نا دیسے دیکھیے میں مذاق نہیں کر رہا۔ آخر سب کمائیاں ہی تو دس ناخن کی ہوتی ہیں۔ موٹے موٹے پٹوں والے بنے ٹھنے بھی تو دس ناخنوں سے ہی ہماری قبریں کھودتے ہیں نا۔ ذرا سوچیے، یہاں کمائی کا معاوضہ کمائی کے مطابق ملتا ہے ؟ وہی آپ والی بات۔ لیکن ذرا ان کمبختوں کی طرف دیکھیے۔ سر سے پاؤں تک چوتے ہوئے پسینے۔ میل اور غلاظت سے چکٹ چیتھڑے، سڑے بسے چہرے اوپر اور اندر دونوں طرف سے خالی پیٹ اور اس پر بھی دس ناخن کی اس قسم کی کمائی کی رہائی! اجی! کیا یہ حماقت نہیں کہ زندگی بھر تو اپنے دس ناخنوں کی طرف دیکھ دیکھ کر ایڑیاں رگڑتے رہو اور اس کے بعد۔ گالی کے لئے مجھے معاف کیجیے گا۔ اس کے بعد کس حرامزادے نے کچھ دیکھا ہے۔ ارے ارے، ذرا ادھر سرک آیئے۔ مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔ یہ دیکھیے ہمارے پیروں تلے کتنے کیڑے کچل گئے ہیں۔ جی ہاں وہ پیپل کی جڑوں میں دھان کے دانے دیکھ رہے ہیں نا آپ، صبح سویرے منہ اندھیرے ایک عورت یہاں جل چڑھانے آتی ہے۔ اور ساتھ تھوڑا دھان چھوڑ جاتی ہے یہ کیڑے دن بھر دھان کے ان دانوں کو اپنے بلوں میں ہٹورنے کی کوشش کرتے ہوئے ہمارے آپ کے پاؤں تلے کچلے جاتے ہیں۔ ارے نہیں صاحب، ان کے کچلے جانے پر ایسی ہائے توبہ مچانے کی ضرورت نہیں۔ اس قسم کی معمولی باتیں تو ہماری زندگی کا روزمرہ ہیں۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اگر ہم۔ کیا کہا۔ چھوٹی باتیں نہیں ؟ خیر جی چھوٹی ہوں، یا بڑی ایسی باتیں تو روز ہوں گی۔ انھیں چھوڑیئے۔ آپ ادھر دیکھیے، دیکھیے، مردود کیا کہہ رہا ہے واہ واہ، کیا کہنے ہیں اس فلسفہ دانی کے کہ اگر وہ عورت دھان کے دانے یہاں پیپل کی جڑوں میں چھوڑنے کے بجائے کسی بھوکے بھکاری کے پیٹ میں چھوڑنے کو دے دے تو زیادہ پن ملے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے نا کہ ساون کے اندھے کو ہریالی ہی ہریالی سوجھتی ہے، ٹھیک وہی بات کی ہے اس بقراط نے۔ اب یہ حاتم طائی کا پوتا کیا جانے کہ پیپل کے پوتر پیڑ کی جڑوں میں جل چڑھانے اور کیڑوں کے لئے دھان چھوڑنے سے اس عورت کا کیا مقصد ہے ؟ وہ اس مقصد کے لئے کیڑوں کو پالتی ہے کہ اس کے یہاں بھی ایک عدد کیڑا۔ میرا مطلب ہے۔ لیکن یہ آپ ایکدم گم سم سے کیوں ہو گئے ہیں ؟ کسی لیکھک کا دل تو ایسا ہلکا نہیں ہونا چاہیئے جناب اور جناب یہ کیڑے تو یونہی رینگتے رینگتے پیدا ہوتے ہیں۔ رینگتے رینگتے جیتے ہیں اور رینگتے رینگتے مر جاتے ہیں۔ آج بیس مریں گے تو کل اکیس پیدا ہو جائینگے اب اگر کوئی ان کے جینے مرنے پر سوچنے بیٹھ جائے تو بتایئے کیا کہا۔ کچھ نہیں کہا! ٹھیک ہے کچھ نہ کہیئے لیکن یوں منہ بھی تو نہ لٹکایئے۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اور ہاں کہیں آپ تھک تو نہیں گئے۔ ؟ چلیے چنگی خانے میں چلیے یہ سب تو یونہی چلے گا۔



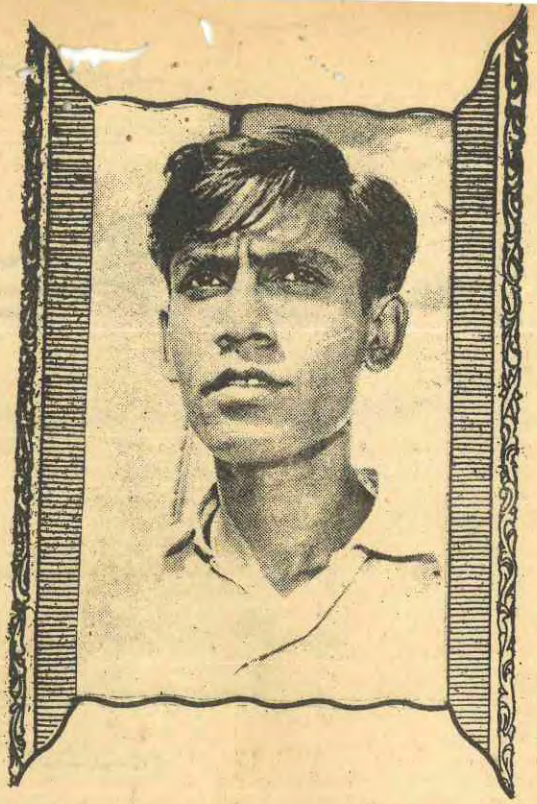




سلام مچھلی شہری

چلو خرید لو!

تمہاری قوتِ زر پھول جیت سکتی ہے
تمہاری قوتِ زر چاند جیت سکتی ہے
تمہاری قوتِ زر حُسن جیت سکتی ہے
مگر تم آگ سے ڈرتے ہو
اور آگ تمہیں
وہیں ملے گی جہاں پھول مسکراتا ہے
حسین چاند دمکتا ہے
حسن گاتا ہے
تمہی نے آگ کے سکوں کو پھول سمجھا ہے
تمہی نظامِ زر و سیم کا نظارہ کرو
تصورِ گل و لالہ بدل دیا ہے اگر
تو یہ تقاضۂ حالات بھی گوارہ کرو
— گلاب ایک علامت ہے رنگ و نکہت کی
حسین چاند نشانی ہے خیر و برکت کی
ہر ایک حسن ہے تصویرِ حسنِ فطرت کی
مگر تمہیں یہ گماں ہے کہ تم خریدو گے!
حسین پھول
حسین چاند
اور حسین رُخسار
چلو خرید لو لیکن یہ بات یاد رہے
کہ تم کو آگ سے نفرت ہے
اور انگارے
تمہاری قوتِ زر کو تباہ کر دیں گے۔
گلوں میں آگ ہے
تاروں میں آگ
حسن میں آگ
چلو یہ ٹھیک ہے، سب سے امیر لوگ ہو تم
تمام دہر کی رعنائیاں تمہاری ہیں
چلو یہ ٹھیک ہے، اس دورِ برق و آہن میں
جواہرات کی سب منڈیاں تمہاری ہیں
مگر یہ برق
یہ آہن
یہ آگ
اور یہ دھواں
تمہاری اپنی تباہی کے بن رہے ہیں نشاں!
— ابھی ابھی مرے بچّے کے نرم و نازک ہونٹ
سحر کی نرم شعاعوں میں مسکرائے ہیں...
ابھی ابھی مرے آنگن کے خشک بیلے میں
بڑی امنگ سے شاداب پھول آئے ہیں
خرید لو مرے بچّے کے ہونٹ کی یہ ہنسی
خرید لو مرے آنگن کے یہ شگفتہ پھول
خرید پاؤ تو بے شک خرید لو لیکن
تمہاری قوتِ زر کیا ہے، ہم بھی دیکھیں گے
تمہاری حدِ نظر کیا ہے، ہم بھی دیکھیں گے





واحد بشیر

لوگ کہتے ہیں کسی ماہ جبیں کو میں نے
نوجوانی کے سبک لمحوں میں
لازماً دل میں بسایا ہوگا
جاں سے بڑھ کر اسے چاہا ہوگا
اور حالات کے بے رحم تھپیڑوں نے اسے
چھین کر مجھ سے - مری روح میں بھر دی ہوگی
دردِ دوری کی اک آگ
آگ وہ جس میں جلا کرتا ہے
رات دن ذہن مرا
اور میں قوتِ برداشت سے باہر پاکر
ہجر کی آگ کے یہ تیز لپکتے شعلے
کبھی گیتوں کبھی نغموں کبھی نوحوں میں سمو دیتا ہوں !
ورنہ گیتوں میں مرے درد کہاں سے آیا
کس نے بخشا مرے نغموں کو فسونِ تاثیر
دین ہے کس کی مرے نوحوں کا یہ سوز و گداز
کس نے افکارِ پراگندہ کو کرکے مربوط
ان کو دے دی ہے زباں ؟

کیسے سمجھاؤں انھیں !
کیسے بتلاؤں انھیں !
نوعِ انسانی کی ہے ایک جمعیت ایسی
زیست ہے جس کے لئے ایک عذاب
ہاں وہی زیست جو اوروں کے لئے
رنگ ہے حسن ہے اور نغمہ ہے -
اس فلاکت زدہ مخلوق کا ہے مقصدِ زیست
پارۂ نانِ جویں - بھوک مٹانے کے لئے
پارچہ - کوئی سہی - جسم چھپانے کے لئے
اور یہ پارچہ و نانِ جویں
ایک بے رحم حسینہ کی طرح
دور سے جلوہ دکھا کر انھیں ترساتے ہیں -
یہ جماعت ہے مری - !

کیسے سمجھاؤں انھیں
حوصلہ مجھ میں کہاں چاہ کا ارماں کرتا
اتنی فرصت تھی کہاں ناز اٹھاتا پھرتا
ہاں مرے ساتھ پلیں اور بڑھیں
لڑکیاں یوں تو کئی
جن میں تھیں بعض حسیں
اس سے پہلے کہ مجھے ہوتی کسی سے الفت
اس سے پہلے کہ نکھرتا کسی لڑکی کا شباب
اس سے پہلے کہ سمجھتیں وہ تقاضے دل کے
باپ کی جیبوں پہ بن جاتی تھیں اک بارِ گراں -
اور وہ ڈھونڈنے لگتے تھے کوئی مرد - کہ جو
زیست کا بوجھ اٹھانے میں ذرا ہاتھ بٹائے
نام پر شادی کے بیٹی کو اٹھا کر لے جائے
گھر میں اک فرد کی ہو جائے کمی
ایک روٹی تو بچے —
اور ممکن ہو اگر !
مردِ خوش حال ملے
کچھ سہارا ہی بنے
شکل کی عمر کی کچھ قید نہیں -
لڑکیاں تھیں جو حسیں
ان کے دام اچھے اٹھے
یعنی بر خوب ملے
باپ کے بھاگ کھلے !
میں نے دیکھا ہے یہی - دیکھتا رہتا ہوں یہی -

دیکھتا رہتا ہوں میں شہر کے بازاروں میں
لڑکیاں ایسی حسیں
جنکو چھوتے ہوئے تھرائے نظر
(میرا بس ہو تو سجا دوں جنھیں شوکیسوں میں)
اجنبی دیسیوں کی خوشبو میں بسی
سولہ سنگھار کئے
اپنے کچھ چاہنے والوں کو جلو میں لیکر
کچھ خریداری میں مصروف تو کچھ محوِ خرام -
میں حسیں خوابوں کی دنیا میں چلا جاتا ہوں
میں خیالات کے صحراؤں میں کھو جاتا ہوں
میری گردن پہ حسیں باہنیں اتر آتی ہیں
میرے شانوں پہ بکھرتی ہوئی زلفوں کی مہک
تازہ کرتی ہے مشامِ جاں کو
میرے احساس میں ہوتا ہے تلاطم برپا
میرے لب یورشِ جذبات سے تھرّاتے ہیں
مجھ کو رہتا ہے فقط اک احساس !
ایک احساس کہ ہے جس کی سزا
باغِ فردوس سے آدم کا نکالا جانا
اور جو ہے جرم بروئے اخلاق —
جاگ اٹھتی ہے مری گرسنگیِ اعصاب
اور ہوس کے عفریت

میری آنکھوں میں سمٹ آتے ہیں
توڑ دیتی ہے کسی دخترِ تہذیب کی چشمِ نفرت
میرے خوابوں کا فسوں ۔

سوچتا ہوں کہ مرا جسم بھی ہے کتنا ذلیل
جس کو آداب کا اخلاق کا کچھ پاس نہیں ،
عزتِ نفس کا احساس نہیں ۔
پھر یہ آتا ہے خیال
یہ کشش اور یہ تناؤ
جسمِ انسان کی فطرت کا تقاضہ ہی تو ہیں
کیا میں انسان نہیں ؟
ذہن دیتا ہے جواب ۔
ہو تو انسان مگر مفلس و قلاش ہو تم
تم ہو قرنوں سے غلام
بھوک کے ۔ جہل کے ۔ افلاس کے دیرینہ اسیر
اور ہیں سیم و طلا ،
آج دنیا کے خدا
دل میں رکھتے ہو اگر عیش و سکوں کی خواہش
پہلے زر دار بنو !
خود سے کرتا ہوں سوال
کیا میں زر دار بنوں ؟
اس پہ کہتا ہے ضمیر
یہ بتاؤ کہ حصولِ زر سے
کتنے افراد کی تقدیر بدل ڈالو گے !
کتنے جسموں ۔ کتنی روحوں کو مسل ڈالو گے !
بھوکے جسموں ۔ بھوکی آنکھوں کا یہ انبوہِ کثیر
کیا یہ رہے گا یوں ہی ؟
یا بھلا دو گے اسے !

میں یہ کہتا ہوں بھلا ان کو بھلا دوں کیونکر
یہ مرے بھائی ہیں ۔ ماں باپ مرے اور احباب
میں انھیں میں تو پلا اور بڑھا
ٹوٹ کر ان سے بھلا اور جاؤں گا کہاں ؟

کیسے سمجھاؤں انھیں !
کہ یہی ہے وہ شعور
جو کہ افکارِ پراگندہ کو کر کے مربوط
ان کو دیتا ہے زباں ۔
کہ یہی ہے وہ شعور
میری تخئیل کا اور فن کا سہارا پا کر
میرے گیتوں ۔ مرے نغموں میں جو ڈھل جاتا ہے
کاش یہ جان سکیں !
میرے نغمے ۔ میرے نوحے میرے گیت
ہیں فقط جہدِ بقا
اس کے سوا کچھ بھی نہیں ۔

سیّد احتشام حسین

غزل

گر تقاضائے جنوں خام نہ ہو
کاوشِ عقل بھی بدنام نہ ہو

عشق کا بھی تو بھرم رکھنا ہے
حسن کا بندۂ بے دام نہ ہو

کتنے دھبے ہیں ریاکاری کے
شیخ کا جامۂ احرام نہ ہو

ہوں گرفتارِ بہارِ گلشن
یہ بھی صیاد ہی کا دام نہ ہو

اک کرن چھوتی ہے دل کو اکثر
خلشِ دستکِ الہام نہیں

کفر و اسلام پہ لڑنے والو
یہ فقط دوریِ یک گام نہ ہو

کیا خبر ہو کہ نہ ہو وعدہ وفا
سرخوشِ لذتِ پیغام نہ ہو

جی نہ کھو جلد بہار آئے گی
صبح کب ہوگی اگر شام نہ ہو

چھیڑ تو دوں میں کہانی دل کی
محفلِ دوست میں کہرام نہ ہو

مسلم ضیائی

ٹیپو سلطان

ہماری قومی تاریخ میں اٹھارہویں صدی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس صدی میں بڑے ہنگامہ خیز واقعات پیش آئے۔ اسی صدی میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد خانہ جنگیوں کے باعث مغل سلطنت کا شیرازہ بکھرا۔ اسی صدی میں مرہٹوں کا عروج و زوال ہوا اور اسی صدی میں مغربی اقوام کے درمیان بڑی شدید کشمکش کے بعد انگریزوں کو تقریباً ڈیڑھ سو سال کے لئے برصغیر پر سیاسی اور معاشی تسلط حاصل ہوگیا۔

لیکن یہ تسلط آسانی سے نہیں ہوا۔ اس کے لئے ہر قسم کی فریب کاریوں سے کام لیا گیا اور جدید ترین ایجادوں سے بھی۔ سازشوں کے باوجود قدم قدم پر محبان وطن بہادروں نے بیرونی دشمنوں کا جم کر مقابلہ کیا۔ ان بہادروں میں عوام بھی تھے اور حکمران بھی۔ علماء بھی تھے۔ اور جہلا بھی۔ لیکن ملک میں کوئی عوامی تحریک نہ ہونے اور خود غرض حکمرانوں کے باعث دیسی قوتیں ایک دوسرے سے لڑ لڑ کر کمزور ہوگئیں۔ پھر بھی اگر یہ دیسی حکمران حیدر علی اور اس کے بیٹے ٹیپو سلطان کے ۔۔۔ جرات ہمت، بیش بینی تدبر اور وسعت نظری سے کام لیتے تو ہمیں نہ تو ڈیڑھ سو سال غلامی کا شکار ہونا پڑتا اور نہ اس معاشی تباہی کا سامنا کرنا پڑتا جس نے ہمارے جسمانی اور ذہنی قویٰ کو اس قدر مضمحل اور مفلوج کر دیا کہ آزادی حاصل ہونے کے بعد بھی ہم اب تک سنبھل نہیں سکے ہیں۔ احساس کمتری کا شکار ہیں اور ابھی تک ہم میں قومی غیرت، حمیت اور خودداری نہیں پیدا ہو سکی ہے اور اپنے قدموں پر خود کھڑے ہونے کے بجائے دوسروں کی طرف ترحم انگیز نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ برصغیر کو غلامی سے بچانے اور آزادی کا جھنڈا بلند رکھنے میں شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک متعدد ایسے حکمران اور ان کے ساتھ برصغیر کے لاکھوں عوام تھے لیکن ان میں سب سے ممتاز کردار حیدر علی اور اس سے بھی زیادہ ٹیپو سلطان کا نظر آتا ہے جس کے دل میں سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے آزادی کی لگن تھی اور جس نے بچپن سے لے کر ۴ مئی ۱۷۹۹ء تک جب وہ انگریزوں کی فریب کاریوں کا شکار ہو کر شہید ہوا، ہمیشہ آزادی کے خلاف قوتوں کا بڑی جرات اور دانائی سے مقابلہ کیا اور کمپنی کی فوجوں کو اتنی اور ایسی شکستیں دیں، جیسی اور جتنی برصغیر کے کسی اور حکمران کے ہاتھوں نہیں ہوئی تھیں۔

آزادی انسان کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا شعوری حق ہوتا ہے اور آزاد انسانوں کی زندگی ہی حقیقی معنی میں زندگی ہوتی ہے۔ غلاموں کی زندگی اور وحوش و بہائم کی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ انسان کو کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے اور سو رہنے سے بھی زیادہ جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے، وہ آزادی اور صرف آزادی ہے۔ وہ آزادی تحریر چاہتا ہے، آزادی تقریر چاہتا ہے، اور آزادی خیال چاہتا ہے غلام اپنی زندگی ہی میں مر جاتے ہیں لیکن آزاد مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔

تمدنی زندگی کے ساتھ ساتھ حقوق اور فرائض بھی متعین ہوتے ہیں۔ یہ فرائض معاشرے کی طرف سے، دوسرے انسانوں کی طرف سے افراد پر عاید ہوتے ہیں۔ قانون سب کا قانون اور سب کے لئے ہوتا ہے۔ افراد معاشرے کو کچھ دیتے اور اس سے کچھ پاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی حکومت یا معاشرہ فرائض ہی فرائض مقرر کرے اور انسان کو اس کے بنیادی حقوق سے محروم کر دے تو ظاہر ہے اس کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ زندگی میں رس نہیں رہے گا کیونکہ ایسی زندگی جمود کی طرف لے جاتی ہے۔ موت کی طرف لے جاتی ہے۔

ٹیپو سلطان نے باوجود ایک بادشاہ ہونے کے اس رمز کو سمجھ لیا تھا۔ وہ غلامی اور بزدلی کی زندگی پسند نہ کرتا تھا چنانچہ اس کا قول تھا کہ گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک روزہ زندگی بہتر ہے لیکن صرف انفرادی آزادی ایک بے معنی سی چیز ہے۔ اس کے لئے پورے معاشرے یا پورے ملک کی آزادی ضروری ہے ٹیپو سلطان کی تعلیم اگرچہ دیسی حکمرانوں اور بدیسی حملہ آوروں سے جنگوں کے باعث، واجبی ہی تھی پھر بھی اپنے دور کے دوسرے حکمرانوں کے برخلاف وہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتا تھا۔ اس نے اپنے دور کے حالات کا ایک بہادر اور باشعور حکمران کی حیثیت سے مطالعہ کیا۔ اپنے باپ حیدر علی کی بہادرانہ زندگی اور اس کے تجربات سے سبق حاصل کئے اور اس کی وفات سے پہلے ہی پندرہ سولہ سال کی عمر میں نہایت جوش و خروش سے ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے لواحقین کی فوجوں کے مقابلہ میں صف آرا ہو گیا جو بنگال میں پلاسی کی لڑائی کے بعد آہستہ آہستہ دکن کے معاملات میں بھی دخیل ہوتے جا رہے تھے۔ کرناٹک کے محمد علی خان، حیدر آباد کے نظام علی خاں اور مرہٹوں

کے پیشواؤں سے سازباز اور جوڑ توڑ میں مصروف تھے اس وقت انھیں اپنے خلاف سب سے بڑی قوت سلطنت خداداد میسور نظر آرہی تھی۔ کیونکہ حیدر علی نے مغربی طرز پر فوجوں کو تربیت دے کر اور مغربی اسلحہ تیار کر کے نیز اپنی سلطنت کا انتظام بہتر بنا کر کمپنی کی فوجوں کو بار بار شکستیں دی تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ڈپلومیسی اور عیارانہ چالوں کے بارے میں اس دور کا ایک مورخ میر عبداللطیف شوستری مولف حدیقۃ العالم لکھتا ہے۔

"بنگال پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے دوسرے علاقوں پر قبضہ کے لئے مختلف مقامات پر اپنے جاسوس روانہ کئے اور اس کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جس علاقہ پر قبضہ کرنا چاہتے۔ اس کے رئیس کو نہایت عجز و انکساری سے خط لکھتے اور درخواست کرتے کہ ہمارے وکیل کو اپنے دارالسلطنت میں رہنے کی اجازت عنایت فرمائی جائے چونکہ یہاں کے مسلمان اور ہندو راجاؤں میں خوشامد طلبی عام ہے اور عریضوں میں بہت زیادہ ادب و تعظیم کا اظہار ہوتا تھا اس لئے یہ حکمران خوشامد سے متاثر ہو کر سوچتے کہ ایک انگریز کے آنے سے کیا ہوتا ہے وہ کیا کر سکتا ہے اور کس شمار میں آسکتا ہے۔

عریضہ کا جواب ملتے ہی انگریز اپنے ایک نہایت تجربہ کار شخص کو چین و فرنگ کے تحفوں کے ساتھ بھیج دیتے ہیں۔ رئیس کوتاہ نظری کے باعث خوشامدانہ فقروں کو سن کر اور پیش کش دیکھ کر پھولا نہیں سماتا اور اسے بڑی عزت بخشتا ہے۔

اب انگریزوں کا وکیل جگہ کے لئے درخواست کرتا زیادہ تر شہر کے باہر مکان لے کر اسے قلع کے مانند مستحکم کر لیتا اور وہاں حرب و لشکر رکھتا ہے کہ اگر رئیس اسکے قیام کو پسند نہ کرے تو باہر بھی نہ نکال سکے۔

اس کے بعد انگریزوں کا وکیل خوب روپیہ خرچ کرتا ہے تاکہ رعایا اس کی گرویدہ ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی اپنی حکومت کے افسر کو جو کلکتہ میں رہتا ہے حالات سے مطلع کرتا رہتا ہے۔ صاحب عزت لوگوں سے تعلقات بڑھاتا اور رئیس سے نہایت خاکساری سے نوکروں کے مانند پیش آتا ہر روز نیا عہد نامہ پیش کرتا اور اپنی جانب سے اطاعت گزاری اور کمپنی کی طرف سے سرکار کے دشمنوں کا قلع قمع کرنے کے وعدے کر کے اسے مطمئن کر دیتا ہے۔

اس طرح آخر کار اسے حسب مرضی عہد نامہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اس میں عموماً اس قسم کی تحریر ہوتی ہے کہ چونکہ کمپنی کے عہدے دار ہماری سرکار کے بہی خواہ ہیں اس لئے ہم بھی ان کے اقوال و افعال کو پسند کرنے اور ان کی اصلاح و صواب دید کے پابند ہیں۔

"یہ عہد نامہ ہوتے ہی" انگریز پوری طرح مسلط ہو جاتے ہیں کیونکہ ہر ریاست میں چند" بڑے لوگ" مدعی سلطنت ہوتے ہیں۔ بہت سے ملازم ایک دوسرے سے منافقت کرتے اور ایک دوسرے کو گرانے کی کوشش کرتے ہیں ریاست کے دو مدعیوں یا امیروں میں جھگڑا ہونے پر انگریزوں کا وکیل طاقتور کا ساتھ دیتا اور انگریز فوج کی مدد سے طرف ثانی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ طرف غالب کامیابی کے نشہ سے سرشار ہوتا ہے اور انگریز وکیل کے ایما سے انگریزی فوج کا خرچ اپنے ذمہ لے لیتا ہے اس طرح انگریز فوج ریاست میں رہنے لگتی ہے۔ وقت پر تنخواہ نہ ملنے پر ریاست کو اپنا کچھ علاقہ نذر کرنا پڑتا ہے اسی طرح جب کوئی رئیس مرتا ہے تو اقربا میں حصول سلطنت کے لئے کشمکش اور دوڑ دھوپ ہوتی ہے ان میں سے جو کبھی کمپنی کو سالانہ پیشکش دینے کا ذمہ کرتا ہے اسے گدی پر بیٹھایا جاتا ہے۔

پھر یہ لوگ حکومت پر پوری طرح قابض اور متصرف ہو جاتے ہیں لیکن بظاہر کسی قسم کی سختی و زبردستی کسی کے ساتھ نہیں کرتے اور کسی ملک پر جنگ و جدال کے ذریعہ قبضہ نہیں کرتے۔

ٹیپو سلطان اپنے باپ کی زندگی ہی میں یہ تمام باتیں دیکھ چکا تھا۔ اس لئے اس نے حیدر علی کے مانند طے کر لیا تھا کہ ان بیرونی غاصبوں کو برصغیر سے نکال کر ہی دم لوں گا چنانچہ ۱۷۸۴ء میں اس نے انگریزوں کو ایک شکست فاش دی اور اپنی سلطنت کے استحکام کی طرف متوجہ ہوا۔

سب سے پہلے اس نے اپنی فوجوں کی طرف توجہ دی کیونکہ ملک کے دفاع کے لئے فوجیں ریڑھ کی ہڈی کے مانند ہوتی ہیں۔ [illegible] بہت جلد میسوری فوج [illegible] دیسی حکمرانوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ منظم اور باقاعدہ بنا دیا ان کے لئے تلواریں بندوقیں اور دوسرے اسلحہ سرکاری کارخانوں میں بنوائے اور سواروں کے لئے نہ صرف اچھے اچھے گھوڑے منگوائے بلکہ اچھی نسلوں کی پرورش کا انتظام بھی کیا۔

اس نے فوج کے لئے اصول و ضوابط تیار کرائے عہدوں اور تنخواہوں کا تعین کیا اور پنشن بھی مقرر کی جس کا دوسری حکومتوں میں فقدان تھا۔ اس نے بری فوجوں کے ساتھ ساتھ بحری بیڑے کی طرف بھی توجہ دی کیونکہ اگرچہ اس نے کئی بار انگریزوں کو مدراس، برنور اور منگلور وغیرہ میں شکستیں دی تھیں لیکن ہر مرتبہ انھوں نے بھاگ کر سمندر میں پناہ لی، مکمل تباہی سے بچ گئے اور اپنی قوت کو از سر نو منظم کر کے مقابلہ میں آتے تھے۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے اس نے ایک بڑا بحری بیڑہ ترتیب دیا اور محکمہ بحر قائم کیا جس کا سب سے بڑا افسر "امیر یم" کہلاتا تھا۔ لیکن کسی ملک کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے صرف بری اور بحری فوجیں کافی نہیں ہوتیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ خود وہاں کے عوام بھی باشعور ہوں اور آزادی کے جذبہ سے سرشار۔ حکومت سے معاشی اور اخلاقی طور پر مطمئن ہوں اور اس کی آواز پر جمع ہو کر دشمن کا اس طرح مقابلہ کریں کہ دشمن کا منہ پھر جائے۔

چونکہ رعایا کو مطمئن رکھنے کے لئے ملک کی خوشحالی ضروری ہے۔ اور خوشحالی صنعت، زراعت اور تجارت کو فروغ دیئے بغیر حاصل نہیں ہوتی اس لئے ٹیپو سلطان نے ملکی اصلاحات پر خاص طور سے توجہ دی چنانچہ اس نے برصغیر میں سب سے پہلے زمینداری نظام ختم کر کے ملک کی کثیر ترین آبادی یعنی کسانوں کو زمینوں کا مالک بنا دیا۔ اور صرف یہی نہیں کیا بلکہ کسانوں کو تقاوی اور مالگزاری وغیرہ سے متعلق نہ صرف بہت سی سہولتیں دیں بلکہ پیداوار کو فروخت کرنے کے لئے ایسے انتظامات کئے جن سے کسانوں کو زیادہ سے زیادہ فائدے پہنچ سکتے تھے۔

لیکن کسی ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لئے صرف زراعت ہی کافی نہیں ہوتی اس لئے ٹیپو سلطان نے بینک قائم کئے اور امداد باہمی کی انجمنیں بنائیں۔ بڑی بڑی تجارتوں اور صنعتوں کو قومی بنایا۔ میسور اور اس کے علاوہ دوسرے علاقوں یہاں تک کہ بیرون ہند میں انگریزی اور فرانسیسی فیکٹریوں کے مانند کوٹھیاں قائم کیں جہاں حکومت میسور کی طرف سے مناسب عملہ متعین رہتا تھا ان لوگوں کے ذمہ درآمد و برآمد کا انتظام تھا۔ اور ان کے پاس نہایت باقاعدگی سے حساب رہتا تھا۔ سال میں ایک بار ان تمام حسابات کی تنقیح کی جاتی تھی اور جو لوگ اس کاروبار میں منافع پر سرمایہ لگاتے تھے انھیں منافع میں ان کی لگائی ہوئی رقموں کے تناسب سے منافع دیا جاتا تھا۔

چونکہ کمپنی کے تاجر اور خود کمپنی کی حکومت کی طرف سے اکثر اوقات شرارتیں ہوتی رہتی تھیں اور حکومت میسور کے تجارتی اور معاشی معاملات میں مداخلت کی جاتی تھی اس لئے ٹیپو سلطان نے برصغیر میں پہلی بار انگریزی تجارت اور انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا تاکہ دیسی صنعت اور تجارت کو فروغ ہو۔

سلطان کے ان انتظامات اور کوششوں کے باعث ملک میں خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ ہوا چنانچہ لکانن اور ٹلل وغیرہ کے قلم انگریز ہونے کے باوجود میسور میں دولت کی فراوانی، رعایا کے اطمینان امن، اور خوش حالی کے بارے میں لکھنے سے نہیں جھجکتے۔

لیکن کسی ملک کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے صرف اس کا دولت مند ہونا ہی کافی نہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس ملک کے باشندوں کے دماغ علم و حکمت کی روشنی سے منور ہوں اور ان کے دلوں میں آزادی کا شعور جاگتا رہے چنانچہ اسی خیال کے مدنظر آپ حیرت کریں گے کہ ٹیپو سلطان نے اب سے کوئی پونے دوسو سال پہلے اپنے علاقہ میں تعلیم کو جبری، لازمی اور مفت قرار دیا تھا۔ لیکن مفت کے یہی معنی نہیں کہ پڑھانے کا معاوضہ نہیں لیا جاتا تھا بلکہ بچوں کے لئے کتابیں، تختیاں اور قلم دوات وغیرہ

بھی حکومت ہی کی طرف سے مہیا کئے جاتے تھے۔ ان انتظامات کے باعث نہ صرف رعایا میں طمینان اور خوشحالی پھیلی بلکہ خوش انتظامی اور خوش تدبیری کے باعث سلطنت کا خزانہ بھی معمور ہوگیا جو آزادی برقرار رکھنے کے لئے اتنا ہی ضروری ہوتا ہے جتنی طاقتور فوجیں اور کارفرما دماغ کیونکہ خزانہ خالی ہو تو کوئی حکمران خواہ وہ کتنا ہی عالی دماغ کیوں نہ ہو اپنی حکومت کو تباہی سے نہیں بچا سکتا۔ حکومت کی مشنری دولت کے تیل سے چلتی ہے۔

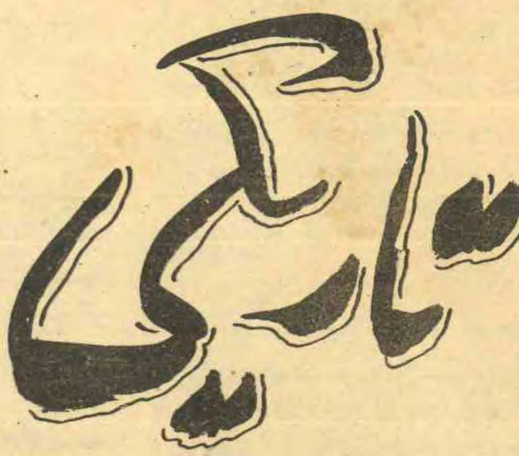
چونکہ ٹیپو سلطان نے برصغیر کے دیگر حکمرانوں کے خلاف برطانوی کمپنی کی جوع الارض کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اور وہ یہ جانتا تھا کہ سمندر پار سے آئی ہوئی یہ قوم بنگال کے بعد دکن پر اپنا جال پھینک رہی ہے جس کے لئے اس نے بحر ہند کے مشرقی اور مغربی ساحلوں پر کوٹھیاں بنائیں اور فوجیں تیار رکھی ہیں اس لئے اس نے نہ صرف ہندستان کے جملہ دیسی حکمرانوں مثلاً نظام، پیشوا اور بادشاہ دہلی کو، متحد ہو کر مشترک دشمن کو نکال باہر کرنے کے لئے لکھا بلکہ چھوٹے چھوٹے سرداروں اور پیران خانقاہ کو بھی لیکن بدقسمتی سے یہ زمانہ بہت زیادہ انتشار اور افراتفری کا تھا اور ہر چیز "نوابی" کی دھن میں تھا اس لئے اسے "ہندوستان گیر" اتحاد کی کوششوں میں ناکامی ہوئی۔ تب اس نے افغانستان، ایران، ترکی، مسقط اور فرانس سے تجارتی اور فوجی اتحاد کرنا چاہا اور ان ملکوں میں اپنے سفیر بھیجے لیکن یہ سلطنتیں بھی اس وقت اندرونی انتشار اور بد نظمی کا شکار تھیں جس کے باعث سلطان کی یہ آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ نظام اور پیشوا کی کم نظری اور درباری سازشوں اور خود غرضیوں نیز سلطنت میسور کی بڑھتی ہوئی قوت سے خوف اور حسد کے باعث ان لوگوں نے نہ صرف ٹیپو سلطان کے ساتھ متحد نہ ہو کر مشترک دشمنوں یعنی انگریزوں اور فرانسیسیوں کو نکالنے کی کوشش نہ کی بلکہ بیرونی غاصبوں سے اتحاد کر کے غداروں کی مدد سے سلطان کی شہادت اور برصغیر کی ڈیڑھ سو سالہ غلامی کا باعث ہوئے۔

سلطان، میدان جنگ میں لڑتا ہوا شہید ہوا اس نے آزادی کی شمع کے پروانوں کے مانند شمع آزادی پر قربان ہو کر جان دی لیکن اپنے وطن کو غدار حکمرانوں کے مانند غیروں کے حوالے نہیں کیا۔ اس کی زندگی اور موت دونوں میں ہمارے لئے ایک بڑا سبق ہے۔ وہ مرا نہیں اب بھی زندہ ہے۔ تاریخ کے ورقوں میں بھی اور عوام کے دلوں میں بھی۔

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جان دیگر است



تاریکی



عادل رشید



عدالت سے جب اسے اقدامِ خودکشی کے جرم میں تین ماہ قید بامشقت کی سزا کا حکم سنایا گیا تو وہ غصے اور رنج کے باعث اپنے ہونٹ کاٹنے لگا اس کے نتھنے پھول رہے تھے اور اس کی آنکھوں سے نفرت اور حقارت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اس نے طنز میں ڈوبی ہوئی ایک بھرپور نظر مجسٹریٹ پر ڈالی۔ وہ بڑبڑایا۔

"روٹی نہیں دے سکتے تو سزا دیتے ہیں۔ کیا قانون ہے اور کیا انصاف ہے یہ کہ بھوک کی اذیت سے تڑپ تڑپ کر مرنے والے جب یکدم سے مرجانا چاہیں تو انہیں اس بات سزا دی جائے کہ تم تڑپ تڑپ کر مرنے کی بجائے یکدم سے کیوں مر گئے خودکشی کیوں کرنے چلے تھے تم۔ تڑپ تڑپ کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر تم مرتے تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔"

اس نے مجسٹریٹ کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"کہیے حضور تو قرض خواہوں کو آپ کے پاس بھیجدوں اور اپنے ان دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو بھی جو دو مہینے سے فیس نہ ہونے کی وجہ سے اسکول سے نکال باہر کر دیے گئے ہیں۔ میری اس کمزور اور بیمار بیوی کو بھی آپ سنبھال لیجیے حضور جو خیراتی ہسپتال کی ناقص اور بکواس قسم کی دواؤں کو پھانک پھانک کر اور زیادہ کمزور اور بیمار ہو گئی ہے۔"

"آرڈر ۔۔ آرڈر ۔۔"

مجسٹریٹ نے اپنی میز کے کونے پر کئی ضربیں لگائیں۔

یور ورشپ نے بڑی شان بے نیازی کے ساتھ فرمایا۔

"کیوں نہ توہین عدالت کے جرم میں تم پر ایک نیا مقدمہ اور چلایا جائے۔"

اور پولیس انسپکٹر نے آگے بڑھ کر مجرم، اس اقدام خودکشی کے سزا یافتہ شخص کا منہ دبا دیا وہ بھنچی ہوئی آواز میں بولا۔

"یہ عدالت ہے عدالت اور ۔۔ تم عدالت کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی توہین کر رہے ہو۔"

عدالت کے کمرے میں اس خودکشی کرنے والے کی بیوی بھی موجود تھی اور بچے بھی وہ سب کے سب دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

"آرڈر ۔۔ آرڈر ۔۔" مجسٹریٹ نے اپنی میز کے کونے پر کئی ضربیں پھر لگائیں اور ان دہاڑیں مار مار کر رونے والوں کو کمرے سے باہر نکال دیا گیا۔ اگلے مقدمے کی کارروائی عدالت میں شروع ہو چکی تھی۔

اس خودکشی کی کوشش کرنے والے کا نام کامتا پرشاد تھا۔ اس کے پاس ایم۔ اے کی ڈگری تھی۔ لیکن اس کی یہ ایم۔ اے کی ڈگری بھی جسے اس نے رات دن کی لگاتار کوششوں کے بعد حاصل کیا تھا اسے اس سماج اور اس حکومت میں روٹی نہ دلا سکی۔ اس ڈگری نے اسے اتنا بھی نہ دلایا تھا کہ ان کے حصول پر خرچ ہوا تھا۔ اس ڈگری کی خاطر اس کے باپ نے اپنی جائیداد بیچ دی تھی اور مضافات کے چار مکانوں میں سے ان کے تین مکان یکے بعد دیگرے بک گئے تھے۔ اور جب اس کے بیٹے کامتا پرشاد کو ایم۔ اے کی یہ ڈگری ملی تھی کہیں جا کر۔

کامتا پرشاد ادھر ادھر پرائیویٹ فرموں میں سو سوا سو اور ڈیڑھ سو کی نوکریاں کرتا رہا اور اپنی بیوی بچوں کا پیٹ کسی نہ کسی طرح پالتا رہا۔ پھر اس کا باپ مر گیا اور اس کی آخری ملازمت بھی فرم کے دیوالیہ ہو جانے کے بعد ختم ہو گئی۔ وہ مسلسل ملازمتوں کی کوشش کرتا رہا اور اسے ملازمت کسی جگہ بھی نہ ملی۔ اس کے گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی۔

ہمارے ملک میں عرب دیس کا ایک بادشاہ بحیثیت مہمان آیا ہوا تھا۔ اور یہ ہمارے اس دیس میں حاتم دوراں بنا ہوا سخاوت پہ سخاوت کرتا جا رہا تھا حالانکہ اس کے اپنے ملک میں عوام بھوکے مر رہے تھے۔ اس کی کار سے ایک بڑھیا کی مرغی دب کر مر گئی۔ اور اس حاتم طائی نے اس غریب بڑھیا کو اس ایک مرغی کی قیمت یکدم سے ایک ہزار روپے دے ڈالی۔

اور جب ہمارے دیس کے بھوکوں نے یہ اتنی بڑی خبر سنی تو وہ عش عش کر اٹھے۔ غضب خدا کا ایک مرغی کی قیمت ایک ہزار روپے ہے بہتوں کے منہ میں پانی بھر آیا اور بہتوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اس بادشاہ کی موٹر سے کچل کر مر جائیں گے جب مرغی کے مر جانے پر اس کی مالکن کو ایک ہزار کی بخشش کی گئی ہے تو ایک انسان کے مر جانے پر ان کے وارثوں کو یہ بادشاہ ضرور کم از کم لاکھ، پچاس ہزار دے ڈالے گا۔

اور یہ سوچ کر کہ ان کے مر جانے سے ان کے متعلقین کو یکدم سے اتنے بہت سے روپے مل جائیں گے بہت سے اپنی اپنی جان دینے پر تیار ہو گئے۔

اور انہیں میں سے ایک کامتا پرشاد بھی تھا۔

عرب کے اس حاتم دوراں کی سواری کا جلوس جا رہا تھا کہ وہ یکدم سے دوڑ کر بھیڑ سے باہر نکلا اور ابھی وہ شہنشاہ کی موٹر کے نیچے آ کر مرنا ہی چاہتا تھا کہ پولیس نے اسے مرنے سے پہلے ہی بچا لیا وہ پکڑا گیا تھا۔ اور بادشاہ کی موٹر کے نیچے مر جانے کی اس کی آرزو ناکام ہو گئی تھی۔

اور پھر اس پر اقدام خودکشی کے جرم میں مقدمہ قائم ہو گیا۔ اس نے عدالت کے سامنے اپنی پوری روداد سناتے ہوئے اقبال جرم کر لیا تھا اور اسے تین ماہ کی قید بامشقت کی سزا کا حکم سنا دیا گیا تھا۔

شہنشاہ کی موٹر سے دب کر مر جانے اور اس ایک لاکھ روپے معاوضہ کی اس کی اسکیم فیل ہو گئی تھی۔

وہ تین مہینے کے بعد جیل سے رہا ہو کر باہر آیا۔ اس نے ایک اسکیم اور بنائی۔

"میں اپنی زندگی کا بیمہ ایک لاکھ روپے میں کرانے جا رہا ہوں۔" اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ "مر جاؤں گا تو ایک لاکھ روپے تم لوگوں کو مل جائیں گے۔"

"لیکن ۔۔" اس کی بیوی سہم کر بولی ۔۔ "یہ مر جانے کا سودا تمہارے دماغ میں کیوں سما گیا ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "تم زندہ رہو گے تو میری اور بچوں دونوں کی نیا پار لگ جائے گی۔" وہ لرز کر بولی۔ "ایشور کرے کہ تم زندہ رہو۔"

وہ یکبارگی رک گئی۔ بڑے درد کے ساتھ بولی۔

"مریں تمہارے دشمن۔"

لیکن وہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا اور اس کے دماغ میں یہ سما گیا تھا کہ اس کی ایم۔ اے کی یہ ڈگری اس کے کام آنے والی نہیں ہے۔ وہ زندگی بھر اسی طرح جھینکتا رہے گا اور اس کے بچے کچھ نہ کر سکیں گے اس کی بیوی اور اس کے بچوں کو فاقوں کی موت کے سوا اور کچھ نہ کرنا پڑے گا۔ اسے سب سے زیادہ اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر تھی۔

اس نے اپنا باپ والا وہ مکان بیچ ڈالا جس کا کرایہ اسے ہر مہینے بیس روپے ملا کرتا تھا ۔۔ یہ مکان اس نے دس ہزار روپے میں بیچا ۔۔ کمیشن رجسٹریشن اور دلال وغیرہ کاٹ کر اس کے ہاتھ میں صرف چھ ہزار روپے آئے۔

اور اس نے جھٹ سے ایک لاکھ روپے کا بیمہ کرا لیا۔ تین مہینے تک اس نے ملازمت کی پھر اس نے سر توڑ کوشش کی لیکن اسے ملازمت کہیں نہ ملی۔ ہر جگہ کچھ نہ کچھ لگا ہی رہتا تھا ۔۔ ایک بنک میں اسے تین سو کی ملازمت مل رہی تھی لیکن اس ملازمت کیلئے اسے پندرہ ہزار کی ضمانت کی ضرورت تھی۔ یا کسی ایسے مالدار آدمی کی ضرورت تھی جو ان کی ضمانت دے سکے اور وہ کسی ایسے آدمی کو نہ تلاش کر سکا جو اس کی ایمانداری کی ضمانت دے دے۔

وہ حد سے زیادہ پریشان ہو گیا۔ اس عرصہ میں اس نے لائف انشورنس کی دوسری قسط بھی بھر دی تھی۔ وہ اب دن رات سوچنے لگا تھا کہ وہ مرے کس طرح کہ اس کے متعلقین کو انشورنس کے ایک لاکھ روپے مل جائیں۔

اسے معلوم تھا کہ اگر وہ خودکشی کر کے مرتا ہے تو اس کی بیوی بچوں کو یہ ایک لاکھ روپے اس لیے نہ ملیں گے کہ خودکشی کر کے مرنیوالوں کو لائف انشورنس کے روپے نہیں ملتے۔

وہ دن رات اسی سوچ میں ڈوبا رہتا اور ایک دن اس کی بیوی نے اس سے بات کی۔

"یہ تم ہر وقت سوچا کیا کرتے ہو۔"

اس نے شوہر کو تسلی دی۔

"بھگوان مالک ہیں۔ جب انہوں نے

جنم دیا ہے تو وہ کھانے کو بھی دیں گے۔"

۔" ہاں ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔" اگر بھگوان کھانے کو دیتے رہتے تو دنیا میں بندوں کی تعداد میں فاقوں کی موتیں نہ ہوا کرتیں۔"

اس نے بیوی سے پوچھا۔

۔" اخبار تو تم بھی روز پڑھتی ہو ۔ اسی ہمارے دیس میں کتنے لوگ ہیں جو بھوک سے بلک بلک کر نہیں مرتے ۔ اور کتنے ایسے ہیں جو خودکشی نہیں کر لیتے ۔"

" لیکن ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔"

" تو میں کب ہمت ہار رہا ہوں ۔" اس نے پرمعنی انداز میں کہا۔" تم لوگوں کے مستقبل ہی کے بارے میں تو میں سوچا کرتا ہوں ۔"

پھر اس نے اپنی بیوی سے کوئی بات نہیں کی۔

۔" یہ تم کیا کہہ رہے ہو ۔ ؟"

شہر کے چھٹے ہوئے غنڈے نے اس کی بات سنکر حیرت سے سوال کیا۔

" اپن تم کو کھلاس کر دیں ۔ یہ منگتے ہو تم ۔ ؟"

۔" ہاں وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ بولا ۔" اسی کے تو میں تم کو دام دے رہا ہوں۔"

اس غنڈے نے کامتا پرشاد کو بغور دیکھا۔

۔" تم نے بھنگ پی لی ہے کیا یار یا تیرا بھیجا پھر گیلا ہے ۔"

۔" بھنگ تو میں نے نہیں پی ۔"

کامتا پرشاد نے جواب دیا۔" اور نہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے ۔ اسلئے کہ اگر میرا دماغ خراب ہو گیا ہوتا تو میں اتنی دور کی بات کیسے سوچ سکتا تھا۔"

اس نے زور دے کر کہا۔

۔" تم تو بس رات کے کسی حصے میں میری گلی میں آکر مجھے آواز دینا۔ میں باہر آجاؤں گا اور تم مجھے مار ڈالنا۔ لیکن یہ دھیان رکھنا کہ تمہارا وار خالی نہ جانے پائے ۔ میں اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی آنتیں سڑک پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور بس۔ تمہارا یہ احسان میں اگلے جنم میں بھی نہ بھولوں گا ۔"

۔" کہیں تم اپن کو پھنسانے کو تو نہیں منگتے ہو یار ۔ ؟" اس غنڈے نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

۔" یہ تم تو دنیا کے انوکھے آدمی ہو یار ۔ جو اپنے آپ کو مار ڈالنے کا سودا طے کر رہے ہو ۔"

وہ غنڈہ اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔

۔" میں سچ مچ انوکھا آدمی ہوں ۔"

کامتا پرشاد بولا۔" لیکن میں بھگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ اس میں تمہارے پھنسانے والی کوئی بات نہیں ہے۔"

اس نے اور زور دیا۔

۔" میں اپنے بچوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کر رہا۔"

۔" پر تم مرنے کو کاہے کو مانگتے ہو یار ۔ ؟"

۔" اس میں میرا فائدہ ہے ۔"

۔" مرجانے میں کیا فائدہ ہے ۔"

۔" میرے مر جانے ہی سے تو میرے بچوں کا بھوش بنے گا۔ میری پتنی کی بیماری اور ان سب کے فاقے دور ہوں گے ۔"

" اچھا۔" وہ غنڈہ بڑے اطمینان سے بولا۔" کل رات کے دو بجے اپن تم کو کھلاس کر دا دینگا۔" اور یہ کہہ کر اس نے اپنی مطلوبہ رقم کامتا پرشاد سے لے کر اپنی صدری کی جیب میں ٹھونس لی۔

کامتا پرشاد بہت خوش تھا ۔ وہ دن بھر اپنے بچوں سے بڑے پیار اور بڑی محبت سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے اپنی بیوی سے بھی بہت سی باتیں کیں۔ اسے دنیا اور زمانے کی اونچ نیچ سے آگاہ کرتا رہا۔ اسے یہ سمجھاتا اور بتاتا رہا کہ روپیہ کس طرح محفوظ رہ سکتا ہے اور کس بزنس میں لگایا جا سکتا ہے تاکہ اصل بھی بچا رہے اور اس سے مستقلاً چار سو روپے ماہوار کی آمدنی ہوتی رہے۔ وہ اسے ایک لاکھ روپے کی رقم کا مصرف بتاتا رہا کہ اس کی بیوی یکبارگی گھور کر بولی۔

" لیکن یہ سب کچھ تم مجھے ابھی سے کیوں سمجھا رہے ہو ۔ ؟" وہ ایک لاکھ بیمے کی رقم تو ہمیں آج سے بیس برس کے بعد ملے گی۔ اور پھر یہ سب کچھ جان کر میں کیا کروں گی ایشور تمہیں جیتا رکھے ۔ تم جو رہ ہو گے یہ سب کچھ کرنے کیلئے ۔"

اس نے مسکرا کر کہا۔

" ہاں ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن کیا پتہ کہ میں کب مر جاؤں ۔ موت اور زندگی کا کیا بھروسہ۔ اور پھر اگر تم بھی یہ سب کچھ سمجھ لو تو اس میں ہرج ہی کون سا ہے ۔"

اور پھر اس رات کو اس نے اچھے اچھے کھانے پکوائے اور اس نے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ وہ آج بات بات پر ہنستا تھا اور خوش ہوتا تھا۔

اس نے اپنے بچوں سے میٹھی میٹھی باتیں کیں وہ انہیں بار بار اپنے کلیجے سے لگاتا رہا ۔ اور انہیں پیار کرتا رہا۔ اس نے اپنی سب سے چھوٹی بچی گیتا کے ساتھ بیٹھ کر گڑیا بھی کھیلی اور وہ اس کے ساتھ اس کے کھلونوں سے بھی کھیلتا رہا پھر وہ اپنے بچوں کو لطیفے، قصے ۔ اور کہانیاں سناتا رہا۔ اور بات بات میں ہنستا اور قہقہے لگاتا رہا ۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ اسے دنیا کا کوئی غم نہیں ہے۔ یا جیسے کہ ہفت اقلیم کی دولت اس کے ہاتھ آگئی ہو۔

آج سے زیادہ ہنس مکھ خوش مزاج ۔ اور کھلنڈرا وہ اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آیا تھا۔

" اچھا اب تم لوگ جا کر سو جاؤ۔"

اس نے اپنے بچوں کو خوب جی بھر کر پیار کرتے ہوئے کہا۔

" بھگوان کے حوالے اب رات کے دس بج چکے ہیں۔"

اس کے بچے ہنسی خوشی سونے کے لئے لیٹ گئے اور وہ رات کے تقریباً ایک بجے تک اپنی پیاری بیوی سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔

اور پھر رات کے ایک بجے اس کی بیوی بھی سو گئی۔ وہ اپنے پلنگ پر لیٹا رہا اور نہ جانے کیا کچھ سوچتا رہا۔ کہ اس سوچ میں رات کے دو بج گئے

وہ اپنے بستر پر سے اٹھ بیٹھا گھڑیال نے رات کے دو بجائے اور اسی کے ساتھ ہی ساتھ نیچے سے اسے ایک ہلکی سی سیٹی کی آواز سنائی دی۔

اس کا دل بے اختیار اس کے سینے میں زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پر طنز و نفرت میں ڈوبی ہوئی ایک کربناک مسکراہٹ پھیلی اور اس کی یہ مسکراہٹ پھیلتی ہی چلی گئی۔

اس نے پیار سے آخری بار اپنے سوتے ہوئے بچوں کو دیکھا۔ اپنی بیوی کو دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں ان سب کی بلائیں لیتا ہوا وہ اپنے گھر کی کنڈی آہستہ سے کھول کر باہر آگیا۔

باہر نکل کر اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں وہ اپنے محسن اعظم کو جو کہ اسے قتل کر دینے کیلئے اس کی پرجوش اور پر زور خوشامد کی بنا پر یہاں تک اس پر احسان کرنے کیلئے آیا تھا۔ ادھر ادھر تلاش کر رہا تھا۔

لیمپ پوسٹ کی روشنی کے پرے ایک سایہ ابھرا اور وہ اس کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنے

قدموں کی رفتار تیز کر دی وہ دل ہی دل میں بھگوان کا نام لے رہا تھا۔ ہری اوم، ہری اوم ہری اوم، تت تت،۔"

اور اس وقت جب کہ اس کے محسن اعظم کی شکل اسے دکھائی دی اس کے ہونٹ ہلنے شروع ہو گئے۔ وہ آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا

۔" اوم ۔ اوم ۔ اوم ۔"

وہ مرنے کیلئے بالکل تیار تھا۔ اس کا محسن اعظم اس کے بالکل قریب آگیا۔ اس نے مرنے کے لئے اور چھرا کھانے کیلئے اپنی ہمت اور جوان کر لی اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تھیں کہ اس کے کانوں میں آواز آئی۔

" یار ـــ"

اور وہ جو کہ اوم نام کا ورد کر رہا تھا یکبارگی چونک پڑا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولدیں وہ غنڈہ کہہ رہا تھا۔

وہ ہولے سے بولا۔

"یار اپن نے لائن بدل دی ہے"

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

" یہ لو اپنے روپے۔"

اس نے وہ نوٹ اسکی قمیض کی جیب میں ٹھونس دیئے۔ اس نے اس کے کسی جواب کا انتظار نہیں کیا۔ بولا۔

" اپن نے آج سے یہ دھندا چھوڑ دیا ہے یار۔ تم میری راہ دیکھ رہے ہوگے اس لئے وقت پر آگیا ہوں۔ اب جا رہا ہوں۔ اپن سے یہ کام اب ہونے کو نہیں سکتا"

اور یہ کہہ کر وہ اس کے کسی جواب کا انتظار کئے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا وہاں سے چلا جا رہا تھا۔ وہ گلی سے مڑ کر اس کی نظروں سے غائب ہو گیا۔

اور وہ گم سم اور اداس اسی جگہ بت بنا ہوا کھڑا تھا کہ اس کو ایک زور کا چکر آیا غیر ارادی طور پر اس نے لیمپ پوسٹ کا سہارا لے لیا۔

اس کی نظروں میں ہر چیز تاریک ہو چکی تھی۔ ایک شخص جو کہ مشاعرے سے لوٹ رہا تھا۔ اس کے بالکل قریب سے شعری بھوپالی کا یہ شعر گنگناتا ہوا گزرا۔

نہ جینے پر ہی قابو ہے نہ مرنے ہی کا امکاں ہے
حقیقت میں انہیں مجبوریوں کا نام انساں ہے

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ـــ تاریکی کے سوا اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

رضا ہمدانی



یدِ بیضا

ابوالہول کی سرزمینِ مقدس!
تری عظمتوں کو لٹیروں نے لوٹا!
ترے حُسن کو وحشیوں نے بھنبھوڑا
تجھے اجنبی ساحروں نے لتاڑا
فراعینِ مغرب نے تیرے جگر میں
ہوس کی خدائی کا خنجر اتارا

ترے نخل زاروں کی شادابیوں سے
ترے نیل کی زرفشاں وادیوں سے
فلک بوس اہرام کی عظمتوں سے
نچوڑی رمق حسن اور زندگی کی

مگر وقت کا عدل اندھا نہیں تھا
یکایک ترے طور پر آگ بھڑکی
کلیم جواں عہد اٹھا
عصائے کلیمی نے جادوگروں کا حصارِ طلسمات توڑا
یدِ موسوی کی شعاعوں نے بدبیں نگاہوں کو اندھا بنایا
فراعینِ مغرب کا سب لاؤ لشکر
ترے نیل کی موج کے اژدہوں کی غذا بن گیا ہے
ابوالہول کی سرزمینِ مقدس!
سلامِ محبت سلامِ عقیدت

سنکی

غلام احمد فرقت کاکوروی



انگریز سپرنٹنڈنٹ :- مسٹر عزیز یہاں آیئے -
عزیز :- (رجسٹر میں رسید کا اندراج کرتے ہوئے) سر - حاضر ہوا -
سپرنٹنڈنٹ :- مسٹر عزیز! ابھی تک آپ آئے نہیں - میں آپ کو بلا رہا ہوں - یہاں آیئے -
عزیز :- (فوراً کام چھوڑ کر سپرنٹنڈنٹ کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے - سپرنٹنڈنٹ ایک کاغذ پر کچھ لکھنے میں مصروف ہے - بغیر سر اٹھائے اور کاغذ پر لکھتے ہوئے)
سپرنٹنڈنٹ :- مسٹر عزیز -
عزیز : یس سر - جی
سپرنٹنڈنٹ :- یس سر - جی کیا؟ (عینک اتار کر اور قلم ایک طرف رکھتے ہوئے -) آپ نے اتنی دیر کیوں لگائی - ؟
عزیز :- ایک رسید رجسٹر پر چڑھا رہا تھا -
سپرنٹنڈنٹ :- جب ہم بلائیں تو آپ فوراً آیئے - یہ سرکاری دفتر ہے - بھنگڑ خانہ نائی ہے رسید وسید چڑھانا ہم نہیں مانگتا آپ خوب اچھی طرح نوٹ کرے -
عزیز :- پھر؟
سپرنٹنڈنٹ :- پھر ور ہم جاننا نہیں سکے - آپ آئندہ سے رسید وسید کچھ نہ چڑھانا سکے - بس جائے -
عزیز :- پھر میں کیا کروں ؟
سپرنٹنڈنٹ :- ہم کچھ نہیں جانتا - آپ اپنا کام کرے اور ہم کچھ نہیں مانگتا - ہمارے پاس اتنا وکت (وقت) نائی ہے کہ ہم آپ کو کام سمجھا نا سکے - آپ جائے - ہم کو کام کرنے دے
عزیز :- میرے پاس تو رسیدیں ہی چڑھانے کا کام ہے -
سپرنٹنڈنٹ :- رسیدیں چڑھانے کا کام تو اچھا کام ہے - آپ جائے اور اپنا کام کرے -
ایک دوسرا کلرک :- اماں جاؤ اپنا کام کرو (عزیز اپنی سیٹ کی طرف جاتا ہے اور ابھی سیٹ پر بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ)
سپرنٹنڈنٹ :- مسٹر عزیز -
عزیز :- (قریب جا کر) جی
سپرنٹنڈنٹ :- دیکھئے فائل نمبر ۱۳، اے الماری سے نکال لایئے - (عزیز جانے لگتا ہے)
سپرنٹنڈنٹ :- آپ پوری بات نہیں سنتا، چلنا مانگتا ہے (عینک اتار کر) اچھا دیکھئے فائل نمبر ۱۳ نکال لائے - (عزیز پھر جانے لگتا ہے) -
سپرنٹنڈنٹ :- . . . . پھر آپ جانا مانگتا . . . اچھا جائے . . . مگر سنئے وہ فائل نہیں

مانگتا - آپ ۱۸ نمبر کا فائل نکال لائے اور رجسٹر پہ ہمارے نام چڑھالے ــــ

(عزیز جاکر الماری سے فائل نکالنے لگتا ہے)

سپرنٹنڈنٹ :- مسٹر عزیز - آپ کیا کر رہا ہے ؟

عزیز :- فائل نکال رہا ہوں -

سپرنٹنڈنٹ :- ہم بولا آپ اسکو رجسٹر پر چڑھا سکے آپ فائل کیوں نکالنا سکے -

عزیز :- بغیر فائل نکالے رجسٹر پہ کیسے چڑھالوں

سپرنٹنڈنٹ :- آپ پہلے فائل چڑھالے پھر نکالنا سکے -

(عزیز جلدی سے رجسٹر کھول کر فائل کا نمبر چڑھانے لگتا ہے)

سپرنٹنڈنٹ :- مسٹر عزیز -

عزیز :- جی

سپرنٹنڈنٹ :- آپ فائل نکالا -؟

عزیز :- اس کا نمبر رجسٹر پر چڑھا رہا ہوں -

سپرنٹنڈنٹ :- آپ پہلے فائل نکالے اس کے بعد اسے رجسٹر پر چڑھانا سکے - آپ ہمکو عجیب آدمی معلوم ہوتا ہے -

عزیز :- آپ ہی نے تو کہا تھا -

سپرنٹنڈنٹ :- ہم تو آپ سے بہت کہا تھا پر آپ کا کیا سوچنا تھا - اچھا جائے پہلے ہمکو فائل لاکر دے (عزیز جانے لگتا ہے)

.... آپ پھر چلنا سکے .... یہ پیپر فوراً چپراسی کو دے اور چپراسی سے بولے کر بڑے صاحب کے پاس لے جائے (عزیز چپڑاسی کو بلاکر کاغذ دینے لگتا ہے)

سپرنٹنڈنٹ :- مسٹر عزیز !

عزیز :- جی

سپرنٹنڈنٹ :- آپ نے ابھی تک فائل نہیں دیا -

عزیز :- چپراسی کو کاغذ دے رہا تھا -

سپرنٹنڈنٹ :- آپ پہلے فائل لاکر دینا سکے پھر کاگذ - (کاغذ) دے گا - آپ ہمکو پاگل بنا دیا -

عزیز :- (الماری سے فائل نکال کر اور سپرنٹنڈنٹ کے پاس فائل لاکر) یہ فائل حاضر ہے -

سپرنٹنڈنٹ :- کاگذ دیدیا

عزیز :- ابھی دیئے دیتا ہوں -

سپرنٹنڈنٹ :- آپ ہر کام دیر میں کرتا ہے - کاگذ فائل سے جروری ہے - آپ ابھی جاکر دے -

عزیز :- بہت اچھا - (چپراسی کو کاگذ دینے اپنی میز پر جاتا ہے)

سپرنٹنڈنٹ :- مسٹر عزیز

عزیز :- جی

سپرنٹنڈنٹ :- آپ کیا کر رہا ہے ؟

عزیز :- کاغذ دے رہا ہوں -

سپرنٹنڈنٹ :- آپ دن بھر کاگذ دیا کرتا ہے - آپ نے رسید چڑھا لیا جو ہم ابھی آپ کو بھیجا -

عزیز :- چڑھالوں گا -

سپرنٹنڈنٹ :- پھر آپ بولا چڑھالوں گا - آپ ہر چیز کو چڑھالونگا بولتا ہے - یہاں کیوں کھڑا ہے - جائے فوراً رسید چڑھائے -

(عزیز جانے لگتا ہے)

سپرنٹنڈنٹ :- پھر آپ چلنے لگا - آپ پوری بات نہیں سننا مانگتا (رک کر) ... بتائے ہم کیا کہنے جا رہا تھا -

عزیز :- معلوم نہیں

سپرنٹنڈنٹ :- آپ کو کچھ بھی معلوم نہیں - جو بات ہم پوچھتا ہے "معلوم نہیں" میں جواب دیتا ہے -

(عزیز جانے لگتا ہے) ....

سپرنٹنڈنٹ :- آپ پھر جا رہا ہے - ہماری بات نہیں سننا مانگتا ... اچھا تو آپ جائے رسید چڑھائے .... اور ہاں ... نہیں .. مگر جائے -

(تھوڑے وقفے سے)

سپرنٹنڈنٹ :- مسٹر عزیز - مسٹر عزیز -

عزیز :- جی

سپرنٹنڈنٹ :- دیکھے - آپ ایسا کرے کہ جاکر سب رسیدیں رجسٹر پر چڑھالے (عزیز جانے لگتا ہے)

... پھر آپ پوری بات نئیں سنتا ... تو آپ پہلے سب رسیدیں چڑھائے گا .. اور پھر .... آپ جاکر اپنا کام کرے

(وقفہ)

سپرنٹنڈنٹ :- عزیز مسٹر عزیز -

عزیز :- جی

سپرنٹنڈنٹ :- آپ وہیں سے بیٹھے بیٹھے - جی - جی - کئے جائے گا .... (عزیز اپنی میز سے اٹھ کر پاس آتا ہے) ....

سپرنٹنڈنٹ :- وہ دیکھئے ہم کیا کہنے جا رہا تھا - (سوچکر) ہاں - دیکھئے ادھر ہمار کرسی میں کیا چیز ہمارے چبھ رہا ہے -

(سپرنٹنڈنٹ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے - عزیز کرسی کو بغور دیکھنے لگتا ہے - تھوڑی دیر بعد خود ایک آلپن جو اس کے بینٹ پر کاغذ سے گر کر رک گئی تھی - ہاتھ میں لیکر)

عزیز یہ آلپن یہاں کیسے آیا ؟

عزیز :- کاغذ میں سے گر گئی ہو گی -

سپرنٹنڈنٹ :- کاگذ سے کیسے گر گیا - ہر چیز کاگذ سے کس موافق گرتا ہے ... کاگذ سے گر گیا .... کاگذ سے گر گیا -

عزیز :- معلوم نہیں -

سپرنٹنڈنٹ :- معلوم نہیں ... معلوم نہیں ... جب ہوتا ہے آپ یہی بولتا ہے معلوم نہیں - آپ اتنے عرصہ سے سرکاری دفتر میں کام کر رہا ہے اور آپ کو نہیں معلوم کہ آلپن کاگذ سے کس موافق گرا . . . اچھا یہ پن لے اور اپنے پاس رکھے ... ہم اسکو بعد میں لے لے گا ... (رک کر) مگر نہیں ہم کو واپس کر دے

(عزیز اپنی میز پر جاتا ہے) پانچ منٹ بعد

سپرنٹنڈنٹ :- عزیز مسٹر عزیز - (عزیز میز کے پاس آتا ہے)

(ایک فائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

آپ یہ فائل پڑھا -؟

عزیز :- جی - نہیں -

سپرنٹنڈنٹ :- جی نہیں .... ہر بات جی نہیں ... آپنے اس فائل کو کیوں نہیں پڑھا -

عزیز :- اس پر پرائیوٹ اور پرسنل لکھا ہے -

سپرنٹنڈنٹ :- تو -

عزیز :- اسی لئے نہیں پڑھی کہ یہ پرائیوٹ فائل ہے

سپرنٹنڈنٹ :- پھر بھی آپ نہیں پڑھا -

عزیز :- جی نہیں -

سپرنٹنڈنٹ :- ہر بات کا جواب آپ "جی نہیں" دیتا ہے (فائل کھولکر اور ایک صفحہ نکال کر) اس کو پڑھے -

عزیز :- (پڑھ کر) جی ہاں - پڑھ لیا -

سپرنٹنڈنٹ :- آپ نے کسی کا پرائیوٹ چیز کیوں پڑھا -؟

عزیز :- آپ ہی نے تو کہا تھا -

سپرنٹنڈنٹ :- ہم تو بہت سی باتیں کہتا ہے - آپ وہ سب کرتا ہے -

عزیز :- جی ہاں -

سپرنٹنڈنٹ :- پھر آپ "جی ہاں" بولا - اس فائل میں کیا لکھا ہے -

عزیز :- اس میں لکھا ہے کہ آپ کو اسسٹنٹ سیکریٹری کے عہدے کا چارج لینا ہے -

سپرنٹنڈنٹ :- تو ہم آپکو اپنا پرسنل اسسٹنٹ مکرر (مقرر) کرے گا - آپ کا سو روپے کا آمدنی اور بڑھ جائے گا - آپ منظور کرتا ہے

عزیز :- اپنی والدہ سے دودھ بخشوالوں -

سپرنٹنڈنٹ :- یہ کیا ہوتا ہے -

عزیز :- مطلب یہ کہ میں ماں سے پوچھ لوں -

سپرنٹنڈنٹ :- اچھا تم کل پوچھ کر آئے ہم آپکو اس جگہ پہ رکھے گا -

عزیز :- (اپنی میز کی طرف آتے ہوئے اور بڑبڑاتے ہوئے) سو روپے میں کوئی اپنی جان تھوڑی دیتا ہے -



سائنس اور ادب

سحر انصاری

ہمارا معاشرہ بڑی تیزی سے سائنسی معاشرہ بنتا جا رہا ہے اور سائنس ہماری زندگی کے تمام شعبوں پر اپنی ہمہ گیریت اور افادیت کے ساتھ اثر انداز ہوتی ہے کیونکہ ادب کا تعلق براہ راست زندگی سے ہوتا ہے اس لئے ہماری اس سائنسی دور کی زندگی کے مطالبات اور تجربات ادب پر پوری شدت کے ساتھ اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہمارے ادیب نظری سائنس یا خالص سائنس سے ممکن ہے اتنے متاثر نہ ہوں لیکن اطلاقی سائنس یا ٹکنالوجی چونکہ ان کی زندگی پر مختلف انداز میں اثر انداز ہوتی ہے اسلئے ان کا ذاتی رد عمل کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اکثر اوقات یہ رد عمل انہیں مایوسی کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ سائنس کے انکشافات کو ذاتی زندگی کا ایک حصہ سمجھنے کے بجائے وہ انہیں اپنی فکر اور تخیل کا حریف سمجھنے لگے ہیں تین صدی قبل سائنس ادب اور ادیب کیلئے اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھی جتنا کہ آج ہے فلسفہ اور مذہب شروع ہی سے ادب کے تمام تر موضوعات پر محیط تھے اور چونکہ فلسفے اور مذہب میں تخیل اور فکر کا بھی دخل ہوتا ہے اس لئے ادیب جس کی تخلیق کا تمام تر دار و مدار وجدان اور متخیلہ قوت پر ہوتا ہے فلسفے اور مذہب سے پوری طرح ہم آہنگ رہا۔

لیکن آج جب سیاست تک سائنس کے تابع ہو گئی ہے اور سیاسی قوتوں کو پرکھنے کا معیار ملکوں اور قوموں کی سائنسی ترقی بن چکا ہے ادب کیلئے سائنس سے خود کو ہم آہنگ کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔

جدید سائنس کے تمام تر نظریات اور انکشافات مغرب کے سائنس دانوں کے مرہون منت ہیں اس لئے مغربی ادیبوں پر اس کے اثرات سب سے پہلے مرتب ہوئے ابتدا میں مغربی ادیبوں نے سائنس کے اثرات کو فطری طور پر اپنے تصورات اور تخیلات کا حریف سمجھا سولھویں صدی کے انگریز ادیبوں نے خاص طور پر فرانسس بیکن نے سائنس کی بڑی شد و مد سے مخالفت کی اس نے گیلی لیو، کیپلر اور گلبرٹ کے کارناموں کو سنجیدگی کے ساتھ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن بعد میں اسے اندازہ ہو گیا کہ مادیت کی گرفت انسانی فکر پر بڑھتی جا رہی ہے جس کے نتیجے میں عقائد اوہام اور اساطیر کا دائرہ اثر و نفوذ کم تر ہوتا جائے گا۔

سترھویں صدی میں "رائل سوسائٹی" قائم ہو چکی تھی اور اس کے بعض اراکین کے ایما پر سائنس کو بھی چند اجلاسوں میں موضوع بحث بنایا جاتا رہا۔ سترہویں صدی کے اواخر میں ڈرائیڈن، ڈینہم، والر اور کولی نے رائل سوسائٹی سے گہرے روابط قائم کر لئے تھے اور سوسائٹی کے بعض سائنس دان اراکین مثلاً رابرٹ بائل وغیرہ نے اپنے ذریعۂ اظہار کو "ادبی" بنانے پر زور دیا۔

اٹھارہویں صدی کے ادیبوں کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والا سائنس دان نیوٹن تھا شروع میں نیوٹن کے اثرات کو مخاصمانہ انداز میں رد کرنے کی کوشش کی گئی لیکن بعد میں پوپ نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ خود کو سائنس کے اثرات سے وابستہ کر دیا اس نے نیوٹن کی "آپٹکس" (OPTICKS) اور "پرنسپیا" —— (PRINCIPIA) کا غائر مطالعہ کیا اور اول الذکر کتاب کو سمجھنے میں وہ کامیاب بھی رہا اس کے بعد نیوٹن کی شخصیت اور اس کی تحریریں اس قدر ہمہ گیر بنتی گئیں کہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں اور انیسویں صدی کے اوائل کے تخلیقی فنکاروں نے خود کو سائنسی نظریات سے ہم آہنگ کرنے کی شعوری کوششیں شروع کر دیں زیادہ تر اثرات نیوٹن کی —— (OPTICKS) آپٹکس ہی سے قبول کئے گئے ہیں کیونکہ "پرنسپیا" بہت دقیق کتاب تھی۔ اور اس کا سمجھنا اس زمانے میں اتنا آسان نہ تھا۔ مغرب کے فن کاروں میں کولرج۔ اور

ورڈسورتھ نے سائنس کے اثرات کو بالکل مختلف انداز میں قبول کیا وہ بلیک، کیٹس یا لیمب کی طرح سائنس کو شاعری کا حریف نہیں سمجھتی تھی خصوصاً کولرج نے اس سلسلے میں ادیب کی اس وسیع النظری کا ثبوت دیا جس کی وجہ سے توقع کی جاتی ہے اس نے اپنے دور کے نوجوان کیمیا داں ہمفری ڈیوی سے کافی گہرے روابط قائم کر لئے تھے ڈیوی خود بھی ایک اچھا شاعر تھا اس سے قریب رہ کر کولرج نے نہ صرف سائنس سے گہری دلچسپی لی بلکہ وہ ایک کیمیاوی تجربہ گاہ کے قیام کے سلسلے میں اس کی عملی مدد کو بھی تیار تھا۔ نیز ورڈسورتھ کو بھی اس نے بڑی سنجیدگی سے اس طرف مائل کرنے کی کوشش کی تھی۔

کولرج کو ورڈسورتھ کے مقابلے میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی کمی کا احساس تھا۔ چنانچہ وہ چاہتا تھا کہ ورڈسورتھ علوم سائنس سے ہم آہنگ ہو کر اپنی شاعری کے امکانات کو وسیع تر اور عظیم تر بنا دے۔ لیکن ورڈسورتھ کی نیچر پرستی نے تعقل کو تخیل پر فوقیت دینے سے انکار کر دیا۔ کولرج کا ارادہ ملٹن کی "فردوسِ گمشدہ" جیسی نظم لکھنے کا تھا۔ لیکن اس کا شاعرانہ عجز مانع رہا۔

کولرج نے اپنے ایک دوست کو خط میں لکھا تھا کہ۔

"اگر میں اس دور میں ملٹن جیسی طویل اور عظیم نظم لکھنا چاہوں تو مجھے دس سال تک ہیئت، طبیعات، کیمیا، نفسیات، حیاتیات، ریاضی اور دیگر علوم جدیدہ سے بھرپور استفادہ کرنا پڑے گا۔"

سائنس کے سلسلے میں کولرج سے زیادہ اس دور کے کسی اور شاعر نے اتنی شدید آرزومندی کا اظہار نہیں کیا ہے۔

رومانوی شعراء میں سب سے زیادہ سائنسی علم شیلے کے پاس تھا۔ اس نے سنجیدگی سے اس وقت تک تمام سائنس دانوں کی تحریروں اور دریافتوں کا مطالعہ کر لیا تھا اس کی بعض طویل نظموں میں اس کا سائنسی علم ایک منفرد انداز میں نمایاں ہوتا ہے وہائٹ ہیڈ نے تو اپنی کتاب "سائنس اور دنیائے جدید" میں شیلے کے متعلق یہ تک لکھ دیا ہے کہ اگر وہ اپنے وقت سے سو سال بعد ہوتا تو بیسویں صدی کو کیمیا دانوں میں ایک نیوٹن حاصل ہو جاتا اس کے برعکس کیٹس کو سائنس کے نام سے چڑ تھی۔ اور وہ اس علم کے وجود ہی کا مخالف تھا اس کا ردعمل بہت منفی اور شدید تھا اس کا کہنا تھا کہ نیوٹن نے منشور (PRISM) سے ست رنگی دھنک پیدا کر کے۔ قوسِ قزح کی شعریت کو خاک میں ملا دیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جب شیلے نے کیٹس کی وفات پر نظم لکھی تو منشور کے طیفی رنگوں ہی کو ایک خوبصورت استعارہ بنا کر پیش کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سائنس کے سلسلے میں شعراء کا ردعمل اگر منفی نہ ہوتا تو شیلے کی طرح اور شعراء بھی سائنس کو اپنی شاعری کی روایت میں شامل کر لیتے۔

انیسویں صدی کے بالکل آخر میں بعض شعراء نے کوشش کی کہ نظریۂ ارتقا کو تسلیم کر کے اسے ایک جدید اور اخلاقی نظام کے مطابق اپنا لیں یہ کوشش غالباً سائنس کے خلاف انیسویں صدی کے رومانوی شاعروں کے ردعمل کا نتیجہ تھا۔ اس لئے کہ انیسویں صدی کے آخر تک سائنس کے اثرات زندگی کے ہر شعبے کو اپنی گرفت میں لے چکے تھے اور بدلتی ہوئی زندگی کے تقاضوں کو تسلیم کرنے سے گریز وقت سے پیچھے رہ جانے کے مترادف ہوتا۔ فرائڈ نفسیات کی سائنسی تعبیریں پیش کر چکا تھا ڈارون کے نظریۂ ارتقاء نے مذاہب اور اساطیر کے دعووں کو یکسر باطل قرار دے دیا تھا اور مارکس کی جدلی مادیت نے انسانی معاشرے اور معاشیات کے تمام اہم شعبوں کو سمجھنے کیلئے ایک نیا سائنسی نقطۂ نظر عطا کر دیا تھا۔

بیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے ادیبوں کو شدت کے ساتھ یہ احساس ہونے لگا کہ سائنسی معاشرے کا قیام انسانی زندگی کیلئے ناگزیر ہو گیا ہے اور یہ چہار ابعادی کائنات دراصل فرائڈ، ڈارون، مارکس اور آئین اسٹائن پر مشتمل ہے۔

ادب کو چونکہ ایک صحت مند رویے کی ضرورت تھی اس لئے مروجہ ادب بے اعتباری کی نذر ہونے لگا۔ بیسویں صدی کے بیشتر ادیب اور شاعر اطلاقی سائنس کے کرشموں کے سامنے تخیل کی سحر آفرینیوں کو کمتر اور بے معنی سمجھنے لگے بعض ادبی حلقے اسکائی اسکریپروں، خودکار آلات، تیز رفتار سواریوں اور نور، آواز اور توانائی کے دوسرے مظاہر کی کارفرمائیوں کو تخیل، جذبے اور احساس کی موت قرار دینے لگے انہیں جدید تہذیب میں گھٹن سی محسوس ہونے لگی جیسے معاشرے میں اب ادیبوں کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہو جیسے اب ان کا اعتبار مٹتا جا رہا ہو۔ اس کے نتیجے میں فرار، پسپائی، مایوسی اور ناامیدی نے مغرب کے شاعروں اور ادیبوں کے ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ پھر ہیروشیما اور ناگاساکی میں اطلاقی سائنس کے انسان کش اثرات دیکھ کر سائنسی ترقی پر خوش ہونے والے انسانوں میں شاعروں اور ادیبوں کو قنوطیت کا عکس نظر آنے لگا۔

مشرق میں سائنس کے اثرات مغرب کی بہ نسبت بالکل مختلف نوعیت کے رہے ہیں مشرق میں نظری سائنس یا اطلاقی سائنس سے زیادہ فلسفے اور تصوف کا زور تھا۔ یہاں کی شعری روایات میں فلسفہ اور تصوف رچ بس گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مشرق مذہب کا تصور مغرب کے تصورِ مذہب سے بالکل مختلف تھا۔ چنانچہ مشرق میں سائنسی معاشرے کے ابتدائی اثرات کو قبول کرنے کا عمل نسبتاً حوصلہ افزا رہا ہے۔ ادیبوں نے سائنسی دور سے ادب کو وابستہ کرنے کی ضرورت کو مخاصمانہ رویے یا تحریک کا شکار نہیں بنایا۔

وہائٹ ہیڈ نے سائنس اور دنیائے جدید میں لکھا ہے۔

"یہ بات روز بروز واضح ہوتی جا رہی ہے کہ مغرب مشرق کو بلا تامل جو کچھ دے سکتا ہے وہ اس کی سائنس اور اس کا سائنسی انداز نظر ہے یہ ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک نسل سے دوسری نسل تک جہاں کہیں عقلی معاشرہ موجود ہے منتقل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

برصغیر کے لئے یہ بات بڑی اہم اور سچی ہے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہی اردو کے بعض ذہین ادیبوں نے مغربی تہذیب کے اثرات کو محسوس کر کے اپنے خیالات اپنے نظریات اور اپنے تصورات میں تبدیلیاں شروع کر دیں غالب کے ذہن میں کسی سائنسی معاشرے کا واضح تصور موجود نہیں تھا لیکن مجموعی حیثیت سے وہ مغرب کی تہذیب سے متاثر ہوئے اور انہوں نے ایک طباع ذہین اور بالغ نظر شاعر کی حیثیت سے نہ صرف اپنے عہد کے تقاضوں کو محسوس کر لیا بلکہ مستقبل میں انسانی فکر کی نوعیت کا بھی اندازہ کر لیا وہ اطلاقی سائنس کے کرشموں سے واضح طور پر متاثر ہوئے انہوں نے "صاحبان انگلستان را نگر" کا مشورہ دیا۔ اور "دودِ کشتی"، "دیاسلائی"، "گراموفون"، "تار برقی" کو اپنی ایک منظوم تقریظ میں پیش کیا وہ اس بات پر خوش ہوئے کہ صاحبانِ انگلستان کے ساتھ "شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند" کی خوبی وابستہ ہے نئے دور کی اس آگہی اور شعور کو انہوں نے بڑی توانائی سے اپنی شاعری میں سمویا ہے جس کے دوررس اثرات اور نتائج ہم اردو شاعری میں مسلسل دیکھتے ہیں۔

انیسویں صدی میں سرسید نے سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی، اور اس سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک اخبار جاری کیا نیز اپنی نگرانی میں تاریخ، اقتصادیات، برقیات علم الارض اور ریاضیات کی کئی عمدہ کتابوں کا انگریزی سے اردو میں منتقل کرایا لیکن سرسید کا مقصد محض ادب میں کوئی بنیادی انقلاب پیدا کرنا نہیں تھا وہ مجموعی حیثیت سے مسلمان

معاشرے کو بدلتا ہوا دیکھ پا رہے تھے انہوں نے مذہب کو نئے سائنسی تقاضوں کے مطابق سمجھنے کی کوشش پر زور دیا۔ وہ منقولات کے مقابلے میں معقولات کی تبلیغ کرتے تھے۔ تاکہ مسلمان اوہام پرستی اور ضعیف الاعتقادی کو ترک کر کے جدید دور کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کر سکیں۔

اسی طرح کی کئی اور کوششوں اور جدید مغربی علوم سے بہرہ ور ہونے کے بعد اردو کے ادیبوں میں سائنس کے اثرا کو محسوس کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی موجودہ دور بیسویں صدی کے نصف اول سے بالکل مختلف ہے۔ اب بات مسئلہ گردش زمین اور فلزات و بخارات سے آگے نکل چکی ہے تسخیر خلا کا عظیم الشان سائنسی کارنامہ آج کے ادیب کے سامنے ہے تیز رفتار راکٹ اور مصنوعی سیاروں کا جال وہ آئے دن بڑھتا رہتا ہے ہمارے بعض دانش ور ادیب اور شاعر اطلاقی سائنس کے ساتھ ساتھ نظری سائنس کے مسائل کو بھی سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں اکثریت ایسے ادیبوں کی ہے جو اس چہار العبادی کائنات سے اپنا مابعد الطبیعیاتی یا فکری رشتہ جوڑنے اور نئی زندگی سے نئے استعارات اور علامات اخذ کرنے کے بجائے فرار کی راہ تلاش کر رہے ہیں ان کا رد عمل مجموعی طور پر مثبت نہیں ہے۔ مغرب کے اکثر ادیبوں کی طرح اردو کے ادیب بھی سائنس کے ارتقا اور سائنسی صداقت کے دور میں اپنی تخلیق کو لایعنی اور معاشرے میں اپنے وجود کو بے کار سمجھنے لگے ہیں جس کے نتیجے میں سنجیدہ ادب پر بہت کم توجہ دی جا رہی ہے۔ حصارِ گردش و رفتار میں رہ کر وہ آج کے انسان کو صرف یاس کا پیغام سنانے میں مصروف ہیں۔ اس لئے جاسوسی ادب مزاحیہ ادب (اور وہ بھی گھٹیا درجے کا) اور سنسنی خیز تخلیقات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے سائنسی دور نے ادیب کو اظہار کے لئے جو نئی علامتیں دی ہیں انہیں جذبے کی صداقت میں جذب کر کے آج کا اردو ادیب اپنے ادب کو ایک نئی جہت ایک نئی توانائی اور ایک نئی روایت دے سکتا ہے۔ ادب اور سائنس کے تاریخی رشتے کو نظر انداز کر کے اگر اردو کے ادیب اسی انفعالیت اور پژمردگی کا شکار رہے جس کا مغرب کے اکثر ادیب رہے اور اب تک ہیں تو یہ زندگی کے امکانات۔ اور انسان کی صلاحیتوں کا انکار ہو گا جس سے ادب اور ادیب دونوں کو ناقابل تلافی نقصانات پہنچیں گے اس میں شک نہیں کہ اطلاقی سائنس کے ہمہ گیر اثرات دیکھ کر آج کا ادیب ایک سائنس داں کے مقابلے میں احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے کیونکہ سائنس کی صداقت اور ترقی کو آپ گراف اور اعداد و شمار کی جدول سے ناپ سکتے ہیں لیکن ترسیمی خطوط سے ادب کی پیمائش ناممکن ہے۔ چنانچہ مایوس ہونے کے بجائے آج کے ادیب کو چاہئے کہ وہ اپنے ذہن کو سائنس سے ہم آہنگ کرے صرف اسی صورت میں فلسفہ مذہب اور سیاست کی طرح سائنس بھی اس کی تخلیقی صلاحیتوں کی حریف بننے کے بجائے اس کے انداز فکر اور جذباتی رد عمل میں مثبت تغیر کا باعث ہو سکتی ہے۔

سائنس کا منصب اب تک تجزیاتی رہا ہے۔ ادیب انسانی فکر اور اشیاء کی تالیف کے ذریعے ادب کو تالیفی منصب عطا کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ زندگی سے براہِ راست تاثر قبول کر کے انسانی شعور کی صحت مند تربیت دینے اور انسانی روح کو مسرت اور طمانیت بخشنے کا کام صرف ادب ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے اور جو ادب سائنسی دور کے تقاضوں کو پورا کر کے سائنسی معاشرے میں بسنے والے انسانوں کے شعور کی تربیت کر سکے وہ ادب کسی بھی دور میں نظر انداز یا مسترد نہیں کیا جا سکتا۔

دیمقراطیس کے جوہر یا ذرۂ لاتیجزہ کو اس کے ہم عصر فلسفیوں نے ناقابل اعتنا سمجھا تھا لیکن آج نہ صرف ایٹمی سائنس کی تاریخ دیمقراطیس سے شروع کی جاتی ہے بلکہ سائنس اور ادب کے باہمی تعلق کی داستان بھی لکریٹیس اور فریکٹورلیس کی شاعری سے شروع ہوتی ہے جنہوں نے ذرے کو کل اشیا کی اساس قرار دیا تھا اور اس سائنسی تصور کو اپنی شاعری میں کمال فن سے پیش کیا تھا۔

یونانی اور اطالوی کلاسیکی ادب سے قطع نظر جدید سائنسی ادب نے گزشتہ تین صدیوں میں تخلیقی ادب پر کسی نہ کسی پہلو سے بہت گہرے اثرات مرتب کئے ہیں لیکن ان میں سے بیشتر منفی رہے ہیں کیونکہ اثرات قبول کرنے والوں کا انداز مخاصمانہ اور مریضانہ تھا۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے ہم روز بروز بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہو رہے ہیں اس عمل کے ساتھ ساتھ ہمارے جذبات احساسات اور خیالات میں بھی تغیر رونما ہو رہا ہے لیکن اب تک سائنس ہمارے لئے ایک انتہا اور ادب دوسری انتہا ہے اس خیال کے ساتھ ہی مجھے پاسکل کا یہ قول بھی یاد آ رہا ہے کہ کسی شخص کی عظمت اس وقت ظاہر نہیں ہوتی جب وہ ایک انتہا پر کھڑا ہو بلکہ وہ اپنی عظمت اس وقت ظاہر کرتا ہے جب اس نے دونوں انتہاؤں کو چھو لیا ہو اور درمیانی خلا کو پُر کر دیا ہو۔ میرے خیال میں سائنسی صداقت کے دور میں ایک باشعور ادیب کا منصب یہی ہونا چاہئے ؛



غزل

حسن عابد

ہم وہ بدمستِ جنوں ہیں جو سرِ راہِ حیات
کبھی باہوش کبھی ہوش سے بیگانہ چلے

پھر یہ یکجائیِ یارانِ چمن ہو کہ نہ ہو
دیر تک آج ذرا بزم میں پیمانہ چلے

پھر کوئی قیس ہو آوارۂ صحرائے جنوں
پھر کسی گیسوئے شبرنگ کا افسانہ چلے

ہم نے چاہا تو نہ تھا ان سے الجھنا لیکن
اس کو کیا کہیئے وہ ہر چال حریفانہ چلے

وقت بدلا ہے تو پھر کیوں نہ بہ اندازِ دِگر
وہی تحریکِ شکستِ خم و میخانہ چلے



اختر انصاری

کس نے

مقدر کو یہ کس نے علمِ انسانی بنا ڈالا؟
یہ کس نے عقل و دانش کے خزانوں کو لٹا ڈالا؟
یہ کس نے سحرِ مفروضات لایعنی کو جھٹلا کر
شعور و فکر و درک و نقد کا جادو جگا ڈالا؟
یہ کس نے بجلیاں برسا کے برہانی حقائق کی
خس و خاشاکِ اوہام و خوارق کو جلا ڈالا؟
یہ کس نے زندگی کی اصلیت کے روئے سادہ سے
روایت اور عقیدت کے حجابوں کو اٹھا ڈالا؟
یہ کس نے ارتقا کا رازِ مخفی برملا کہہ کر
زمانے بھر کے فرزانوں کو دیوانہ بنا ڈالا؟
یہ کس نے محنتِ مزدور کو بنیاد ٹھیرا کر
در و دیوارِ ایوانِ امارت کو ہلا ڈالا؟
یہ کس نے جور و استبداد کی پروردہ دنیا کو
اک آفاقی نظامِ عدل کا مژدہ سنا ڈالا؟
یہ کس نے مشعلِ توقیرِ آدم کی تجلی سے
عروجِ آدمیت کے افق کو جگمگا ڈالا؟
یہ کس نے کاروانِ ارتفاعِ روحِ انساں کو
زمیں کی ٹھوس، مرئی، مادی راہوں پہ لا ڈالا؟
غرض اختر یہ کس نے اس جہنم زارِ دنیا کو
اک ارضی خلد کا خلد آفریں جلوہ دکھا ڈالا؟

شہریار

غزل

سوا ہے آج تیرگی کہ بیکلی دوچند ہے
جو مجھ کو جستجوئے غمگسارِ دردمند ہے

جو چند لمحے وقت نے دیئے ہیں ان کا کیا کریں
درِ حبیب وا نہیں، درِ حیات بند ہے

تمہارا اور میرا اب نباہ ہو تو کیسے ہو؟
مجھے وفا عزیز ہے تمہیں جفا پسند ہے

وہ میں نہیں عدو سہی، خوشی یہ ہے کہ دہر میں
کوئی تو سرخ رو ہوا، کوئی تو سر بلند ہے

عزیزِ شہر آپ کی یہ منصفی بھی خوب ہے
ہوس کو چھوٹ ہے کھلی جنوں پہ قید و بند ہے



Coca-Cola
Enjoy food more –
with sparkling Coca-Cola
Top the treat—Something good to eat—and glorious-tasting Coca-Cola to go with it! Worth a happy grin any time! And Coca-Cola is so pure and wholesome, you're glad to let the youngsters enjoy it. Keep this happy refreshment in your home!
Coca-Cola
SIGN OF GOOD TASTE
IN OVER 100 COUNTRIES
Bottled under authority of The Coca-Cola Company by
KARACHI BEVERAGE COMPANY LTD.

جون ایلیا

غزل



جانِ شاعر! میں سخت نادم ہوں
پیٹ پالوں کہ تجھ سے پیار کروں
تو کہے تو بطورِ نذرِ وفا!
کہکشاں تیرے نام لکھ ڈالوں!!
ریشمیں خواب دیکھنے والی!
تو بھی پاگل ہے میں بھی پاگل ہوں
میں نے خود کو بہت فریب دیئے
چاہتا ہوں تجھے فریب نہ دوں!
تو مجھے بھول کیوں نہیں سکتی؟
میں تری اس وفا سے عاجز ہوں
بے زری کی انا ہی رہ جائے
میں تجھے خود ہی کیوں نہ ٹھکرا دوں
میری راتیں ابھی نہ مہکیں گی!
چل مری جان تجھ کو پہنچا دوں
کیا کہوں کسقدر تمنا تھی
زندگی بھر میں تیرے ساتھ رہوں
میں نے قابو ہی پا لیا ورنہ
شعلہ خو تھا مرے بدن کا جنوں

راہی معصوم رضا

طوفان

گھٹا زمیں پر جھکی ہوئی ہے
ندی کا پانی ہوا کے نیزوں کی چوٹ کھا کر تڑپ رہا ہے
کنارے سہمے ہوئے کھڑے ہیں
ہوا کے ناخن بڑے درختوں کے پیرہن میں دھنسے ہوئے ہیں
درخت اپنے بدن سمیٹے
ہوا کے عفریت کی نگاہوں سے بچ رہے ہیں
تمام شاخیں کراہتی ہیں
ندی کے سینے پہ ایک عفریت
جھاگ کے صد ہزار گھنگھرو پہن کے بے تال ناچتا ہے
امید ساحل کی طرح کٹ کٹ کے گر رہی ہے



عکاس: علی اصغر



عکس



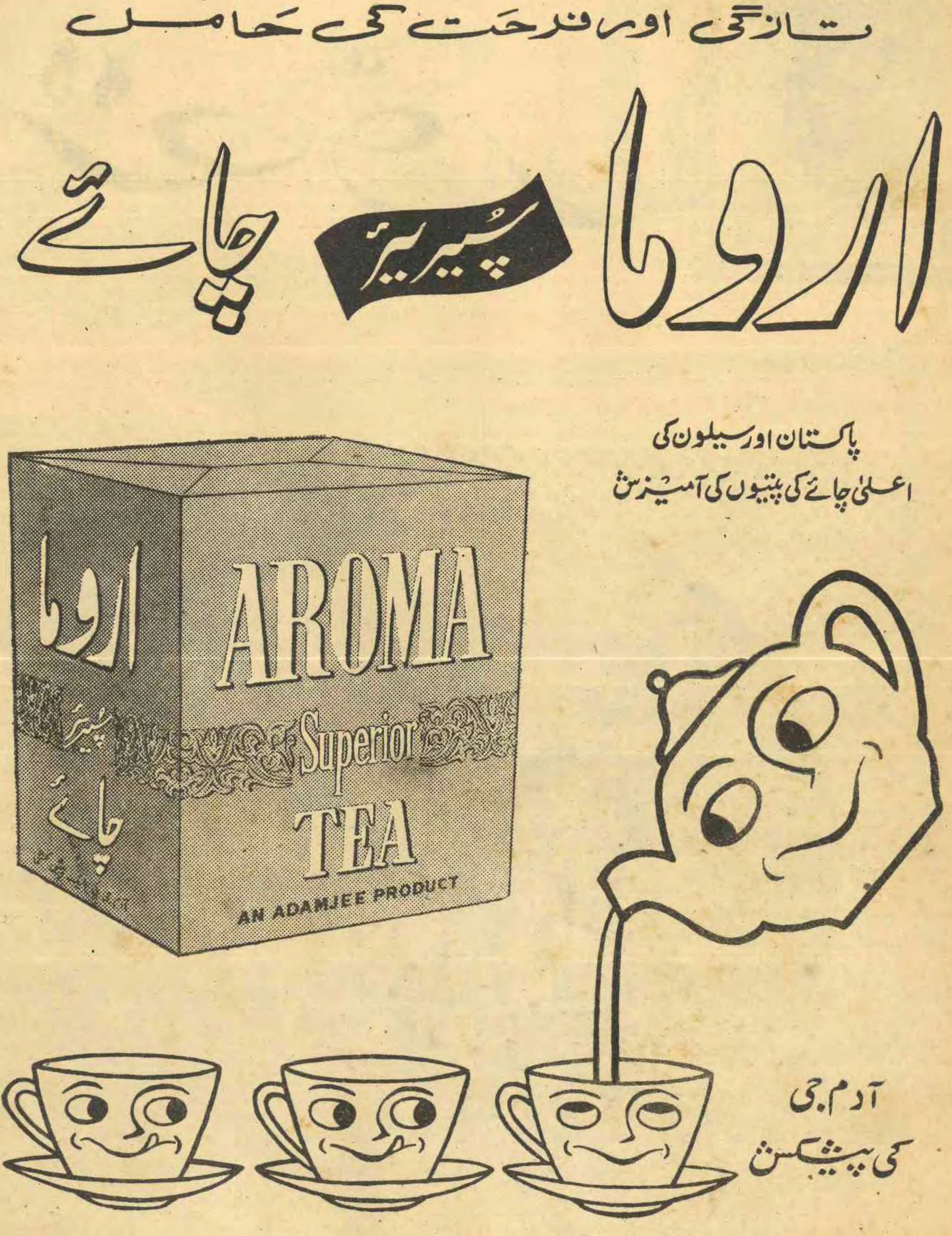


تصوّر

مصوّر:- جلال



جاگ سوزِ عشق جاگ


تازگی اور فرحت کی حامل
اروما سپیریئر چائے
پاکستان اور سیلون کی
اعلیٰ چائے کی پتیوں کی آمیزش
اروما سپیریئر چائے
AROMA
Superior
TEA
AN ADAMJEE PRODUCT
آدم جی
کی پیشکش



مسلم شمیم

نئی قدریں

حق بات ہے اس دور میں تخریب پسندی
باطل کی ستائش میں ہے انساں کی بلندی
تائید ستم شیوۂ اربابِ ہنر ہے
زندان و رسن مرتبۂ اہلِ نظر ہے
مجرم ہیں جو ظلمت کو اجالا نہیں کہتے
مقتل کو محبت کا شوالہ نہیں کہتے

آزادیٔ افکار کی شمعیں نہ جلاؤ
آرائشِ زنداں کے لئے خون بہاؤ
شاداب چمن خوف کے پھولوں سے کیا جائے
روشن رہِ ہستی کو بگولوں سے کیا جائے
آئینِ چمن ظلم و ستم کا ہے نگہباں
انصاف ہے گمراہیٔ احساس پہ خنداں

ہر اہلِ ہوس لائقِ انعام و کرم ہے!
دانش ور و فنکار ثناخوانِ ستم ہے!
حب الوطنی جعفر و صادق کی ہے جاگیر
ٹیپو کا لہو بیچنے والوں کی ہے توقیر
جمہور ہیں نادان انھیں اپنی خبر کیا
افلاس ہے تقدیرِ بشر اسکی خبر کیا

شداد یہاں لشکرِ دوراں کا لقب پائے
فرعون یہاں محسنِ انساں کا لقب پائے
زنجیر گراں قسمتِ صاحب نظراں ہے
زہراب بکف آج بھی سقراطِ جہاں ہے



خالد حمیدی

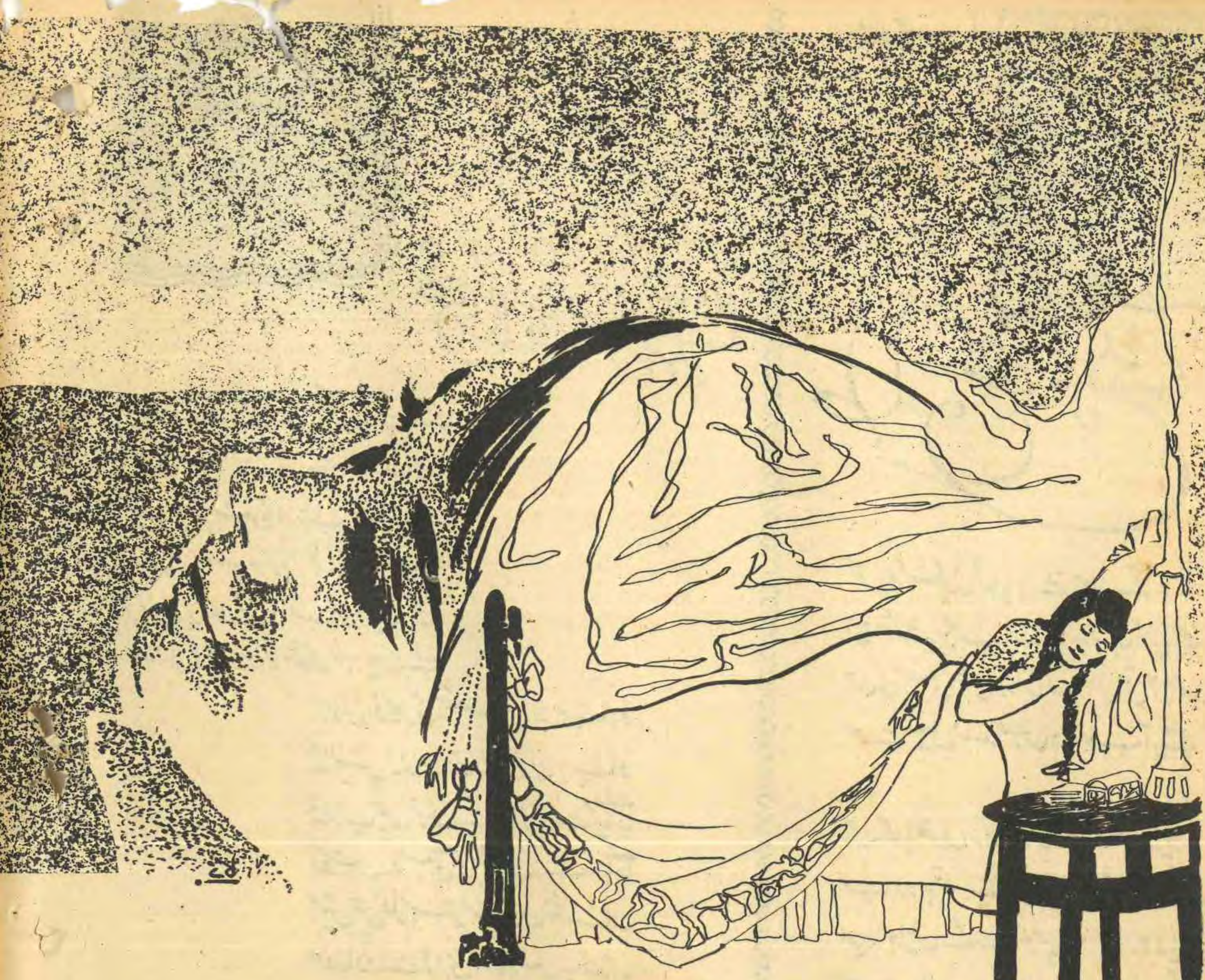
طلوعِ صبح

کل جو کشکولِ گدایانہ لئے پھرتے تھے
آج شمشیر بکف نعرہ بہ لب آپہنچے
جن کی ہستی خس و خاشاکِ محض تھی کل تک
صورتِ سیل بصد غیض و غضب آپہنچے

جن کے ہاتھوں نے ابھارے تھے قصور و ایواں
اب وہ ہر قصر کی بنیاد ہلا ڈالیں گے
اب سجائیں گے نئے کوچہ و بازار و دیار
صورتِ عالمِ نو داد وفا پالیں گے

کوہکن ضربتِ تیشہ کا نہیں ہوگا قتیل
آج تیشے کو ہے پرویز کے سینے کی تلاش
دیوِ جبروت پہ ہے نزع کا عالم طاری
موت ٹھہرے گی نہ اب جرم وفا کی پاداش

ساغرِ وقت میں جب گھٹتی ہے شب کی صہبا
دُردِ تاریکیٔ شب اور گراں ہوتی ہے
غم نہیں اور اگر چند ستارے ٹوٹیں!
صبح تاروں کا لہو پی کے جواں ہوتی ہے

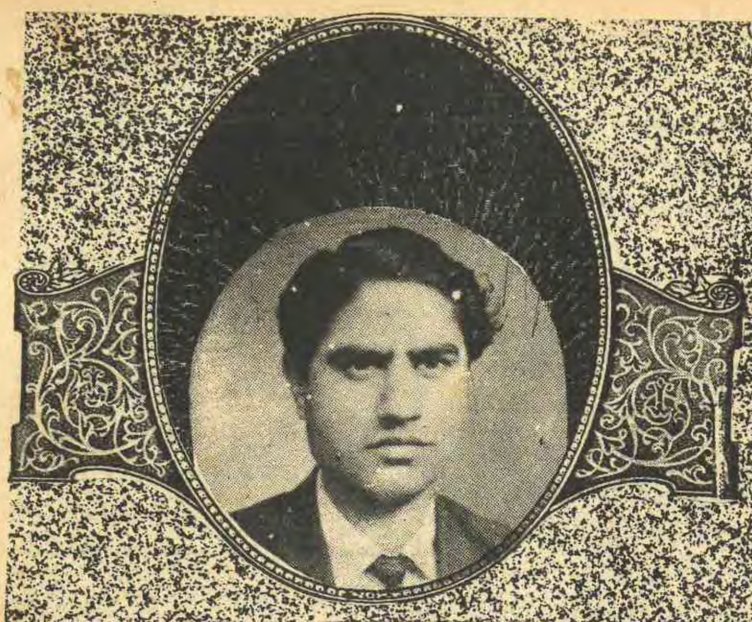


جاڑوں کی راتیں کھانا کھانے کے بعد پانی پیو تو ٹھنڈی سی تلوار سی حلق سے پیٹ تک اترتی چلی جاتی ہے اور اس کے بعد کپکپی بیمانت بری طرح بجنے لگتے ہیں۔ بستر میں لیٹ کر لحاف اوڑھو تو ٹھنڈا لحاف عجیب سا محسوس ہوتا ہے ٹھنڈا بھی اور گرم بھی۔ تھوڑی دیر تک تونسی سی کرتے ہوئے ٹانگیں سکوڑے پڑے رہو سب طرف سے لحاف کو دبائے ہوئے بس ایک کروٹ سے۔ ذرا جنبش ہوئی اور لحاف اتنا سا سرکا اور سردی کا ایک تیر سا آ کے لگا لیکن کچھ دیر بعد لحاف میں گرمی آنی شروع ہوتی ہے اس کے بعد آرام سے ٹانگیں پھیلالیں اور سوچنے کا سلسلہ شروع۔ سوچنے کے لئے باتوں کی کوئی کمی ہے؟ میں تو کہتی ہوں باتوں کی ضرورت ہی نہیں۔ بس ذرا دماغ خالی کر کے لیٹ جائیے پھر سوچنا ہی سوچنا ہے بتائیے بات کی کہاں ضرورت پڑی۔ سردیوں کی راتیں چاہے کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہوں لیکن فجر کی نمازیں جاڑوں بھر میں بس گنتی ہی کی ہوتی ہونگی اور وہ بھی جب اماں جی کو ضد ہو جائے اور وہ لحاف زبردستی کھینچ کے الگ ڈالدیں تب۔ یہ وجہ بھی نہیں ہے کہ نیند بری طرح ٹوٹتی ہے۔ بس یہی ہے کہ خیالات۔ جنہیں کیوں اس عمر میں خیالات اتنا پیچھا کرتے ہیں کہ اگر شروع رات سے لگے تو آدھی رات تک نیند کا نام ہی نہیں اور اگر مغرب کے وقت سے ہی نیند نے پیچھا کیا تو جلدی ہی پڑ کے سو گئے۔ مگر رات میں کسی خواب سے چونک کر ذرا آنکھ کھل گئی تو پھر بے تکے خیالات کا تانا بانا بنا جانے لگا۔ ابھی ایک بات یہ سوچ رہی ہوں اس میں کوئی دوسری بات نکل آئی اسپر سوچنے لگی اور یہ سلسلہ چلے جا رہا ہے اصل میں سوتے میں خواب دیکھنا اور جاگتے میں سوچنا ایک سا ہے۔ اگر سوچتے سوچتے سو گئے تو خواب بھی وہی دیکھنے لگے اور اگر خواب دیکھتے دیکھتے آنکھ کھل گئی تو اسی خواب پر سوچنے لگے۔ یہ سوچنا اور خواب دیکھنا ہی سوتے جاگتے میں ایک قسم کا ربط قائم رکھتا ہے۔

دوپہر کیا ہوا سب لوگ بیٹھے تھے۔ چچی جان بھی آئی ہوئی تھیں۔ جنہیں کیا ذکر ہو رہا تھا۔ بھابی کہنے لگیں۔

"وہ تو بچپن ہی سے اس قسم کا مادہ انسان کے اندر ہوتا ہے۔" میں ویسے ہی اپنے کام میں لگی رہی۔ بھابی کی بات پر کوئی دھیان ہی نہ دیا۔ وہ کہتی رہیں۔ "جب یہ چھوٹی تھی" بھابی کا اشارہ میری طرف تھا۔ "اس کے پاس ایک بہت خوبصورت سا بوا تھا۔ میں نے سیکڑوں خوشامدیں کیں ذرا دیکھنے کو دے دے طرح طرح سے بہلایا۔ مگر نہیں جی۔ خدا کی بندی نے ذرا جو مروت کی ہو۔ حالانکہ مجھ سے زیادہ اس زمانے میں اسے کوئی بھی عزیز نہ ہوگا۔" اب میں ذرا غور سے ان کی بات سن رہی تھی ویسے وہ واقعہ مجھے بالکل یاد نہ رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

"اسی وقت اچھن بھائی آگئے انھوں نے ویسے ہی بوے کو چھو کے دیکھا اور اس نے جھٹ ان کے آگے بڑھا دیا" اماں جی بھابی جان اور چچی جان زور زور سے ہنسنے لگے۔ بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ مجھے بری طرح شرم آنے لگی۔ میں نے ایک ترچھی نظر سے بھابی کو دیکھا اور وہاں سے اٹھ کے چلی آئی۔





سبط اختر

گردِ پسِ کارواں

"عجیب آدمی ہیں یہ بھی" مجھے کچھ غصہ سا آرہا تھا۔ وہ بات تو مجھے یاد ہی نہ رہی تھی۔ اور نہ میرے دل میں ایسا کوئی خیال ہی تھا تھوڑی دیر بعد بھابی میرے پاس آئیں میں نے ان سے کچھ برا مانتے ہوئے کہا۔

"بڑی وہ ہو تم"

"کیا بڑی وہ ہو" وہ بڑی انداز سے بولیں "میں نے کوئی جھوٹ تھوڑی کہا ہے۔ جبھی تو اب تک اچھن بھائی کا اتنا خیال رکھتی ہے"

مجھے کیا غرض تھی اچھن بھائی کا خیال رکھنے کی میرے لئے تو جیسے بھائی جان ویسے اچھن بھائی۔ ہاں یہ بات تھی کہ، اچھن بھائی ہمارے یہاں بہت کم آتے تھے اسوجہ سے میں انکی خاطر تواضع کافی کیا کرتی تھی۔ اور وہ ایک شرمیلے قسم کے۔ کیا مجال جو بغیر خاطر تواضع کے کوئی چیز چکھ بھی لیں۔ ابھی اس شب برات کو انھیں زبردستی بلوایا۔ بڑے نخرو ہے خیر آتو گئے مگر حلوہ کھانے میں تکلف۔ میں نے بھی زبردستی ان کے منہ میں ٹھونس ٹھونس کے کھلایا۔ اور پھر بھی میرے دلمیں کبھی ایسا خیال نہ آیا۔ اور میں تو یہ کہوں گی کہ بھابی اسوقت یہ بات نہ کہتیں تو کبھی میرا ذہن اس طرف جاتا ہی نہ۔ لیکن نہ جانے کیوں اسوقت بھابی کی بات ایسا کام کر گئی کہ میرے دلپر ایک بوجھ سا سوار ہو گیا۔ دن بھر تو خیر مصروفیت کی وجہ سے دھیان بٹا رہا۔ مگر رات میں جو فرصت پا کر بستر میں لیٹی تو پچھلی ساری باتیں تصویریں گھومنے لگیں اور جو خیال پہلے دل میں نہ آیا تھا۔ اب ہر بات پر جی چاہتا کہ اسوقت بھی یہی خیال دلمیں ہوتا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ہم سب لوگ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اچھن بھائی کو بڑی مشکل سے تیار کیا۔ خیر وہ بھی کھیلنے لگے۔ میں چور بن گئی تھی۔ میں بہت دیر میں کبھی چبوترے پر کبھی نیچے اور سب مجھے گھائی دے کر بھاگ جائیں اور دھیا چھولیں پھر مجھے دوبارہ چور بننا پڑے جب بہت دیر ہو گئی اور میں ہانپنے لگی تو کیا ہوا۔ اچھن بھائی کو کچھ ترس آیا اور وہ جان بوجھ کر مجھ سے چھو گئے۔ اس کے بعد ایسا ہوتا جب وہ چور ہوتے اور میں ان کے قریب بھی ہوتی تو وہ مجھے چھوڑ کے کسی اور کو چھو لیتے ایسی ہی اور بہت سی پرانی باتیں۔ اور یہ سوال خود بخود دلمیں اٹھتا کہ ایسا کیوں ہوتا تھا۔ آدھی رات تک اسی طرح ذہن بھٹکتا رہا۔ پھر تو اپنے آپ ہی دیر سے آنکھ کھلتی۔ اور اماں جی کو تو بس صلواتیں سنانے سے مطلب ہے۔

"کیا آفت کی نیند لوٹتے ہے بچی کو۔ جائے اللہ ماری بڑی نیلی ہو رہی ہے" اب انھیں کوئی بتائے کہ آدھی رات بھی سونا نصیب نہیں ہوا۔ اور بھابی کی باتیں تو دیکھو مسکراتی ہوئی قریب آئیں اور بولیں۔

"جوانی کی نیند ہے۔ کوئی مذاق ہے" بس پانی پانی ہو کر رہ گئی۔ ایک بار مصنوعی غصہ کی نظروں سے انھیں دیکھا۔ انھوں نے عجیب معنی خیز انداز سے گردن ہلا کر زیر لب کچھ کہا اور اپنے کام میں لگ گئیں

ہیں انھیں کچھ جواب تو دیتی لیکن بھئی جب دلمیں چور ہو تو ہر بات جاکے نشانے پر لگتی ہے۔ اور بھابی کو تو اس چور کا پتہ تھا۔ بلکہ بھابی نے ہی یہ چور بٹھایا تھا۔ میں نے دانتوں میں دوپٹہ کا کونہ دبالیا اور منہ پھیر کے مسکرانے لگی۔

بھابی ہمارے سگے چچا کی لڑکی ہیں۔ مجھ سے زیادہ بڑی بھی نہیں ہیں۔ یہی کوئی سال سوا سال بڑی ہونگی بچپن میں ہم دونوں ساتھ کھیلتے۔ یہ بات بھی تھی کہ انکی کوئی ہم جولی نہیں تھیں۔ سب میری ہی عمروں کی لڑکیاں تھیں میں پہلے انھیں صفیہ کہتی تھی۔ مگر اماں جی ڈانٹتی تھیں کہ تجھ سے بڑی ہے نام کیوں لیتی ہے۔ انھیں صفیہ آپا کہتے کچھ عجیب سا لگتا۔ بھئی جب ساتھ کھیلتی ہیں تو کتنی ہی بڑی ہوں۔ مگر اماں جی کی ڈانٹ۔ مجبوراً انھیں صفیہ آپا کہنے کی عادت ڈالی۔ ہم ادھر ادھر سے تلاش کرکے اپنے مطلب کی کچی اینٹیں۔ جمع کرتے۔ بڑی محنت سے انھیں توڑ کے ٹکڑے کرتے اور کنوئیں کی من پر بیٹھ کر خوب گھستے اور جب چکنی چکنی گول گول گٹیں تیار ہو جائیں تو سہ دری کے کچے فرش پر بھسکڑا مار کے بیٹھ جاتے اور گھنٹوں کھیلتے رہتے تھیں۔ حضرت بڑی بے ایمان جب ایک گٹ اٹھانے میں برابر والی گٹ ہل جاتی تو کنکھیوں سے میری طرف دیکھتیں کہ کہیں میں نے دیکھ تو نہیں لیا۔ اور جب میں گٹیں مانگتی تو صاف مکر جاتیں۔

"ہٹ۔ ہلی کہاں ہے ــ"

"اجی واہ ہل تو گئی ــ" مجھے غصہ آجاتا۔ میری باری ہی کتنی دیر کی تھی۔ مگر کیا مجال جو وہ مان جائیں۔ اور اگر میری باری ہو تو آنکھ بچاکے چپکے سے کوئی گٹ ملاکے رکھ دیتیں۔ اگر میں سمجھ نہ پاتی تو گٹ اٹھاتے میں ہل جاتی اور میری باری گئی۔ اور اگر میں نے دیکھ لیا تو بس اڑی ہوئی ہیں بے ایمانی پر۔

"چلو ہٹو بے ایمنٹی خور کہیں کی" میرے آگ لگ جاتی اور میں الگ جاکے پڑ رہتی۔ مگر تھوڑی ہی دیر گزرنے پاتی تھی کہ وہ گڑیاں نکال کے بیٹھ جاتیں۔ میرا بھی جی للچا جاتا اور ہم کارنس کے نیچے والے بڑے سے طاق کے آگے بیٹھ کے گڑیاں کھیلنے لگتے۔ ہم نے کتنی ہی گڑیوں کے بیاہ کئے۔ مگر انھوں نے ہمیشہ اپنا ہی گڈا کیا اسی بہانے میری جنے کتنی گڑیوں کو بیاہ کے لے گئیں۔ کبھی کبھی جب زیادہ لڑکیاں جمع ہو جائیں تو ہم لوگ دلہن دلہن کھیلتے ہیں، چپکے چپکے بڑے کمرہ میں جاتی اور جست کے صندوق سے کامدانی کا سرخ ریشمی دوپٹہ جمپر کے اندر چھپاکے لے آتی اور کھیل شروع ہو جاتا۔ صفیہ آپا کو دلہن بننے کا بڑا شوق تھا۔ جہاں کسی کو دلہن بنانے کا ذکر آیا اور صفیہ آپا ہر بار خود دلہن بننے کو تیار۔ میرا جی جلتا تھا انکی اس بے حیائی پر۔ بھئی کوئی دوسرا بھی اگر دلہن بننے کو کہے تو ذرا شرما کے دلہن بنو۔ یہ کیا کہ اپنے آپ ہی ٹانگ اڑائے دے رہی ہیں۔ میں نے جو ایک بار خود دلہن بننے کی خواہش ظاہر کی تو اماں جی سے شکایت کرنے کی دھمکی دینے لگیں۔ میں نے گھنٹوں منت سماجت کی تب کہیں جاکے مانیں۔

نو دس برس کی عمر تک بغیر برقعہ کے گھر سے اکیلی نکل آتی تھیں۔ ذرا چچی جان کی آنکھ بچی صفیہ آپا سڑک کے باہر اور چلی آرہی ہیں منہ اٹھائے ہمارے یہاں۔ اماں جی اکثر چچی جان سے کہتی بھی تھیں۔

"اے بو بو کیا آفت ہے۔ ڈھو کی ڈھو ہو گئی صفیہ ابھی تک پردہ نا کرایا تم نے"

"پھرنے دو کل بستی کو لونڈ کی طرح۔ کسی طور پر ٹکتا ہی نا گھر میں" چچی جان جواب دیدیتیں۔ اور بات آئی گئی ہو جاتی۔ میں حالانکہ عمر اور ڈیل دونوں میں ان سے بہت چھوٹی تھی لیکن سات سال کی عمر سے میرا گھر سے نکلنا بند کر دیا گیا تھا۔ میں ہی کیا ہمارے گھر میں سب ہی پدی ایسے تھے۔ ذرا ذرا سے گنگوتے۔ ابا جی کا ڈیل بہت کم تھا انھیں کا اثر اولاد پر پڑا تھا۔ بھائی جان کو تو بہت دنوں تک انکے دوست ٹوئیاں کہتے تھے۔ میں بھی سات سال کی عمر میں پانچ سال کی لگتی تھی۔ برقعہ اوڑھ کے جب چچا کے گھر جاتی تھی تو سب ہنستے تھے۔ ہمارے چچا کے یہاں۔ چچا خود لمبے چوڑے تگی کے تلی تھے۔ بالکل جاٹ معلوم ہوتے تھے اچھن بھائی خیر چوڑے تو خاک بھی نہ تھے بس لمبو سے ڈول سے تھے اور اس پر علیگڑھ تراش کا چھوٹی مہریوں کا پائجامہ پہننے کا شوق۔ معلوم ہوتا تھا بانس کے ڈنڈوں پر کپڑا منڈھ دیا گیا ہو۔ جسم پہ بوٹی مدتوں نہ چڑھی۔ سوکھڑی لیسے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ صفیہ آپا کے حصہ کی حیا شرم اچھن بھائی کے حصہ میں آگئی تھی اور اچھن بھائی کے حصہ کا سارا جسم صفیہ آپا کو مل گیا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ وہ جتنی موٹی تازی تھیں اتنی ہی لمبی تھیں۔ مجھ سے تو چار پانچ سال بڑی معلوم ہوتی تھیں خوب بھرا بھرا جسم۔ موٹے تندرست ہاتھ پیر۔ لٹکے ہوئے گال۔ جب وہ چھوٹی سی تھیں تو بھائی جان اکثر ان کے گال کا گوشت چٹکی میں لیتے ہوئے چچی جان سے کہتے تھے۔

"بس ابکی بقر عید کے لئے بالکل ــ"

"کوئی دماغ خراب ہوا ہے لڑکے" اماں جی بھائی جان کو ذرا گھور کے دیکھتیں "کیوں خدا نہ کرے....

اور صفیہ آپا اپنا گال پکڑے بہت دیر تک بیٹھی رہتیں۔ انکے گال پر خون سا چھلک آتا تھا۔ اور بھائی جان کی انگلیوں کے سرخ سرخ نشان بہت دیر تک انکے گال پہ بنے رہتے تھے۔

چودہ پندرہ سال کی عمر تک تو خیر صفیہ آپا کوئی غیر معمولی رفتار سے آگے نہیں بڑھیں۔ لیکن اس کے بعد تو ایک سال میں سٹا کا بھر کے وہ جا نکلیں۔ ایک دم سے پوری عورت معلوم ہونے لگیں۔ بڑے مزے کی ایک بات ہوئی۔ بھائی جان علیگڑھ میں تھے جب وہ بی اے کا امتحان دے کے آئے تو صفیہ آپا ہمارے ہی یہاں تھیں دروازے پر ہی سے بھائی جان کی نظر جب ان پر پڑی تو سمجھے کوئی عورت ہے وہ ہٹ کے کواڑ کی آڑ میں ہو گئے اور مجھے آواز دینے لگے۔ میں بھی کہوں کہ یہ کون ہے جو اس بے تکلفی سے مجھے پکار رہا ہے۔ بعد میں تو ہم لوگ خوب ہنسے اور صفیہ آپا تو بس کٹی جا رہی تھیں مگر صفیہ آپا کی شرم کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ بھائی جان جب علیگڑھ میں تھے تو انکی شادی کی فکر کی جانے لگی تھی۔ بھائی جان سے رائے مانگی گئی تو انھوں نے صاف صاف لکھدیا کہ شادی کرونگا تو صفیہ سے ورنہ کرونگا نہیں تب میرے اوپر سارا راز کھلا۔ جب بھائی جان یہیں پڑھا کرتے تھے تو اکثر صفیہ آپا انکی غیر موجودگی میں کسی بہانے سے اٹھ کے چلی جاتی تھیں اور بھائی جان کے کمرے میں جنے کیا ٹٹولا کرتی تھیں۔ یا اکثر کبھی جب بھائی جان اور وہ قریب قریب بیٹھے ہوتے تو ان میں نہ معلوم کیا کیا باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ جب میں وہاں جاتی تو دونوں ایک دم سے گم ہو جاتے۔ ایک عجیب سی خاموشی اور صفیہ آپا کا چہرہ سرخ ہوتا۔ انکے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ہوتی اور بھائی جان بے مقصد کے مجھ سے کوئی بات پوچھنے لگتے

اماں جی نے بھائی جان کی شادی کا کسی سے تذکرہ نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ چچی جان سے بھی۔ میں نے صفیہ آپا سے مذاق میں بھائی جان کے خط والی بات کہدی تھی۔ لیکن وہ بے حیا راسی طرح ہمارے یہاں، آتی رہیں۔ نہ کسی سے شرمانا نہ کچھ۔ میں نے جب ایک بار انھیں ٹوکا تو پٹ جواب دیدیا۔

"چل ہٹ۔ ابھی کوئی منگنی تھوڑی ہوئی ہے"

اے لو۔ مجھے ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔ یا صفیہ آپا ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ کیونکہ جب منگنی ہو گئی تو وہ ایسی بدلیں کہ کیا کوئی بدلے گا۔ ہمارے گھر کا آنا جانا بند ہوا ہی۔ ہمارے گھر کے ہر فرد سے چھپنے لگیں۔ یہاں تک کہ میں بھی ان کے یہاں جاتی تو کمرے میں منہ لپیٹ کے پڑ جاتیں۔ مجھے بڑا برا لگتا۔

"واہ یہ بھی کوئی بات ہے" ایک بار میں نے زبردستی انھیں اٹھاکے ان کا منہ کھول دیا۔ مگر وہ تو شرم سے دوہری ہوئی جاتی تھیں۔ کتنی اچھی لگتی تھیں وہ شرماتی ہوئی۔ انکی لانبی لانبی پلکیں ان کے رخسار وں پر ایک زاویہ سے سایہ کئے ہوئے۔ کوئی دیکھتا تو حیرت کرتا کہ یہ ابھی کچھ دن پہلے والی صفیہ آپا ہیں۔ چچی جان کہتی تھیں کہ وہ اسوقت بھی ایسی ہی تیز طرار تھیں۔ صرف میرے سامنے جنیں کیوں اتنی شرماتی تھیں۔ میں نے کچھ ہی دن میں پھر انھیں ہموار کر لیا۔ مجھے اب انکے اوپر بڑا لاڈ آنے لگا تھا۔ ویسے میں نے ایک آدھ بار سبکے سامنے انھیں بھابی کہا تو وہ پھر شرمانے لگیں۔ لیکن میں اکیلے میں انھیں ہمیشہ بھابی ہی کہنے لگی تھی اور وہ شرماتی بھی نہیں تھیں شاید ایسا کہنا انھیں بھی اچھا ہی لگتا تھا۔ کیوں کہ جب میں انھیں بھابی کہکے کسی بات کو کہتی تو وہ فوراً مان جاتی تھیں۔ ورنہ صفیہ آپا اور اتنی آسانی سے بات مان جائیں۔ وہ ہر کام میری مرضی کے مطابق کرتیں۔ مجھ سے رائے لیتیں۔ خواہ جمپر کے گلے ہوں۔ پائجاموں کی

گلکیں ہوں یا تکیہ کے غلافوں کے پھول ہوں۔ شادی کے دنوں میں بھی میں اپنے گھر میں نہ ٹکتی تھی۔ اماں جی لاکھ کہتیں۔

" اپنے گھر کے کام کے لئے کون سے نوکر چاکر لگا دیئے ہیں۔ جو وہاں کے کام پہ جٹی ہوئی ہے "۔ لیکن میں چچا کے یہاں کا کام خوب کرتی تھی۔ اصل میں بھابی اکیلی تھیں۔ میں سب سہیلیوں کو بھی انھیں کے ہاں لے جاتی تھی اور انکے یہاں خوب گیت ہوتے تھے۔ اماں جی اور بھائی جان کو بہت برا لگتا تھا کہ اپنے یہاں شادی بالکل معلوم ہی نہ ہوتی تھی نہ گیت۔ نہ کوئی رونق۔

شادی کے کچھ دن بعد تک تو بھابی کے بہت نخرے رہے بغیر میرے سہارے کے ہلتی ہی نہ تھیں۔ میں ہی نوالے بنا بنا کے ٹھنساتی تھی۔ لیکن اس کے بعد میں نے کہہ دیا تھا "بھیا تمہارا گھر ہے۔ خود اٹھو۔ اپنے کام کرو۔ میں کوئی فالتو تھوڑی ہوں "۔ لیکن میں نے یہ بھی پیار ہی میں کہا تھا۔ کیونکہ اس کے بعد بھی وہ جب کوئی کام کرنے کو اٹھتیں تو میں جھٹ انھیں روک کے خود انکا کام کرتی تھی۔ مجھے بڑا اچھا لگتا تھا ان کا کام کرتے ہوئے۔ بھئی لاکھ کوئی ایک ہی گھر کی کھیلی اور رہی ہوئی لڑکی ہو جب نئی بیاہی دلہن ہوتی ہے تو شرم تو آتی ہے ہی۔ پھر کچھ دن لگتے ہیں جھجک ختم ہونے میں بھابی بھی آہستہ آہستہ ہمارے گھر کے ماحول میں ڈھل گئیں پہلے میں اکیلی گھر کا کام کرتی تھی اب ہر کام میں بھابی میرے ساتھ لگی ہوتیں۔ اماں جی کو ہم لوگوں نے بالکل چھٹی دے دی تھی۔

بھابی میں اور مجھ میں ہنسی مذاق پہلے ہی بہت ہوتا تھا لیکن اب رشتہ ایسا ہوگیا تھا کہ چھیڑ چھاڑ میں اضافہ ہوتا گیا بھابی کو چھیڑنے میں مجھے بڑا مزہ آتا۔ شروع شروع میں تو وہ خاموشی سے ہر بات سنتی رہیں۔ شاید سوچتی ہونگی کہ میرا وقت آنے دو۔ اور اب ان کا وقت آگیا۔ ایسی میرے پیچھے لگیں کہ بس کیا بتاؤں ہر بات میں اچھن بھائی کو ٹھونس دیتیں۔

" اچھن بھائی کئی دن سے نہیں آئے "۔ وہ بیٹھے بیٹھے میری طرف دیکھتے ہوئے کہتیں۔ میں کوئی بات کہتی ہوئی ہوتی تو وہ میرے حلق میں ہی اٹک کر رہ جاتی۔ کوئی جواب بن نہ پڑتا دوسرے تیسرے روز بلا وجہ میرے نام سے اچھن بھائی کو بلوا لیتیں اور زبردستی مجھے ان کے پاس بٹھائے رکھتیں۔ میں بڑی مصیبت میں۔ شرمانے کا کوئی موقع نہیں۔ بھئی چچا کے لڑکے ہی تو ہیں جیسے پہلے تھے ویسے ہی اب۔ اور نہ شرماؤں تو کیونکر۔ بھابی نے ایک عجیب سا احساس جو دل میں پیدا کر دیا تھا۔ خود بخود اچھن بھائی کے سامنے نظریں جھک جاتی تھیں۔ جب اماں جی قریب میں نہ ہوتیں تو بھابی کوئی اچھی سی چیز اچھن بھائی کو دیتیں۔

" اچھن بھائی یہ اس نے بنائی ہے تمہارے لئے "۔ میرا عجیب عالم۔ کاٹو تو خون نہیں۔ بولوں کیا۔ اور اب تو ایسا ہوگیا تھا کہ جب اچھن بھائی کو آئے ہوئے کئی دن ہو جاتے تو میرا خود انھیں دیکھنے کو جی چاہنے لگتا تھا۔ شروع میں تو میں انھیں دیکھنے کے بہانے تلاش کر لیا کرتی۔ چچا کے یہاں جاتے ہوئے تو جانے کیوں بڑی شرم سی آنے لگی تھی۔ میں ایسا کوئی کام نکال دیتی کہ اماں جی یا بھابی خود ہی اچھن بھائی کو بلا لیتیں رفتہ رفتہ بھابی کو میرے دل کی حالت کا اندازہ ہوتا گیا۔ انھیں، محسوس ہو جاتا کہ میں اچھن بھائی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ جہاں میں ذرا اداس ہوئی اور انھوں نے اچھن بھائی کو بلا بھیجا۔ اور آخر میں بھابی بالکل میری رازدار ہو گئیں۔ خود تو اچھن بھائی سے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ میں ہر بات بھابی کو بتا دیتی تھی۔ اور اچھن بھائی بھی بھابی ہی کے ذریعے مجھ سے بات کرتے تھے اصل میں بھابی نے اچھن بھائی پر بھی وہی طریقہ استعمال کیا تھا جو میرے اوپر کیا تھا۔ شاید اچھن بھائی نے خود ہی بھابی سے کہا ہو کیونکہ بھابی یہی کہتی ہیں کہ بہت دن ہوئے اچھن بھائی نے خود ہی بھابی سے کہا تھا۔ ویسے مجھے بھابی کی بات کا یقین نہیں ہے۔ بھلا اچھن بھائی جو اتنے شرمیلے ہیں کہ لڑکیوں کو بھی مات کر دیا ہے وہ خود کہیں گے۔ توبہ توبہ۔

جب زمینداری ختم ہوئی ہے تو لوگوں کے ہاں فاقوں تک کی نوبت آگئی تھی۔ ہمارا اور چچا کا گھر بھی زمینوں کی آمدنی کے سہارے ہی چلتا تھا۔ لیکن ہم پر اس کا زیادہ اثر نہیں پڑا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ اول تو گھر کا کوئی زیادہ خرچ نہ تھا دونوں گھروں میں گنتی کے افراد تھے۔ اور آمدنی بھی ایسی کوئی خاص نہ تھی۔ وصول ہونے کے بعد دونوں گھروں کے برابر برابر حصے لگتے تھے تو اتنا مل جاتا تھا کہ اچھے خوشحال طریقہ سے زندگی گذرتی تھی۔ لوگوں میں حسد کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ تنگی کبھی نہ ہوئی۔ اور نہ کبھی زیادہ بچا ہی۔ دوسرے یہ کہ زمینداری ختم ہو جانے سے پہلے ہی بھائی جان اور اچھن بھائی تعلیم ختم کر کے اچھی خاصی جگہوں پر ملازم ہو گئے تھے۔ جو آمدنی زمینداری کے زمانے میں ہوتی تھی۔ قریب قریب اتنی ہی اب بھی ہوتی تھی۔ اور زمینداری کی آس ہی کیا تھی۔ کسانوں نے آخر میں دینا ہی بند کر دیا تھا۔ بلا وجہ جان کا خطرہ مول لے کے ابا جی اور چچا جان گاؤں جاتے تھے اور منہ لٹکائے آجاتے تھے۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ تو اثر پڑا ہی۔ پہلے کسی نہ کسی بہانے سے سال میں دو تین اچھی تقریبیں ہو ہی جاتی تھیں۔ اور دونوں گھروں میں خوب جی کھول کے مہانداری ہوتی تھی۔ میری روزہ کشائی ہی میں ایک ہزار سے کیا کم خرچ ہوا ہوگا۔ اسی طرح ہر سال بھائی جان اور اچھن بھائی کی کامیابی پر خوب شاندار دعوتیں دیجاتی تھیں۔ اور بھائی جان کی شادی۔ یاد رہے گا شہر والوں کو بھی کہ ہاں کبھی کوئی شادی دیکھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آئندہ تقریب نہ کرنے کی قسم کھا رہے ہوں۔ جو کچھ حسرتیں نکالنی ہوں نکال لو۔ اصل میں وجہ یہ تھی کہ کبھی کاشتکاروں پر سختی نہیں کی گئی۔ جتنا وہ دیدیتے تھے وہی کافی ہوتا تھا کوئی ہوس تھوڑا ہی تھی۔ بلا وجہ پھر انھیں پریشان کر کے کیا ملتا۔ اسی لئے خوشیوں کے موقعوں پر ایک بار، کاشتکاروں کو آگاہ کر دیا جاتا۔ اور بس منوں اناج کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ مگر اب ایسا ہوگیا تھا کہ دل چاہے کی خوشیاں تو دور رہیں تیج تہوار بھی آنے تو بہت پہلے سے فکر شروع ہو جاتی تھی۔ تقریبوں کے بارے میں تو سوچتے ہوئے بھی بڑا ڈر لگنے لگا تھا۔ کہاں سے آتا اتنا روپیہ۔ بندھی ٹکی تنخواہوں میں کوئی حسرتیں تھوڑی نکالی جا سکتی تھیں۔ اور چپ چاپ کوئی کام کرنے میں بڑا دل دکھتا ہے۔ لوگوں کی نظریں بھی تو اٹھنے لگتی ہیں طرح طرح کی باتیں ہوتی ہیں اور تیر کی طرح جا کے دل پر لگتی ہیں۔

اچھن بھائی سے میری منگنی ہو گئی تھی۔ منگنی تو خیر چپ چاپ ہو گئی۔ ہاں۔ اب منگنی کوئی کہاں دھوم دھڑکے سے کرتا ہے۔ مگر شادی تو ایسے نہیں ہو سکتی تھی اس میں تو دو چار ہزار کا سوال ہوتا ہی ہے۔ جوان لڑکی کو زیادہ دن گھر میں بٹھائے رکھنا ٹھیک بھی نہیں ہے۔ اس لئے شادی ٹالی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ مگر شادی ٹل رہی تھی اور دونوں طرف سے ٹل رہی تھی۔ ابا جی ہی کچھ کہتے تھے اور نہ چچا ہی۔ آخر لڑکے والوں کو بھی خرچ کرنا پڑتا ہی ہے۔ بلکہ انھیں زیادہ ہی کرنا ہوتا ہے۔ اور حالات دونوں گھروں کے ایک سے۔

زمینداری بانڈ ملے تھے وہ کل ساڑھے سات ہزار کے تھے۔ اب یا تو کوئی برسوں انتظار کرے قسطیں وصول کرنے کے لئے یا پھر غرض ہو تو بھناؤ کوڑیوں کے مول۔ بڑی مشکل سے کوئی چار ہزار ملے اور دونوں گھروں کا خرچ۔ سچ بات تو یہ ہے کہ چچا کا بھی برابر کا حق ہوتا۔ مگر روپیہ ہی کتنا تھا جس میں حصے بخرے لگتے۔ پھر غرض میں تو سب ہی اندھے ہو جاتے ہیں۔ ابا جی کچھ دن تک چچا سے بہانے بناتے رہے۔

" ابھی بھنے ہی نہیں "۔ چچا دو ایک روز انتظار کرتے۔ وہ بھی کوئی اتنے سیدھے تھوڑی تھے۔ سب سمجھتے تھے۔ ملنے جلنے میں وہ پہلے والا طریقہ نہیں رہا۔ پہلے چچا دن میں دو ایک بار ہمارے یہاں آتے تھے۔ ابا جی کئی کئی دفعہ جایا کرتے تھے مگر اب چچا تین چار روز میں کبھی آجاتے تھے اور اس میں بھی کسی نہ کسی طرح وہ بانڈوں والا ذکر چھیڑ دیتے " سرفراز کے بانڈ تو بھن گئے "۔ اور ابا جی کسی بھی طرح ٹال کے کوئی اور تذکرہ نکال دیتے۔ ابا جی تو اب چچا کے گھر کا بالکل رخ بھی نہ کرتے تھے چچا کا گھر ہی کیا۔ اب وہ نکلتے ہی نہ تھے۔ دن بھر کمرے میں لیٹے حقہ پیتے رہتے۔

کتنا خوفناک سکوت ہو گیا تھا ماحول میں۔ بڑوں کی باتیں پوری طرح تو ہمارے سمجھ میں نہ آتی تھیں لیکن اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی غیر معمولی بات ہونے والی ہے۔ عجیب سی ویرانی چہروں پر نظر آتی۔ بھابی اس بار جو چار روز اپنے گھر میں رہ کے آئیں تو بدلی ہوئی سی نظر آنے لگیں۔ انکے چہرہ کی وہ شادابی نہ جانے

کہاں کھو گئی تھی۔ ہر وقت اداس اداس پریشان ڈری ہوئی سی۔ اب مجھے اور وحشت ہونے لگی۔ سوچتی تھی۔ بھابی سے معلوم کروں۔ انھیں شاید کچھ معلوم ہو۔ لیکن کچھ بات کہنے کی ہمت نہ ہوتی۔ خدا جانے کیا بات ہو۔ ایک عجیب سا انقلاب اپنے مزاج میں محسوس کرنے لگی تھی۔ کوئی بات ہی منہ سے نہ نکلتی۔ ایسا معلوم ہوتا ابھی کچھ بولی تو ایک چیخ سی بلند ہو جائے گی جو ہونٹوں سے نکل کر ساری فضا میں پھیل جائے گی کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولتی مگر فوراً ہی پوری قوت لگا کے آواز روک لیتی۔ جب بہت دیر ہو جاتی وقت گذرتا چلا جاتا۔ تو بڑی کوششوں کے بعد زبان کھلتی۔

"آج کیا پکے گا ۔۔۔؟" اور اتنا کہتے ہوئے ڈھیروں تھوک حلق میں اٹک جاتا۔ پورے گھر کا ایک عجیب عالم ہو گیا تھا۔ ایک سنسنی سی پھیل گئی تھی۔ جیسے دھماکے کے فلیتے میں چنگاری لگ چکی ہو اور سب اسکے پھٹنے کے انتظار میں کانوں پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہوں۔ اب پھٹا ۔ اب پھٹا۔ جنیں کیسی آواز ہو۔

منگنی کے بعد بھی اچھن بھائی اکثر آیا کرتے تھے۔ اتنا تھا کہ دروازے پر آ کر آواز دیتے تھے۔ اور میں فوراً کوٹھری میں چلی جاتی تھی۔ مگر ادھر بدلے ہوئے حالات نے انکا آنا بھی بند کر دیا تھا۔ یا اللہ انکی آواز بھی نہیں سن سکتی تھی۔ بھابی کو بھی جنیں کیا ہو گیا تھا کہ خود بھی انھیں نہیں بلواتی تھیں۔ میرا کچھ کہنے کا موقعہ تھوڑی رہ گیا تھا جب بہت جی گھبراتا تو بھابی کے پاس جا کے بیٹھتی۔ شاید وہی کوئی دل بہلانے کی بات کریں۔ مگر وہاں بھی وہی سکوت۔ دم گھٹنے لگا تھا اس خاموشی میں۔ بھئی کچھ ہونا چاہیئے۔ کچھ بھی ہو۔ یہ وقفہ بڑی الجھن کا ہے۔

ایک روز سہ پہر کو چچا آئے کئی روز میں آئے تھے اور انکے آنے کی امید بھی تھی۔ مگر ان کے تیور کچھ بدلے ہوئے تھے۔ میں کھٹک گئی۔ ابا جی چوکی پر بیٹھے ظہر کی نماز کے لئے وضو کر رہے تھے۔ ایک لمحہ کے لئے انکے چہرہ کا رنگ بھی بدلا۔ نظریں چچا کے چہرے پر جم گئیں۔ کلی کے لئے چلو میں جو پانی لیا تھا وہ قطرہ قطرہ ہو کے ٹپکنے لگا۔ لیکن فوراً ہی جیسے چونک گئے اور دوبارہ لوٹے میں سے پانی انڈیلتے ہوئے اماں جی کو آواز دی۔

"اجی وہ ذرا نکال لائیو ۔۔۔" چچا صحن میں پلنگ پر بیٹھ گئے۔ انکے چہرہ پر قدرے اطمینان آگیا تھا۔ اماں جی چھالیا تمباکو کا بٹوہ تلاش کر رہی تھیں۔ فوراً اسے چھوڑ کر کمرے میں چلی گئیں اور تھوڑی ہی دیر میں ہاتھ میں نوٹوں کا ایک بنڈل لئے باہر نکلیں اور ایک بے پرواہی کے انداز سے چچا کے آگے ڈال دیا چچا نے جلدی جلدی نوٹ گنے۔ ایک ہزار تھے۔

"ایک ہزار ۔۔۔!" چچا نے ایسے کہا جیسے روپیہ لے نہ رہے ہوں۔ بلکہ دینے پڑ رہے ہوں۔

"ہاں اور کیا" ابا جی ہاتھوں کا پانی جھٹکتے ہوئے بولے انکا لہجہ سنجیدہ تھا۔ چچا خاموش ہو گئے۔ چھوٹے تھے۔ خاموش نہ ہوتے تو کیا کرتے۔ لیکن روپے میں بڑی طاقت ہے چچا کو کل روپے کا پتہ تو تھا ہی ان کے دل میں بال پڑ گیا ابا جی کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ لیکن ہاتھ آئی ہوئی دولت کون چھوڑ دیتا ہے۔ رنجش بڑھتی گئی کچھ دن تک کچھے کھچے ملے مگر دل میلے ہوں تو سب رشتے وشتے دھندلے پڑ جاتے ہیں۔ ملنا جلنا بند ہو گیا۔ چچا نے اٹھنے بیٹھنے والوں میں کچھ ذکر کیا اور بات سارے میں پھیل گئی۔ ابا نے اپنے ملنے والوں میں چچا کی برائیاں بیان کیں اور انھیں خوب بدنام کیا۔

اب گھر کا ماحول تھوڑا اور بدل گیا۔ وہ خوفناک سکوت ایک چڑچڑے پن میں تبدیل ہو گیا۔ ذرا ذرا سی بات پر غصہ آجاتا۔ بھابی نے ایک روز کے لئے اپنے گھر جانے کی خواہش ظاہر کی اور اماں جی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"کون سے ضروری مشورے کرنے ہیں ماں باپ سے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے۔" بھابی کا چہرہ اتر گیا چپ چاپ جا کے کمرہ میں پڑ گئیں۔ میں تھکی تھکی نظروں سے سب کچھ دیکھتی رہی۔ میرا دل بھر آیا۔ بھابی کے کمرہ میں گئی۔ بھابی نے مجھے دیکھا۔ میں نے بھابی کو۔ ان کے گال آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے۔

"بھابی۔!" میرے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا اور میں بھابی سے لپٹ گئی۔ ہم دونوں بہت دیر تک روتے رہے۔ اور اب روز ایسا ہی ہوتا۔ اماں جی بھابی سے کوئی بات کرتیں تو بہت جھنجلا کے کرتیں۔ پہلے ایسا ہوتا تھا کہ اماں جی کو کوئی کام کرانا ہوتا تو مجھ سے کہہ دیتی تھیں یہ اور بات تھی کہ بھابی خود میرے ساتھ مل کر وہ کام کرتیں لیکن اب اماں جی مجھے بلا کر پاس بٹھا لیتیں اور بہت غصے کے انداز میں بھابی سے کہتیں۔

"اری صفیہ۔ آج جھاڑو نہ لگائی صحن میں ۔۔۔"

بھابی بے چاری جلدی جلدی جھاڑو دینے لگتیں۔ میں اگر ان سے پہلے اٹھتی تو اماں جی مجھے کوئی اور غیر ضروری کام کرنے کو بتا دیتیں۔ میں پوری طرح محسوس کر رہی تھی کہ اماں جی کا رویہ بھابی کے ساتھ بہت سخت ہو گیا ہے ایک بار میں نے چپکے سے بھابی کی طرف سے کچھ کہنا چاہا تو اماں جی نے مجھے سختی سے روک دیا۔

"خبردار جو تم اسکی حمایت میں بولیں" میری زبان بند ہو گئی۔ یا اللہ اتنی مجبوری۔! یہ کیا ہوتا جا رہا ہے۔ ایک معمولی سی بات نے حالات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اب قصوروار کسے کہا جائے۔ بھئی شادی کرنی تھی خاموشی سے کر دیتے تو کیا ہو جاتا۔ ابا جی کو بھی ایسی ضد پڑی تھی۔ ارے چھوٹے تھے۔ ان کا دل رکھ لیا ہوتا۔ اور تمہاری بات بھی تو ان سے اڑی تھی۔ مگر اپنی ناک جو کٹتی۔ بہر حال بات بگڑنی تھی۔ کچھ دن تک چچا نے دوسرے لوگوں کے ذریعہ ابا جی سے باقی روپے کا مطالبہ کرایا۔ مگر ابا جی کا فیصلہ ۔۔۔؟ پہاڑ ہل جائے۔ مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتے تھے۔ چچا نے غصہ میں منگنی توڑ دی۔ ویسے چاہے ابا جی خود ہی منگنی توڑ دیتے۔ اور وہ اماں جی سے چپکے چپکے مشورے کیا ہی کرتے تھے۔ مگر چچا کے منگنی توڑنے سے بس آگ ہی لگ گئی۔ دن بھر ادھر ادھر چکر کاٹتے رہے بھائی جان کو بار بار بلا کے سرگوشیاں کرتے۔ مگر بھائی جان کچے دل کے انھیں کہاں تاب۔ خوب روئے۔ مگر ابا جی کی نیچی ہوئی ناک کے آگے بھائی جان کا دل بہت سستا تھا رات کے ایک بجے تک انھیں بہلا پھسلا کے رام کر لیا اور صبح اٹھ کے پہلا کام یہ کیا کہ بھائی جان سے طلاق نامہ لکھوا کے بھابی کے ہاتھ میں تھما دیا اور بس قصہ ختم۔

یہ سارا عرصہ میرے اور بھابی کے اوپر بڑا سخت گذرا۔ ہم دونوں جیسے چکی میں پسے جا رہے تھے۔ چکی کے پاٹوں کی طرح ہر وقت کانوں میں گھوں گھوں کی آوازیں گونجتیں۔ خاموشی سے سب کچھ دیکھتے رہتے اور آنے والے حالات کا انتظار کرتے۔ اور ایسا ہو گیا تھا جیسے ہم لوگ ہر انقلاب دیکھنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ بڑی سے بڑی بات بھی غیر متوقع نہ معلوم ہوتی تھی۔ جیسے پہلے ہی سے غیر شعوری طور پر دل میں یہ بات پیدا ہو گئی تھی کہ یہ سب ہوگا۔ اور وہی ہوا۔ ہم لوگوں پر کوئی غیر معمولی اثر نہیں ہوا۔ میں اور بھابی ملکے پہلے بھی رو تے تھے۔ اب بھابی طلاق کے بعد جب گھر جا رہی تھیں تب بھی ملکے روئی۔ اور اماں جی نے زبردستی مجھے کھینچ کے بھابی کو باہر دھکیل دیا۔ یہ کوئی خاص بات نہ معلوم ہوئی۔ اسکی بھی پہلے سے امید تھی۔

اور اب جب رات میں بستر میں لیٹتی ہوں تو، سیکڑوں خیال آتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا ۔۔۔ دوسرے کے بعد تیسرا۔ اور یہ سلسلہ چلے جاتا ہے۔ دل کے اوپر کوئی غیر معمولی نقش چھوڑے بغیر۔

کلثوم کی اماں کہہ رہی تھیں کہ بھابی کے لڑکا ہوا ہے۔ اچھا خوبصورت سا لڑکا ہوگا۔ بالکل بھائی جان کے اوپر گیا ہوگا۔ ٹھگنا سا ۔۔۔ ولی محمد کے اولاد نہیں ہوتی سنا ہے وہ دوسرا بیاہ کرنے والا ہے۔ آجکل چچا کا اسکے یہاں بہت آنا جانا ہے۔ اچھن بھائی کی ترقی ہو گئی ہے اور شام کو وہ تحصیلدار صاحب کی لڑکی کو ٹیوشن پڑھانے بھی جانے لگے ہیں۔ بھائی جان کہہ رہے تھے کہ وہ ایک لڑکی سے عدالت میں قانونی شادی کرنے والے ہیں ۔۔۔ جب ان خیالات سے پیچھا چھوٹتا ہے تو سوتے میں عجیب سے خواب دکھائی دیتے ہیں۔

دور جیسے بہت سے لوگ آہستہ آہستہ جا رہے ہوں۔ خوش خوش۔ مگن مگن۔ ایک دم سے سب کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اور تیز ۔۔۔ اور تیز۔ پھر اتنی گرد اٹھتی اتنی گرد اٹھتی کہ لوگ دکھائی نہیں دیتے۔ یا اللہ ہر طرف گرد ہی گرد۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس گرد کے طوفان میں میں اکیلی بھٹکتی پھر رہی ہوں۔ کبھی ادھر کبھی ادھر۔ کہیں راستہ نہیں ملتا۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ صرف گرد ہی گرد۔

جب آنکھ کھلتی ہے تو صبح ہو نیوالی ہوتی ہے اور میں فجر کی نماز پڑھنے کھڑی ہو جاتی ہوں۔

ذکی عباس





یہ نکتہ اب کسی تفصیلی بحث کا طلب گار اور حاجت مند نہیں ہے کہ ادب زندگی کا ترجمان عکاس اور نباض ہے۔ ادب کی بنیاد زندگی اور صرف زندگی ہے زندگی کے سب سے بڑے محرک اور داعی عوام الناس ہیں۔ ان ہی کیلئے ادب تخلیق کیا جاتا ہے۔ ان سے سیکھنا اور انہیں سکھانا ہی ادب کے خالق کا مقصد خاص ہوتا ہے انہیں اپنے "دل کی آنکھ" سے دیکھنا اور اپنے "دل کی آنکھ" انہیں دکھانا ہی فنکار کا نصب العین ہوتا ہے مختصر یہ کہ عوام ادب کا محور مرکز موضوع و مواد سب ہی کچھ ہیں۔

اب جبکہ ادب و عوام کا رشتہ اتنا ہمہ گیر اور عمیق ہے تو پھر آخر ہمارے کارکنان ادب اس بنیادی حقیقت کو کیوں فراموش کر دیتے ہیں کہ عوام اور ادب کو عملی طور پر بھی ایک دوسرے سے وابستہ کرنا چاہیئے؟ اول تو اس مہاجنی نظام معاشرت میں عوام الناس کی ایک واضح ترین اکثریت کیلئے مخصوص معاشی اور سیاسی مقاصد کے لئے علم و ادب کو ایک طرح سے شجر ممنوعہ بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ پھر بھی گنتی کے جو چند "سورما" کسی نہ کسی طرح جہالت اور لاعلمی کے زہریلے ناگوں کو اپنے شوق اور ہمت کے ہتھیاروں سے قتل کر کے تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر لیتے ہیں ان میں سے بھی بہت سے نصابی تکنیکی اور پیشہ ورانہ تربیت کی بدولت ادبی ذوق سے محروم ہو جاتے ہیں یا پھر مغربی ثقافت و تہذیب کی شراب پی کر چھچھورپن اور مصلحت میں آلودہ ہو جاتے ہیں ان ساری کٹھنائیوں اور پیچیدگیوں سے گذرنے کے بعد باقی رہنے والے ادب کے پرستاروں یا سرپرستوں کی تعداد کا اندازہ اب آپ خود ہی لگا سکتے ہیں مجھے اعداد و شمار پیش کرنے کی ضرورت نہیں!

یہ ہے وہ روح فرسا پس منظر جس میں ادب اور عوام کی باہمی وابستگی اور رشتے کے اہم مسئلے پر ہمیں سوچنا ہے۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ صرف چند گنے چنے اشاعت گھروں کے علاوہ اردو ادب کے باقی تمام مکتبے اس مسئلے کے حل سے اغماض برت رہے ہیں سچ تو یہ ہے کہ دوسری تمام مقدس، مفید اور تعمیری چیزوں کے ساتھ ادب کو بھی ایک جنس نفع بخش بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ ادبی شہ پاروں کے ذریعہ زر کے پجاری ناشروں نے اپنی تجوریوں کو اتنا وزنی کر لیا ہے کہ وہ اٹھائی ہی نہیں جا سکتیں ایک طرف تو ہمارے ناشرین ادب برائے زندگی، ادب برائے مزدور اور ادب برائے تعمیر کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہیں اور دوسری طرف ادب کی بلند و بالا اور شاندار عمارتوں میں حتی الامکان انتہائی قیمتوں کے نقرئی اور طلائی قفل چڑھا دیتے ہیں موجودہ دور کی تمام مشہور اہم تعمیری مفید اور قابل مطالعہ کتابوں

کی قیمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ عوام انہیں خرید نہیں سکتے واضح رہے کہ لفظ عوام میں وہ کلرک بھی شامل ہیں جو اپنے کپڑے بنوانے کیلئے دو دو اور تین تین مہینوں تک کچھ پس انداز کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ طلبا بھی شامل ہیں جو تمام سال پڑھنے کے بعد بھی محض امتحان کی فیس نہ ہونے کی وجہ سے امتحان نہیں دے پاتے وہ مزدور بھی شامل ہیں جو بس کا کرایہ نہ ہونے کی وجہ سے گھر اور کارخانوں کا میلوں لمبا راستہ پاپیادہ طے کرتے ہیں۔ جس معاشرے میں معاشی مشکلات کی وجہ سے بھائی بہن اپنی مثالی محبت کو بالائے طاق رکھنے پر مجبور ہو جائیں ماں باپ اولاد کی سرپرستی اور تعلیم و تربیت کرنا چھوڑ دیں گوشت پوست کے تمام انسانی رشتے ختم ہو جائیں تو بھلا اس معاشرہ میں ادب و عوام کا رشتہ کیسے برقرار رہے؟ عوام ادب کی سرپرستی کیونکر کریں؟ شکایت کرنے والے شکایتاً کہتے ہی رہتے ہیں کہ عوام میں ادبی ذوق نہیں آخر یہ ادبی ذوق پیدا کیسے ہو؟ آج کل تو ادبی ذوق کا پیمانہ بھی "پیسہ" ہی ہے جب عوام کے پاس اپنی ابتدائی اور لازمی مادی ضروریات زندگی پورا کرنے کیلئے ہی "پیسہ" نہ ہو تو وہ آخر اپنے ادبی ذوق کا مظاہرہ کیسے کریں۔ اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اس پیسے کے نہ ہونے پر بھی ہمارے ناشرین نے ادبی کتابوں اور رسالوں کی قیمتیں اتنی بڑھا رکھی ہیں کہ عوام سوائے کتب خانوں میں کتابوں کا دیدار کرنے ان کے اوراق پلٹنے، انھیں دلچسپی اور تجسس سے دیکھنے اور پھر آخر میں ان کی قیمتیں پڑھنے یا پوچھنے کے بعد محض سرد آہ بھرنے، اور تلملانے کے کچھ اور کر ہی نہیں سکتے۔

نقادانِ ادب آئے دن اس بات کا رونا روتے رہتے ہیں کہ اردو ادب پر جمود طاری ہے کوئی بھلا آدمی ان سے پوچھے تو سہی کہ اگر جمود طاری نہ ہو تو پھر کیا ہو؟ جب ادب اور عوام کا درمیانی تعلق برقرار نہ رہے۔ ادب عوام تک نہ پہنچ سکے تو ادب کو نکھارنے ادیب بننے اور ادیب سے قریبی و زندہ تعلق رکھنے کا سلسلہ کیسے قائم رہ سکتا ہے۔ اور جب تک دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ یہ سلسلہ قائم نہ ہوگا تب تک ادبی جمود ختم نہیں ہوگا — ادبی جمود کو ختم کرنے کیلئے بھی اس شرط کی تکمیل لازمی ہے کہ عوام ادب کا مطالعہ کریں لیکن یہ ہو کیسے۔؟ پھر وہی بنیادی سوال — ابھر کے آتا ہے۔!

قیمتوں کی اس زیادتی کے سلسلے میں یاران طریقت حکومت کے رویے، طباعت کے مصارف ٹیکس کی زیادتی کاغذ کی گرانی عام کساد بازاری، ناشر سے جارحانہ حق، ادیب کے مطالبات اور اسی قسم کی دوسرے اخراجات کی فہرست پیش کر دیتے ہیں جو کہ یقیناً قابل قبول ہے۔ یہ تمام باتیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی سنجیدہ اہمیت کی حامل ہیں ان پر غور نہ کرنا انتہائی غیر ذمہ دارانہ فعل ہوگا لیکن پھر بھی کوئی فرد اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ان تمام جائز اور معقول مصارف کے باوجود کتابوں کی قیمتوں کا ایک حصہ ایسا ہوتا ہے کہ جو باقاعدہ ناجائز منافع کے زمرے میں شامل ہے ناجائز منافع کی یہ خطیر رقم عوام کی جیبوں پر بار گذرتی ہے نہ صرف بار بلکہ اتنی ناگوار کہ عوام اپنی بے پناہ خواہش کے باوجود بھی یہ کتابیں نہیں خرید سکتے

ادبی کتابوں کی قیمتوں میں زیادتی کے علاوہ ایک اور وجہ بھی ایسی ہے جس کی بنا پر کتابوں کی فروخت میں رکاوٹ ہوتی ہے اور یہ وجہ ہے ہمارے ناشرین کی ناسمجھی اس ناسمجھی میں صرف منافع باز... ناشرین ہی ملوث نہیں ہیں بلکہ کچھ صحیح اور ٹھوس بنیادوں پر ادب کی خدمت کرنے والے ناشرین بھی شامل ہیں خواہ نادانستہ ہی کیوں نہوں۔ مگر بہر حال ہیں۔ زیادہ قیمتوں پر ضخیم کتابیں اور طویل المدت رسالے بڑے ہی حسین و جمیل انداز میں شائع کرنا قطعی طور پہ ناسمجھی ہے یہ تسلیم کہ کتابوں اور رسالوں کی تیاری کے مدنظر ان کی مقررہ قیمتیں نہ صرف جائز اور معقول ہوتی ہیں بلکہ ممکن ہے کہ خدمت ادب کی خاطر منافع تو کجا کبھی کبھار کچھ نہ کچھ الٹا نقصان ہی اٹھانا پڑتا ہوگا — مگر ان تمام باتوں کے بعد بھی یہ سوال بہر طور اپنی جگہ برقرار رہتا ہی ہے کہ ان موٹی کتابوں، بھاری رسالوں اور حسین مجموعوں کو خریدے گا کون؟ بھلا کتنی ستم ظریفی ہے کہ وہ ادب جو اتنی محنت اور چابکدستی سے تخلیق و مرتب کیا گیا ہو ان لوگوں تک ہی نہ پہنچ سکے جو اس ادب کے موضوع ہیں اور یہ سب کچھ اس وجہ سے نہیں کہ عوام ادبی ذوق کے مالک نہیں بلکہ صرف اور صرف اس وجہ سے کہ وہ ان بھاری بھاری قیمتوں کی کتابیں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے — بقول روسو۔

"پانچ پانچ سو اور ہزار ہزار صفحوں کی موٹی موٹی کتابوں کے خریدنے کی توفیق کس میں ہے؟۔ ان کو پڑھنے کیلئے وقت اور فرصت کس کے پاس ہے؟ یہ تو غریب سے غریب شخص کی جھونپڑیوں تک پہنچ جانے والے پیسے پیسے والے ٹکٹ اور رسالے ہوتے ہیں جن سے ذہنوں میں انقلاب برپا ہو جایا کرتا ہے۔"

اگر اس چھوٹی سی اور موٹی سی بات کو ذہن میں رکھا جائے تو یقیناً ادب کی تخلیق اور ادب کی اشاعت کے بنیادی مقاصد پورے ہو سکتے ہیں سال بھر کے منتخب ادب کا مجموعہ شائع کرنے کی بجائے اس کو الگ الگ صنف کے تحت الگ الگ مجموعات میں بھی شائع کیا جا سکتا ہے مثلاً منتخب افسانے منتخب غزلیں منتخب مقالات منتخب گیت وغیرہ ان الگ الگ مجموعات کی مجموعی قیمت بھی ایک ہی مجموعے کی قیمت کے برابر رکھی جا سکتی ہے۔ اگر ایسا کر لیا جائے تو یہ الگ الگ مجموعے اپنی کم قیمتوں کی وجہ سے دو کانوں کی زینت بننے کی بجائے طلبا مزدور پیشہ کلرک دانشور اور چھوٹے موٹے دوکانداروں کے الماریوں اور میزوں کی زینت بنیں اس کام میں محنت اور طوالت ضرور ہے اس تھوڑی سی محنت کی وجہ سے دس کے بجائے پچاس آدمی ادبی کتابوں سے مستفید ہو سکیں گے کتابوں کی فروخت کی وجہ سے ادب اور ادیب سے متعلقہ مسائل کا بھی — ایک حد تک حل نکل آئے گا۔

ادب کی ترقی کیلئے یہ ضروری ہے کہ ادبی کتابوں اور رسالوں کی قیمتیں کچھ اس طرح رکھی جائیں کہ متوسط اور نچلے طبقے کے افراد بھی انہیں خرید سکیں۔ ادبی انتخاب مختلف اصناف ادب کے مجموعوں کی شکل میں مرتب و شائع کیا جائے۔ ضخیم نایاب کلاسیکل و بلند پایہ ادبی تصنیفات کیلئے سستے ایڈیشن شائع کئے جائیں ادب کے ذریعے منافع خوری بند کی جائے رسالوں کو دوماہی اور سہ ماہی شکل میں نکلنے کے بجائے ہفتہ وار پندرہ روزہ اور ماہانہ شکل میں نکالا جائے۔ عام لوگوں کے ادبی سماجی سیاسی اور تنقیدی شعور کو نکھارنے کیلئے کہنہ مشق نقادوں اور ماہرین سے عام فہم اور مختصر مقالات و مضامین لکھوا کر شائع کئے جائیں۔ اس کے علاوہ خیر خواہان ادب کے صلاح و مشورہ سے اور دوسری اصلاحات پر عمل کیا جائے یہ کام تنظیم، پرخلوص جذبہ، دیانت داری مستقل مزاجی اور بلند ہمتی کا مرہون منت ہے انہیں خصوصیات اور صلاحیتوں کے لوگ بہار ادب کی آمد کیلئے کڑی سے کڑی مصیبتیں برداشت کر سکتے ہیں۔ یہ خود غرض اور چور بازاری کرنے والے ناشرین کا کام نہیں ہے اور نہ ہی یہ دھڑے بندی کرنے والے جاہ پرست ادبی والوں کے بس کی بات ہے۔ آج کل نہ صرف معاشرہ بلکہ بذات خود ادبی مراکز میں جو مایوسی پست ہمتی، غیر یقینی کیفیت اور بزدلی کی پرچھائیاں چھائی ہوئی ہیں اچھے سے اچھے ادیبوں نے صحتمند تعمیری اور بامقصد ادبی سرگرمیوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی ہے ہر طرف ادبی جمود طاری ہے قنوطیت کا غلبہ ہے ان تمام باتوں کا علاج صرف اسی وقت ممکن ہے اگر بروقت اس بات کا احساس نہ کیا گیا تو نئی نسل کے دانشور بھی اس گھٹی گھٹی سی فضا میں اپنی غیر معمولی اور تعمیری صلاحیتوں کا مظاہرہ نہ کر سکیں گے اور پھر وقت کا قاصد بھی ناکامی کا پیغام دینے کے سوا اور کچھ نہ کریگا۔



فارغ بخاری

طلوع

کہیں چھٹا ہے غبارِ ظلمت، شبِ الم مختصر ہوئی ہے
کسی جگہ پو پھٹی ہے شاید، کہیں تو دیکھو سحر ہوئی ہے
کہیں تو ٹوٹے حصارِ زنداں، کہیں قفس میں شگاف آیا
کہیں تو دیوانگی اسیروں کی کچھ نہ کچھ کارگر ہوئی ہے
کہیں تو فتح و ظفر نے خود بڑھ کے اہلِ ہمت کے پاؤں چومے
کہیں تو اہلِ نظر کے قدموں سے آشنا رہگذر ہوئی ہے
کہیں تو ٹھہرے خزاں گزیدہ چمن میں کچھ قافلے گلوں کے
کہیں تو اجڑے ہوئے دیاروں کو فصلِ گل کی خبر ہوئی ہے
کہیں وفاؤں کے اسمِ اعظم نے سرکشی کا طلسم توڑا
کہیں تو آئینۂ محبت میں وہ پری جلوہ گر ہوئی ہے
کہیں تو چلمن ہٹی ہے آخر، کہیں تو رخ سے نقاب اٹھا
کہیں تو حسنِ جمال آرا سے زینتِ بام و در ہوئی ہے
کہیں تو فرقت کی رات بیتی، کہیں تو صبحِ وصال آئی
کہیں تو آنسو بنا ہے تارا، کہیں تو شبنم گہر ہوئی ہے



مجیب خیر آبادی

غزل

دوستو— کانپ اٹھا ہے لبِ فریاد ابھی
"صید" — ہو جائے نہ خود آپ ہی "صیاد" ابھی

اتنی محکم تو نہ تھی پہلے تمنائے ستم
لے ہی ڈوبے نہ کہیں حسرتِ فریاد ابھی

جیسے دل ڈوب ہی جائے گا سرِ قلزمِ غم!
کس قدر ٹوٹ کے برسی ہے تری یاد ابھی

باز آجاؤ ہوا خواہیِ گل سے یارو!
صحنِ گلشن میں اکیلا نہیں صیاد ابھی

جانے کس دل نے جلائے ہیں تمنا کے چراغ
شمع روشن ہے سرِ رہگذرِ باد ابھی

عشق تو جب بھی اٹھا تیشہ بکف اٹھا ہے
حسن بھی مان گیا عظمتِ فرہاد ابھی

دل سلگتا ہے نہ آنکھوں سے لہو بہتا ہے
اک چراغِ تہِ داماں ہے تری یاد ابھی

سرِ منزلِ جاناں تو نظر آئی مجیب
آرزو یہ ہے نہ ٹوٹے کوئی افتاد ابھی



جگن ناتھ آزاد

غزل

اتنا ہی بس آزاد! دکن کا ہے سفر یاد
اک ان کی ادا یاد ہے اِک ان کی نظر یاد
آئے ہوئے گلشن سے ہوا ایک زمانہ
لیکن ہے ابھی کیفِ شمیمِ گُلِ تر یاد
جتنی بھی تھیں یادیں وہ فراموش ہوئیں سب
پیوستِ رگِ جاں ہے ابھی ایک مگر یاد
سمٹا ہوا طوفان تھا خاموش نظر میں
تجھ کو بھی وہ نظارہ ہے اے دیدۂ تر یاد
اب اپنی خموشی پہ کریں ناز تو کیا ہم
دل آگ کا طوفان نظر تشنۂ فریاد
جس دھوپ میں گھر آئی تھیں زلفوں کی گھٹائیں
چڑھتی ہوئی اس دھوپ کی اب تک ہے سحر یاد
خاموش تھے لب اور نظر بول رہی تھی
کچھ تجھ کو بھی اے دل ہے وہ تائیدِ نظر یاد
اے ارضِ دکن! تجھ کو بھلانا نہیں آساں
جنت میں بھی آئیں گے ترے شام و سحر یاد

خلیل الرحمٰن اعظمی



غزل

میں دیر سے دھوپ میں کھڑا ہوں
سایہ سایہ پکارتا ہوں!!
سونا ہوں کرید کر تو دیکھو!!
مٹی میں دبا ہوا پڑا ہوں!!
لے مجھ کو سنبھال گردشِ دہر
ٹوٹا ہوا تیرا آئینا ہوں
یوں ربط تو ہے نشاط سے بھی
دراصل میں غم سے آشنا ہوں
صحبت میں گلوں کی میں بھی رہ کر
کانٹوں کی زباں سمجھ گیا ہوں
دشمن ہو کوئی کہ دوست میرا
ہر ایک کے حق میں میں دعا ہوں
کیوں آبِ حیات کو میں ترسوں
میں زہرِ حیات پی چکا ہوں!
تقدیرِ جنوں پہ چپ رہا میں
تعبیرِ جنوں پہ رو رہا ہوں
ہر عہد کے لوگ مجھ سے ناخوش
ہر عہد میں خواب دیکھتا ہوں!



اعتراف

قیصر تمکین



منگل کی شام کو سروس ختم ہونے کے بعد فادر پارسن نے اطمینان کی سانس لی اور چرچ کے پیچھے اپنی چھوٹی سی لائبریری میں چلنے لگا۔ وہ آجکل ادعائی دینیات پر ایک معرکہ آرا مقالہ لکھ رہا تھا اور اسی لئے زیادہ وقت مطالعہ میں صرف کرتا تھا جب وہ پشت کے بنگلہ کی طرف سے گذرنے لگا تو تیز اور مخ بستہ ہواؤں اس کا ڈھیلا ڈھالا لبادہ سرسرانے لگا جس سے اس کی تسبیح اور مقدس صلیب بھی ہلنے لگی۔

فادر پارسن ابھی حال ہی میں دور دراز کے ایشیائی ممالک سے تبدیل ہو کر یہاں آیا تھا۔ آس پاس کے لوگوں میں اس کی علمی قابلیت اور خطابت کی دھوم مچ گئی تھی اسمیں صرف ایک خامی تھی۔ اور وہ یہ کہ وہ شام کی سروس کے بعد اپنی ذاتی لائبریری میں مطالعے کے لئے جاتا تو پھر کسی سے ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔

ایسے ہی وقت اس کو تنہائی اور نیم تاریکی میں سامنے کی طرف سے ایک دبلا پتلا آدمی آتا دکھائی دیا۔ فادر پارسن نے پہلے سوچا کہ آس پاس کے کوارٹروں میں رہنے والا کوئی ملازم ہوگا مگر قریب آنے پر نووارد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور انگریزی میں کہا

”فادر میری مدد کرو۔“

پارسن نے بہت ہی سکون سے پوچھا ”کیا بات ہے بیٹا؟“

”میں اعتراف کے لئے آیا ہوں۔“

پارسن نے بہت نمایاں طور پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ وقت اعتراف کا نہیں ہے جب تک کوئی شخص بستر مرگ پر نہ ہو میں شام کی سروس کے بعد اعترافات نہیں سنتا ہوں۔ تم کل صبح نہیں آسکتے ہو؟“

آنے والے نے بے بس ہو کر کہا۔ ”کل بہت دیر ہو جائے گی۔“

پارسن نے چند لمحوں تک توقف کیا اور پھر بولا

”اچھا میرے ساتھ آؤ۔“

لائبریری میں پہنچ کر فادر پارسن نے دروازہ بند کر لیا اور باہر کا بلب روشن کر دیا یہ اس بات کا نشان تھا کہ فادر مطالعے میں مصروف ہے اور کسی کو اس کے پاس آنے کی ضرورت

نہیں ہے۔

نووارد نے کہا۔ "میرا نام مجید ہے اور میں مسلمان ہوں۔"

فادر پارسن کو تعجب تو ضرور ہوا مگر اس نے اس کا اظہار نہ ہونے دیا۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔"

"میں نے مرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ زندگی کی ہر مہم اور ہر منزل میں ناکام ہونے کے بعد اب میرے پاس یہی راستہ باقی رہ گیا ہے۔ اور یقین ہے کہ اس مہم میں مجھے ناکامی نہ ہوگی۔" اس کی آواز کمزور تھی۔

"نہیں نہیں میرے بیٹے ایسا نہ کہو۔ زندگی ایک امانت ہے تم ہر حال میں اس کو سنبھال کر رکھو ورنہ مقدس باپ تم کو خیانت کا مجرم ٹھہرائے گا۔"

"خیر یہ سب دل بہلانے کی باتیں ہیں۔ میں نے کچھ گناہ کئے ہیں۔ گناہ تو میں نے ہزاروں ہی کئے ہیں مگر بعض دو ایک چھوٹی چھوٹی باتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر میرا ضمیر مجھ کو ہر وقت ملامت کرتا رہتا ہے میں اس بوجھ سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے کسی ایسے شخص کو اپنے دکھ بتانا چاہتا ہوں جو ہمدردی سے سن سکے۔ میں اسی لئے تمہارے پاس آیا ہوں۔ امید ہے تم سنو گے۔"

"ضرور شوق سے۔ مگر تم کو ٹھنڈک لگ رہی ہے۔ خالی سویٹر اور باریک قمیض میں تو تم ٹھٹھرے جا رہے ہو۔ ٹھہرو میں تمہارے لئے کوکو منگاتا ہوں۔"

"نہیں نہیں فادر بات یہ ہے کہ ——..."

"کہو کہو۔ رک کیوں گئے ——"

"اگر کوکو کے بجائے تم دو ایک ٹوسٹ منگا دو تو مجھ میں رات بھر زندہ رہنے کی طاقت آجائے گی۔"

فادر پارسن کانپ اٹھا۔ "اف یہ ایشیائی بھوک کہاں کہاں چھپی بیٹھی ہے۔ یہ نوجوان اور خوبصورت لڑکا جو لاکھوں کام کر سکتا ہے اور اس دنیا کو بہتر بنانے کی جدوجہد میں چھوٹا موٹا حصہ لے سکتا ہے محض اس وجہ سے خودکشی پر آمادہ ہے کہ بھوک کا عفریت اس کو بھی اپنی زد میں لئے بیٹھا ہے اس کو ایسا لگا جیسے پورے ایشیا میں بھوک ایک کینسر کی صورت میں چھپی بیٹھی ہے۔"

وہ اٹھا اور دروازہ پر جا کر اس نے ملازم سے کچھ لانے کو کہا۔ اور پھر خاموشی سے لائبریری میں ٹہلنے لگا۔ مجید اس تمام مدت میں الماریوں میں لگی ہوئی کتابوں پر نظر ڈال رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی فادر پارسن نے ملازم کے ہاتھ سے کشتی لی اور مجید کے سامنے ایک چھوٹی میز پر رکھ دی اس میں کچھ ٹوسٹ ایک پلیٹ میں سوپ اور کافی کا سامان رکھا ہوا تھا۔

فادر پارسن دوسری طرف متوجہ ہو کر کتابیں دیکھنے لگا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھ کو اپنی بہن سے معافی مانگنا ہے مگر وہ یہاں سے بہت دور پاکستان میں اپنے شوہر کے پاس ہے اور خوش ہے بات ایسی ہے کہ میں اس کو خط بھی نہیں لکھ سکتا وہ مجھ کو جذباتی سمجھ کر ہنسے گی اور یہ محسوس بھی نہیں کرے گی کہ واقعی میرے دل پر کتنا بوجھ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں ہی بعض اوقات بڑی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہیں۔"

"بہت دنوں کی بات ہے۔ لگ بھگ سترہ برس پہلے کی جب میں اپنی بہن کے ساتھ کھیلتا تھا۔ وہ صرف ۶ یا ۷ برس کی تھی اور میں شاید نو دس برس کا تھا۔ ہم دونوں میں بڑی محبت تھی۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" فادر پارسن بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔

"ایک دن ہم دونوں لڑ پڑے۔ بات یہ تھی مجھے اپنی پڑوس کی ایک لڑکی بہت پسند تھی ایک دن میں نے اسکے گلے میں باہیں ڈالکر اس کو پیار کر لیا۔ میری بہن نے ہم دونوں کو دیکھ لیا وہ لڑکی تو بھاگ گئی مگر بہن نے مجھ کو چھیڑنے کے لئے کہا کہ وہ یہ بات سب سے کہہ دے گی۔ فادر تمہیں معلوم ہے کیا ہوا۔"

"نہیں۔" بہت ہی مشینی طور پر فادر پارسن کے منہ سے خود بخود نکلا۔

"میں نے اپنی بہن کے سر پر زور سے ایک رول مارا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ مگر بھاگتے میں میری نظر اس کے چہرے پر پڑ گئی وہ جس طرح بلبلا کر روئی وہ مجھے آج تک نہیں بھولتا۔ میں دن بھر ادھر ادھر چھپتا پھرا مگر مجھے حیرت ہوئی کہ کسی نے مجھ سے بازپرس نہ کی۔ بعد میں پتہ چلا کہ بہن نے کسی کو بتایا ہی نہیں کہ میں نے اس کو مارا تھا لوگ یہی سمجھے کہ کہیں گرنے سے اس کو چوٹ لگ گئی۔ رات کو میں نے اسے دیکھا وہ بے خبر سو رہی تھی اور اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"اپنے غرور کی بنا پر میں نے اس سے کبھی معافی نہیں مانگی۔ ہم میں کبھی اس واقعہ کا ذکر ہی نہیں ہوا۔ مگر میرے دل پر ایک بوجھ ہے وہ اس کا بلبلا کر رونا اور مایوسی سے میری طرف دیکھنا جب بھی مجھے یاد آتا ہے تو میں بے چین ہو جاتا ہوں۔"

فادر پارسن خاموش رہا اس کی سنجیدگی اور غور و فکر کے انداز سے مجید کو کچھ تقویت ہوئی۔

"ایک بہت ہی چھوٹی سی بات ہے اور ایسی کہ تم شاید اس پر ہنسو مگر میں اس کو اپنے سنگین گناہوں میں گنتا ہوں اس لئے اس کا ذکر بھی ضرور کروں گا اور امید ہے تم ہمدردی سے سنو گے۔" مجید نے ایک خود روی کے انداز میں کہا اس کے لہجے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا وہ کسی بڑے مجمع کے سامنے برہنہ ہو رہا ہے۔

فادر پارسن نے سنجیدگی سے کہا۔ "آج میرا سارا وقت تمہارے لئے ہے۔ تم کہو میں سن رہا ہوں، ہو سکتا ہے تمہارے اپنے آپ پر ملامت کرنے کا جذبہ ہی تمہاری نجات کا سبب بن جائے۔"

یہ بھی میرے بچپن کی بات ہے۔ ہمارے یہاں گھر میں گھر کی عورتیں کام کرتی ہیں اور صبح سویرے ہی سب بچے آکر چولہے کے پاس جمع ہو جاتے تھے جہاں ان کو پیالوں میں چائے بانٹی جاتی تھی۔ صبح ناشتے کی میز پر بیٹھ کر کیتلی سے چائے انڈیلنے کا دستور متوسط درجے کے مسلمان گھرانوں میں نہیں تھا۔

"میں ایک دن بہت سویرے باورچی خانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ سردی اتنی شدید تھی کہ دانت سے دانت بج رہے تھے۔ میرے سامنے چولہے میں لکڑیاں جل رہی تھیں اور ایک بڑی سی پتیلی میں چائے تیار ہو رہی تھی مٹی کے چولہے کے پاس ہی ایک بڑا سا ٹڈا اپنے پر سمیٹے بیٹھا تھا وہ ٹھنڈک اور کہرے پالے سے پریشان ہو کر یہاں آیا تھا۔ اور ہلکی گرمی میں سکون سے بیٹھا تھا۔ تمہیں معلوم ہے فادر مجھے کیا شرارت سوجھی۔"

"نہیں۔" اس نے مختصر سا جواب دیا

"میں نے دست پناہ اٹھایا اور اس میں ٹڈے کو دبا کر سلگتی ہوئی آگ کے اندر رکھ دیا......."

فادر پارسن کے چہرے پر ہلکے سے کرب کے آثار پیدا ہوئے مگر چند ثانیوں میں ہی اس کا فطری سکون واپس آگیا۔

مجید کی دونوں مٹھیاں بند تھیں اور وہ کسی ناقابل بیان اذیت میں مبتلا معلوم ہوتا تھا۔ "فادر۔ ایک ٹڈے کی کوئی اہمیت کبھی نہیں تھی اور نہ کبھی ہوگی۔ مگر میں اس حیوانیت سے شرمسار ہوں جس سے میں مغلوب ہو گیا تھا۔ یہ شرارت تھی فادر۔ ہم انسانوں کے اندر چھپا ہوا حیوان کبھی نہ کبھی جاگ اٹھتا ہے۔ بعض لوگوں میں یہ حیوان دیر سے جاگتا ہے مجھ میں یہ حیوانیت جلدی پیدا ہوئی اور چونکہ میں چھوٹا تھا اسی لئے وہ لڑکپن کا تاثر ابھی تک باقی ہے۔"

"بہر حال خدا رحم کرنے والا ہے۔ وہ سب گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔"

"فادر میں نے زندگی میں لاکھوں گناہ کئے ہیں مجھے ان گناہوں پر کوئی شرم نہیں ہے کیونکہ گناہ کرنا انسان کی فطری کمزوری ہے۔ مگر وہ گناہ جہاں میں انسانیت سے گرا ہوں مجھ کو ہر وقت بے چین و مضطرب رکھتے ہیں۔

"مجھے دنیا میں صرف ایک ہی ہستی سے محبت رہی ہے اور وہ میری ماں تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر ماں اپنے بیٹے کے لئے ہر ممکن قربانی کرتی ہے اور ہر بیٹا اپنی ماں کو راحت پہنچانے کی کوشش کرتا ہے مگر پھر بھی کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم مجبور ہو جاتے ہیں اور نہ جانے کہاں کی چھپی ہوئی کمینگی ہم پر غالب آجاتی ہے۔"

وہ تھوڑی دیر چپ رہا۔ اور پھر بولا۔ "فادر میں پچھلے تین چار برس سے بے روزگار ہوں کبھی کبھی کہیں کام مل جاتا ہے کچھ پیسے مل جاتے ہیں اور تھوڑے دنوں کام چل جاتا ہے مگر مستقل نوکری مجھ کو کبھی نہیں ملی۔ ان تین چار برسوں میں میری ماں بہت مذہبی ہو گئی اور ہمیشہ روزہ رکھنے لگی۔ فادر تم نہیں جانتے کہ ہمارے یہاں جب مائیں خود کچھ نہیں کھاتیں ہیں اور بچوں کو کھلا دیتی ہیں تو بچہ ہمیشہ حیران ہو کر پوچھتا ہے "ماں تم نہیں کھاؤ گی؟" اور ماں ہمیشہ جواب دیتی ہے "میں روزہ سے ہوں بیٹا۔"

"فادر روزہ ہمارے یہاں فاقہ کشی کی برہنگی کو چھپانے کے لئے ایک دبیز چادر کا کام دیتا ہے۔ ہاں تو پچھلے ہفتہ میری ماں نے ایک ساتھ تین چار دن کا روزہ رکھا اور میں اس مدت میں ایک جگہ سے ایک ڈبل روٹی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

"میں نے پہلے دو ٹکڑے کھائے پھر چار اور پھر آٹھ۔ آخر میں صرف دو ٹکڑے بچے۔ پرسوں جب میری ماں کمزوری سے نڈھال ہو رہی تھی تو میں نے وہ ٹکڑے بھی نکال لئے۔ ماں کی نظر پڑ گئی وہ روزہ سے تھی اور شام ہی کو کھا سکتی تھی اس نے بہت ہی بیچارگی سے ایک انگلی کا اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ میں ایک سلائس اس کے لئے رہنے دوں۔

فادر مجھے بہت زور کی بھوک لگی تھی معلوم ہوتا تھا جیسے پیٹ میں کوئی کیکٹس اگ آیا ہو۔ میں نے ایک سلائس کھایا اور دوسرا ماں کو پکڑا دیا۔ وہ روزہ نہیں توڑ سکتی تھی۔ اس لئے سلائس ہاتھ میں لیکر شام ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ میں نے اس سے کہا "کھاؤ"۔ وہ کچھ نہیں بولی۔

"کھاؤ اسے"! میں چلایا۔

وہ چپ چاپ مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے غصے اور جھنجلاہٹ میں کہا "لاؤ سلائس مجھے دو۔ میں جوان ہوں۔ مجھے ابھی زندہ رہنا ہے۔ تم بڈھی ہوگئی ہو۔"

ماں کے چہرے پر سکرات کا سا عالم طاری ہوگیا اس ہڈیوں کے پنجر میں سے کوئی آواز نہیں آئی ہاں روٹی کا ٹکڑا ہاتھ سے چھٹ کر گر پڑا میں نے جھپٹ کر سلائس منہ میں رکھ لیا اور بغیر چبائے ہوئے نگل گیا۔

"میں گھر سے بھاگ آیا ہوں۔ ماں کے آخری رسوم ادا کر دیئے گئے ہوں گے مگر میں کسی نئے مذہب اور نئے خدا کی تلاش میں نکلا ہوں۔ مجھے یقین ہے فادر پارسن کہ وہ خدا جس کے لئے میری ماں روزے رکھتی تھی مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

٭

پارسن خاموش بیٹھا تھا۔ بہت سی کتابیں اس کے سامنے رکھی تھیں۔ دو ایک کھلی بھی تھیں مگر وہ ان کو پڑھ نہیں رہا تھا۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی فادر پارسن نے بے خیالی میں اٹھ کر دروازہ کھولا تیز اور برفیلی ہوا کے ایک جھونکے سے اس کا سارا بدن کانپ گیا۔

مجید پھر کھڑا تھا "فادر مجھے معاف کرنا یہ لو اپنا پانچ کا نوٹ تم اپنے پاس رکھو اور ہاں سن لو ایک اور اعتراف میں نے تم سے جو کچھ بھی کہا تھا وہ سب جھوٹ تھا۔ سمجھے تم کر نہیں؟

وہ پانچ کا نوٹ فادر پارسن کے لانبے چغے میں ٹھونس کر تیزی سے باہر نکل گیا ٭٭

نریش کمار شاد





آپ کی آنکھیں

چشم بد دور آپ کی آنکھیں
دو عجیب و غریب جادوگر
گاہ کیفِ نظر کے مے خانے
گاہ تسکینِ روح کے مندر

وادیٔ رنگ و نور کی راہیں
شہرِ کیف و نشاط کی گلیاں
جاں فزا جیسے چاندنی راتیں
نیم وا جیسے ادھ کھلی کلیاں

دو طلسمی بجھارتیں گویا!
آسمانی پہیلیاں جیسے
ہم سن و ہم لباس و ہم صورت
دو پرانی سہیلیاں جیسے

یہ پرانی سہیلیاں لیکن
خوبصورت ہیں آرزو کی طرح
ایک گہرے سکوت کی لے میں
نغمہ خواں ایک خوش گلو کی طرح

اپنے اس نغمہ خواں سکوت کے ساتھ
اس ادا سے ہیں ضوفشاں دل میں
ایسا محسوس ہو رہا ہے مجھے
اک چراغاں کا ہے سماں دل میں

جو تراشے گئے نزاکت سے
ایسے دو آبدار ہیرے ہیں
بستیاں ہیں حسین خوابوں کی
رامش و رنگ کے جزیرے ہیں

ان جزیروں کو دیکھ کر اکثر
مجھ کو ایسا خیال آتا ہے
ان کے سانچے میں ڈھل گئی ہے بہار
یا مجسم ہے جیسے نشۂ مے

میں کہیں جاؤں آپ کی آنکھیں
رقص کرتی ہیں میری آنکھوں میں
رس بھری دل نشیں امنگوں کے
رنگ بھرتی ہیں میری آنکھوں میں

آپ تو خیر "میری پیاری" ہیں
یہ ابھی تک مگر کنواری ہیں

ابن ایوب

ہمارے رہنما ہمارے مسائل



پاکستانی مزدوروں کے مسائل کے سلسلے میں تو ہم روزانہ بیانات سنتے ہی رہتے ہیں۔ ان سطور میں میں اس بات کی کوشش کروں گا کہ ان وجوہات پر روشنی ڈالوں جو ان کے حل نہ ہونے کا اصل سبب ہیں۔ ایک مزدور کارکن ہونے کی حیثیت سے مجھے اس سلسلے میں جو تجربات ہوئے ہیں ہو سکتا ہے وہ اوروں سے کچھ مختلف ہوں مگر یہ باتیں مزدور رہنماؤں اور کارکنوں کی نجی محفلوں کا ایک بہترین موضوع ہے۔ ہاں یہ بات میرے لئے یقیناً باعث حیرت ہے کہ اب تک منظر عام پر لانے کی کیوں کوشش نہیں کی گئی۔ "تو مرا ملا بگو من ترا حاجی" جس فارمولے پر آج تک اس سلسلے میں عمل ہوتا رہا ہے وہ قابل افسوس بھی ہے اور ایک اہم فرض سے کوتاہی بھی۔

جس وقت ہم آزادی سے ہم کنار ہوئے اس وقت اس خطۂ زمین پر صنعتی مزدور نہ ہونے کے برابر تھے لیکن جوں جوں صنعت نے ترقی کی "مزدور" بھی بڑھتے چلے گئے اور آج سارے معاشرے کا ایک اہم جز ہیں۔ مگر ہماری نہ تو کوئی سیاسی آواز ہے نہ ہماری اہمیت کو ابھی تک سیاسی جماعتوں یا دوسرے لوگوں نے تسلیم ہی کیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ کافی عرصہ تک ہمارے مزدور رہنما ہمیں یہ سبق دیتے رہے ہیں کہ مزدوروں کو سیاست سے الگ رہنا چاہیئے اس بات کو ہمارے سیاسی قائدین اور کارخانہ داروں نے بھی اپنے مخصوص مفادات کے تحت سراہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے ہمارے لئے سیاست ایک شجر ممنوعہ کی سی حیثیت اختیار کر گئی ہے حد یہ ہے کہ بے شمار یونینیں آپ کو ایسی ملیں گی جن کے آیئن میں یہ دفعہ موجود ہے کہ "اس یونین کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں" یہ بات ہمارے غیر ملکی آقاؤں، اور ٹریڈ یونینز میں سامراج دوستوں کی ایجاد کردہ ہے جسے ہم آج بھی سینے سے لگائے ہوئے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کا مزدور جو کسی بھی بہتر اقتصادی پروگرام رکھنے والی جماعت کی ریڑھ کی ہڈی بن سکتا تھا آج اس میدان میں عضو معطل ہو کر رہ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی لیڈر کی تقاریر آپ اٹھا کر دیکھ لیں کشمیر کے مسئلے سے لے کر محلہ کی صفائی کے تمام مسائل پر وہ اظہار خیال کریں گے لیکن اس ملک کے معمار، خوشحالی کے ضامن مزدور طبقے کے متعلق ایک لفظ بھی نہ تو ان کی تقاریر میں ملے گا اور نہ ہی کسی سیاسی پارٹی کے منشور میں کچھ تلاش کر پائیں گے۔ جس وقت یہ سطور تحریر کی جا رہی ہیں ملک میں صدارتی مہم اپنے شباب پر ہے لیکن کسی امیدوار نے مزدور طبقہ کیلئے کوئی پالیسی مرتب کی ہے؟

سوچنا یہ ہے کہ آخر یہ کیوں؟ ایک ایسے اہم طبقہ کو جس کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے جو ملکی معیشت میں شہ رگ کی حیثیت کا مالک ہے کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے اگر ہم اس سوال کا جواب اپنی ہی صفوں میں تلاش کریں تو بہت آسانی سے ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ مزدور رہنماؤں نے ملک کے مزدوروں کو مختلف ٹکڑیوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور مزدور مجبوراً اور غیر شعوری طور پر مزدور لیڈروں کے ان متحارب گروہوں میں تقسیم ہو کر اپنی وہ حیثیت منوانے میں اب تک ناکام رہا ہے جو اس کا سماجی حق ہے میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ کم و بیش تمام سرمایہ دار ممالک میں مزدور نظریاتی بنیادوں پر کئی گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں لیکن ان گروہوں کی کوئی نظریاتی اساس ہوتی ہے اور واضح طور پر مزدوروں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس گروپ میں شامل ہیں وہ کیا چاہتا ہے؟ اس کے علاوہ بحیثیت مجموعی مزدور ہر سرمایہ دار ملک میں علیحدہ ایک سیاسی اکائی کے طور پر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہر جگہ اس کی نوعیت مختلف ہے مگر اپنے یہاں تو عالم یہ ہے کہ خود مزدور رہنماؤں کو بھی یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ جس گروپ سے متعلق ہیں وہ کیوں ایک گروپ بن گئے ہیں یا دوسرے گروپ کی مخالفت وہ کیوں کر رہے ہیں اس کے ساتھ ہمارے جیسے نام نہاد مزدور لیڈروں کے گروپ بنائے جاتے ہیں ان لیڈروں میں کبھی کوئی مثالی اتحاد نہیں پایا جاتا۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ ایکدوسرے کی اکھاڑ پچھاڑ کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ آپ کسی مزدور لیڈر سے کسی دوسرے لیڈر کیلئے دریافت کر لیجئے وہ اسے بے ایمان، بد کردار، لچہ اور نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالے گا۔ اور یہی وجوہات ہیں کہ ملک میں ابھی تک مزدور تحریک صحیح معنوں میں منظم نہیں ہو پائی ہے جس کی وجہ سے آج بھی سرمایہ دار من مانی کرنے پر قادر ہیں، اچھے برے جو بھی قوانین موجود ہیں ان کی حیثیت صرف کاغذ پر لکھے ہوئے چند جملوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اقتصادی میدان میں عدم توازن بڑھتا جا رہا ہے انتظامی مشینری کھلے طور پر کارخانہ داروں کی طرفدار ہے۔ مزدوروں کی ہر تحریک شر پسندی اور انتظامی مسئلہ بن کر رہ جاتی ہے۔ پاکٹ یونینیں نہ صرف موجود ہیں بلکہ خود مزدوروں میں ایک رجحان موجود ہے کہ "اندر کی یونین میں شامل ہونے

سے ان کی ملازمت محفوظ ہو جائے گی۔ اس صورت حال کا سب سے زیادہ نقصان ان غریب ہوشمند مزدوروں کو اٹھانا پڑتا ہے۔ جو کسی نہ کسی طرح بہ ہزار دقت اپنے آپ کو منظم کرنے اور اپنی صفوں کو "کالی بھیڑوں" سے محفوظ رکھنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسی بھی انجمنیں موجود ہیں جن کی لیڈر شپ وہٹرے بندیوں میں گرفتار ہے لیکن اس کے باوجود وہاں اپنی ہوشمندی کی وجہ سے مذکورہ صورت حال کے اثر سے کسی نہ کسی طرح بچے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ایسی دو چار یونین ہیں ان کا سارا کریڈٹ یا تو وہاں کے تجربہ کار مزدوروں کو جاتا ہو یا پھر وہاں کے مخصوص حالات ان کے محافظ ہیں پھر بھی صورت حال یہ ہے کہ ملک گیر پیمانہ پر نہ تو کوئی فیڈریشن ایسی ہے جو صحیح معنوں میں مزدوروں کی رہنمائی کر سکے۔ اور نہ ہی ملک گیر پیمانے پر کوئی ایسی لیڈر شپ ابھر سکی ہے جو مزدور مسائل پر کوئی بھرپور لائحہ عمل اس کے سامنے پیش کر سکے۔

اگر موجودہ گروہوں کا تجزیہ کیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ملک بھر میں مزدوروں کے درمیان چار قسم کے گروہ سرگرم عمل ہیں۔ (۱)

سرکاری اور سرمایہ داروں کی تسلیم شدہ قیادت

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے طور پر ملک کی سب سے بڑی مزدور طاقت ہونے کے داعی ہیں۔ لیکن ان کا کام اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے کہ حکومت کی لیبر پالیسی کی حمایت کریں اور قومی، بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کرکے ملک اور بیرون ملک کے لوگوں پر یہ بات ظاہر کرتے رہیں کہ پاکستان میں بھی "مزدور تحریک" موجود ہے۔ ورنہ انہیں تمام مزدوروں کے ایک ایسے گروہ کے علاوہ جو جد وجہد سے گھبراتا ہے یا ان کی رعائتوں پر زندہ رہنے کا عادی ہوچکا ہے ان کو کسی اور مزدور کی حمایت حاصل نہیں۔ یہ طبقہ زیادہ تر اندرونی اور بیرونی مالی امداد کے سہارے زندہ رہتا ہے ورنہ مزدور تو ابھی تک اس قابل نہیں کہ ان کے جھوٹے رہنما اپنے جس معیار زندگی کو برقرار رکھے ہوئے ہیں اس کے متحمل ہوسکیں۔ (۲)

مزدوروں میں غیر سیاسی تنظیم کی حامی قیادت

ایک زمانہ تھا کہ یہ لوگ اپنے جلو میں ہر قسم کے لیڈروں اور کارکنوں کیلئے ایک ایسی "لیڈر شپ" کے مالک تھے جو موثر بھی تھی اور نامور بھی مگر کچھ اپنی کوتاہیوں اور مزدور تحریک کو صرف "گھاس دانے" کی تحریک بنائے رکھنے کی کھوکھلی نظریاتی غلطی نے اس لیڈر شپ کو بہت پیچھے دھکیل دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس گروپ میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے ٹریڈ یونین تحریک کو پاکستان میں ہر قیمت پر زندہ رکھا ہے لیکن کیونکہ ان میں کوئی ٹھوس نظریاتی شخصیت نہیں ابھر پائی جو بدلتے ہوئے حالات میں ان کی رہنمائی کرتی اس لئے ان کا رجحان زیادہ تر دائیں بازو کی طرف جھک گیا جس میں بعض افراد کی بے ایمانی کو بھی دخل تھا جس کی بنا پر ان کا ایک بڑا حصہ پہلے گروپ میں شامل ہو گیا ہے بہرحال یہ اب بھی مزدوروں میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں — مزدوروں کے کافی بڑے اور اہم حصہ کی رہنمائی آج بھی انہیں حاصل ہے۔

۳:۔ موقعہ پرست لیڈر شپ

یہ لوگ کسی علیحدہ گروپ کی شکل میں تو موجود نہیں لیکن ان کی وفاداریاں بدلتی رہتی ہیں ان لوگوں میں بعض لیڈر ایک طرف سرکاری پالیسیوں کے خلاف بھی رہتے ہیں لیکن سرکاری افسران کے خاص دوست بھی سرمایہ داروں سے لڑتے بھی نظر آئیں گے مگر ان کی جیب میں بہت سی یونینوں کے بوگس رجسٹریشن بھی ہوں گے یعنی رند بھی ہیں اور جنت کے مدعی بھی۔

یہ لوگ ملک کی مزدور تحریک کا بدترین عنصر ہیں جو ایک طرف مزدوروں میں انتشار — اور بدنظمی کو سہارا دیتے ہیں تو دوسری طرف کارخانہ داروں کو بھی دھوکہ میں رکھ کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں سرکار اگرچہ ناراض رہتی ہے مگر سرکاری افسران سے "دانت کاٹی روٹی" رہتی ہے؟ "صنعتی عدالت ان کی خاص آماجگاہ ہے لیکن اب مزدور انہیں اچھی طرح پہچان گئے ہیں اس لئے ان لوگوں نے اس بات کو محسوس کرکے اپنی پناہ گاہیں بنالی ہیں کچھ پہلے گروپ میں شامل ہوگئے ہیں اور بعض دوسرے گروپ میں — بہرحال ان کے ساتھ مزدوروں کا صرف وہی عنصر ہے جو حالات سے اس قدر غیر مطمئن ہے کہ آئے دن لیڈر شپ بدلتا رہتا ہے

"چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ"

اس گروہ کو کیا نام دیا جائے میں نہیں جانتا لیکن اس بکھرے ہوئے انبوہ کثیر میں ایسے کارکنوں کی بھی کمی نہیں جو مذکورہ بالا تمام طریقہ ہائے کار سے نہ صرف نفرت کرتے ہیں بلکہ اپنی عدت کے باوجود ذاتی صلاحیتوں کی بنیاد پر مزدوروں کی صفوں میں محنت ایمانداری اور خلوص کی شمع کو روشن کئے ہوئے ہیں وہ چاہے کسی فیڈریشن میں ہوں کسی یونین میں کام کرتے ہوں ان کے ذاتی نظریات کچھ بھی کیوں نہ ہوں وہ اس ملک میں ایک جاندار مضبوط اور ہر بیرونی و اندرونی اثر سے آزاد مزدور تحریک بنانے کے خواہاں ہیں۔ بیروزگاری قید وبند کی صعوبتیں، پولیس کے ڈنڈے، کارخانہ داروں کا عتاب سب کچھ ان جیسے رہنماؤں کے لئے مخصوص ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ قومی اور بین الاقوامی میدان میں ان کی شخصیات نامور نہ سہی لیکن ان کی آواز کی طرف ہر کان لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کب یہ لوگ اس بکھرے ہوئے شیرازے کو منظم کرلے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ مزدور ان کی بات سنتے ہیں اور ان سے محبت کرتے ہیں — ان کا کردار بے داغ ہے اخباروں میں نہ سہی لیکن ان کے کارنامے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہتے ہیں امید یہی ہے کہ بالاخر یہ گروہ ایک دن اس ڈوبتی نیا کو پار لگانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ گو راستہ بہت کٹھن اور پرآشوب ہے مگر نہیں جوان اور عزم صمیم ان کی خصوصیت ہے ان لوگوں کے پاس ایک واضح پروگرام ہے۔ ان کی منزل متعین ہے یہ مزدور ہیں یا پکے مزدور دوست ہیں یہی وجہ ہے کہ جب کبھی بھی ملک گیر پیمانے پر مزدوروں کا مسئلہ اٹھتا ہے تو صرف یہی لوگ سامنے ہوتے ہیں ورنہ مذکورہ بالا گروہوں میں تمام یا تو ساز باز کرنے میں مصروف ہوتے ہیں یا پھر بیرون ملک کے دورے پر چلے جاتے ہیں۔

تو یہ لوگ ہیں جو ہماری آجکل قیادت سنبھالے ہوئے ہیں۔ یہاں یہ بات صاف ہے کہ ان چاروں حصوں کے ان تمام لیڈروں میں کوئی قدر بھی مشترک نہیں اور یہ بات بھی واضح ہے کہ ملک بھر کے مزدوروں میں کسی ملک گیر مسئلے پر کوئی اختلاف نہیں۔ اگر ہے تو صرف لیڈروں کے درمیان یہی وہ بنیادی کلیہ ہے کہ مزدوروں کی اس یک جہتی کے باوجود نہ تو ملک گیر پیمانے پر ابھی تک کوئی مزدور تحریک وجود میں آسکی ہے اور نہ ہی کبھی ان کے مسائل حل ہوسکے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام مزدور اب اس بیماری کو سمجھیں اور خود آگے بڑھ کر اپنے درمیان سے ان تمام افراد کو خارج کردیں جن کا کردار مشتبہ ہے اور یقینی طور پر بد دیانتی، خود غرضی اور سرمایہ دار اور حکومت کی ترجمانی کی حد تک کھل کر سامنے آچکا ہے۔ واضح اور مثبت مطالبات کے لئے ملک گیر پیمانہ پر اپنی تحریک کو منظم کیا جائے تاکہ ملک و قوم کے اہم ترین طبقے یعنی محنت کشوں کی اپنے سماجی اور سیاسی حیثیت بھی معاشرہ میں عملاً تسلیم کی جائے اور اقتصادی میدان میں جو ناہمواری اور ناانصافی آج پائی جاتی ہے ختم ہوسکے۔ یہی ایک راستہ ہے جو ہمیں کامیابی سے ہمکنار کرسکتا ہے اور ہمارے مسائل تقاریر و بیانات سے نکل کر حل ہونے کی اسٹیج میں داخل ہوسکتے ہیں۔

سلام سندیلوی



ایک ہی دے خوشی کبھی

زندہ ہوں اے خدا مگر، جا نہ سکی زندگی کبھی
آئی بہار، چل بسی دی، کھل نہ سکی کلی کبھی
دل کو نہ جگمگا سکی تاروں کی روشنی کبھی
نور نہ دے سکی مجھے چاند کی چاندنی کبھی
غم تو ہزاروں دیدیئے ایک ہی دے خوشی کبھی
اوس کے اشک پا چکا پھول کی دے ہنسی کبھی

جھرنوں کے زیر و بم پہ میں، گیت کوئی نہ گا سکا!
چاند نہ اوٹ سے کبھی، پاس مجھے بلا سکا
غنچہ و گل کی بزم میں دل نہ قرار پا سکا!
مست گھٹائیں دیکھ کر، وجد نہ مجھ کو آ سکا
غم تو ہزاروں دیدیئے ایک ہی دے خوشی کبھی
اوس کے اشک پا چکا پھول کی دے ہنسی کبھی

خون رلاتی ہے کبھی، اپنوں کی دشمنی مجھے
غم میں ڈبوتی ہے کبھی غیروں کی دوستی مجھے
زہر پلاتی ہے کبھی، ہائے یہ مفلسی مجھے
درد ہے ہر گھڑی مجھے، چین نہیں کبھی مجھے
غم تو ہزاروں دیدیئے ایک ہی دے خوشی کبھی
اوس کے اشک پا چکا پھول کی دے ہنسی کبھی

اہل دول کے واسطے، اونچی نفیس کوٹھیاں
پردے پڑے دریچوں میں کمروں میں بلب ضو فشاں
گھنگرو، ستار، ریڈیو، رقص، شراب مہ وشاں
میرے نصیب میں مگر، عیش کہاں خوشی کہاں
غم تو ہزاروں دیدیئے ایک ہی دے خوشی کبھی
اوس کے اشک پا چکا پھول کی دے ہنسی کبھی

صوفے بچھے ہیں پارک میں میزیں لگی ہیں جا بجا
گملے رکھے قرینے سے کپ بھی سجے ہیں خوشنما
ڈپٹی، وکیل، کوتوال، آئی جی، بار ایٹ لا
اہل دول کی یہ ڈنر، ان میں مرا شمار کیا
غم تو ہزاروں دیدیئے ایک ہی دے خوشی کبھی
اوس کے اشک پا چکا پھول کی دے ہنسی کبھی

دنیا ہے ان کی جن کا سر، خان نواب نام ہے
جن کی حسین صبح ہے، جن کی سنہری شام ہے
سامنے جن کے ساغر بادۂ لالہ فام ہے
میرے لئے مگر سلام عیش و طرب حرام ہے
غم تو ہزاروں دیدیئے ایک ہی دے خوشی کبھی
اوس کے اشک پا چکا پھول کی دے ہنسی کبھی

وزیر آغا

چار شعر

ستارے، شب کے صحن میں عجیب گل کھلا گئے
کسی کو گدگدا گئے کسی کا دل دکھا گئے

ہوا ہی کیا جو آپ نے چراغ سب بجھا دیئے
فلک پہ دیپ جل اٹھے، پلک پہ اشک آ گئے

جہاں جہاں بھی ہم گئے لباس تار تار میں
شگوفہ ہائے آرزو، کھلا گئے ہنسا گئے

ہم اپنی بات کیا کہیں، ہماری بات ہے بھی کیا
ہوا کے ساتھ چل دیئے، ہوا کے ساتھ آ گئے



اُمِ عمارہ



بیچاری منی

گرمیوں کا دم ٹوٹ رہا تھا۔ جاڑا اپنے سارے لوازمات کے ساتھ پر پھیلائے بڑی تیزی سے چلا آ رہا تھا۔ ہم لوگوں نے اب آنگن یا اسارے میں سونے کی بجائے کمروں میں سونا شروع کر دیا تھا۔ بڑے بڑے کاٹھ کے صندوق کھل گئے تھے اور توشک، لحاف نکال رہے تھے۔ گرم کپڑوں کو دھوپ دکھا دکھا کے کھلے بکسوں میں استعمال کے لئے رکھا جا رہا تھا۔ دن کو دھوپ تو اب بھی ویسی ہی جان لیوا تھی۔ لیکن راتیں سرد ہو چلی تھیں کمرے میں سونے کے باوجود جسم پر ایک چادر ڈالنی پڑتی تھی۔

انھیں دنوں ہمارے ہاں بڑی آپا اپنے نصف درجن بچوں کے ساتھ آ براجمان ہوئیں۔ گرمیاں ہوتیں تو شاید اتنی دقت نہیں ہوتی یہ بڑی کھلی چھت دو دو لمبے چوڑے اسارے اور چٹان جیسا آنگن تھا۔ لیکن اس زمانے میں ڈیڑھ درجن آدمیوں کا گذر صرف چار کمرے میں ایک ایسا پرابلم نظر آ رہا تھا جس کا کوئی حل نہیں ہو۔ سارے کمرے اکٹھے ہوئے ہماری جان کو روتے رہتے ایک طرف ابھی صاف ستھرا کمرہ کے دوسری طرف نظر اٹھائی تو دیکھا بڑے مزے سے کاٹھ کباڑ پھیلا ہوا ہمیں کام کی دعوت دے رہا ہے۔ تمام دن ایک نہ ایک کام جان میں روگ کی طرح لگ کر رہ گیا تھا اور اوپر سے آپا کا ڈرا لگ جو ذرا کی ذرا میں خفا ہو جاتی تھیں ہم تو خیر تھے ہی کولھو کے بیل خالہ ہونے کے ناتے بیچاری منی کو بھی ان کے بچوں کا مان رکھنا پڑتا تھا۔ اب یہ بات الگ تھی کہ آپا کے منے چنے اور بے بی ہی منی کے ماموں خالہ لگتے تھے۔ نہ صرف عمر میں بلکہ قد اور کاٹھ میں بھی وہ اس کے ڈیوڑھے تھے۔ پھر بھی وہ بچے تھے اور بیچاری منی بڑی۔

ابھی ذرا لے کے ذرا اس نے کیلے والے سے دو کیلے لئے ہیں کہ بے بی آ دھمکیں۔

"منی خالہ مجھے بھی کیلا!!"

"منی خالہ ایک ہمکو" منے چلائے جو بھیا کا ملبا کرتا پہنے ہونے والے ڈرامے میں مولانا کا پارٹ ادا کرنے کیلئے ریہرسل کر رہے تھے۔

"مجھے بھی دیجئے" جناب چنے صاحب روشنائی سے مونچھیں بنائے تشریف لائے۔

اس نے غصہ سے انکی طرف دیکھا جو بڑی عزت سے اس کا نام لے رہے تھے ۔ کم ظرف ، خود غرض ۔ یوں تو وہ منی تھی اور کبھی کبھی تو منیا کہنے سے بھی نہیں چوکتے ہیں اور اب اس نے چڑ کے منے کی طرف دیکھا ۔ جو بھیا کے لمبے کرتے میں ۔ مولانا سے زیادہ بھگ منگے نظر آرہے ہیں ۔

" تم اپنی ماں سے پیسے مانگ لو ۔ وہ بیٹھا ہے دروازے پر کیلے والا ۔ اس نے سہم کر کیلوں کو فراک کے دامن میں چھپا لیا اور خوفزدہ نظروں سے منے کو دیکھنے لگی ۔ جو روشنائی کی کڑی بڑی مونچھیں بنائے ہیرام ڈاکو کا پارٹ کر رہا تھا ۔ وہ اسوقت اسے سچ مچ کا ڈاکو دکھائی دے رہا تھا ۔ جو اس کے دلپسند کیلوں پر چھاپا مارنے کے لئے تیار تھا ۔

" ڈرتی ہو سیدھی طرح کیلا یا میں کہوں نانی اماں سے " چنے نے دھمکی دی ۔

" کہہ دو میں کچھ ڈرتی تھوڑی ہوں اماں " منی نے تن کے کہا ۔

" اماں ۔ اے نانی اماں " چنے چلاتا ہوا آنگن کی طرف دوڑا ۔

اور پھر اماں شروع ہو گئیں ۔

" ویدو منی کیلا تم تو بڑی اچھی بیٹی ہو ۔ ارے بیٹے یہ منے چنے تو تمہارے بیٹے ہیں "

" مجھے نہیں چاہئیں ایسے ہونق بیٹے " اس نے جل کے دل ہی دل میں سوچا اور خاموشی سے کیلا چھیل کر کھانے لگی ۔

" اللہ ۔ امی ۔ نانی اماں ۔ ہائے کیلا ۔ ہم کو کیلا " منے چنے گلا پھاڑ کر چلائے ۔ اور بے بی نے رونا شروع کر دیا ۔

" منی " اماں چیخیں اور منہ کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ ایک دم گر پڑا وہ سوچا اور ایک ادھ چھلا کیلا زمین پر آ رہا ۔ اور بڑی آپا کے لاڈلے مرکھوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے جیسے کبھی کیلا میسر ہی نہ ہو ۔

" ندیدے بے تمیز " منی نے حقارت سے انکی طرف دیکھا اور فراک کا دامن جھاڑتی ہوئی دروازے سے باہر نکل گئی ۔ جب سے بڑی آپا آئی تھیں کوئی بھی اس کا خیال نہ کرتا تھا ۔ باجی ۔ اچھے بھیا ۔ اماں سب کے سب بس آپا کے لاڈلوں کو ڈھوئے پھرتے بھیا کہیں ان لوگوں کو لیمن چوس دے رہے ہیں تو اچھے بھیا انکے لئے شریفے لائے ہیں باجی کالج سے ان کے لئے کبھی امرود تو کبھی کیلا اور نہیں تو مٹی کے رنگ برنگ کھلونے ۔

آپا کے آنے سے پہلے وہ سب کی لاڈلی تھی آپا کے بچوں کے سامنے تو وہ ایک دم بڑی ہو کر رہ گئی تھی ۔ کبھی کبھار بھولے بھٹکے کہیں بھیا اسے گود میں اٹھا لیتے تو بےبی صاحبہ جو خیر سے انکی ہم عمر تھیں گلا پھاڑنے لگتیں ابھی اسی دن کی بات ہے کہ بھیا باہر سے آئے تو وہ ، دروازے پر بیٹھی بڑی مایوسی سے سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی کہ بھیا نے اسے گود میں اٹھا لیا ۔

" نہیں ۔ آں ۔ چھوڑیئے " وہ مچل گئی وہ انہیں بتا دینا چاہتی تھی کہ ان سے خفا ہے لیکن بھیا نے اسے مضبوط باہوں میں بھر لیا اور کاندھے پر اٹھائے ایک ہاتھ میں ٹافیوں کا لفافہ جھلاتے ہوئے آنگن کی طرف آئے سامنے آنگن میں چنے منے ، بے بی اسکے ازلی بیری لٹو نچانے میں مصروف تھے کہ بے بی کی نظر اس پر پڑ گئی اور منی نے لفافے میں سے ٹافیاں مٹھی میں بھرتے ہوئے بے بی کا منہ چڑا دیا ۔

" ارے ماموں جی " چنے چلایا ۔ اور آنگن میں بھگدڑ مچ گئی ۔ منے چنے ، بے بی ننھی سب بچے سب بھیا کے گرد جمع ہو گئے کوئی انکی ٹانگ سے لپٹ گیا کوئی باہیں پکڑنے کی کوشش کرنے لگا اور ڈینا پھیلائے بے بی اسے کسی کچن سے کم نہیں نظر آئی بھیا نے منی کو گود سے اتار دیا ۔ اور بے بی اپنے گرد آلود ہاتھ پاؤں سے بھیا کے برف جیسے کرتے پاجامے پر گل بوٹے بناتے ہوئے انکی باہوں میں جھول گئی اور منے چنے ٹافی کے لفافے کے لئے چھین جھپٹ کرنے لگے ۔

منی نے لفافہ انکی زد سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے بھیا کو احتجاجی نظروں سے دیکھا ۔

" دیکھو بھئی منے چنے " بھیا ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ اماں آگئیں ۔

" کیا ہو رہا ہے منے دیدو ٹافی بچوں کو "

" نہیں دیتی " منی نے لفافے پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا ۔

" بچوں کو " جیسے وہ تو ہمسائیگی بڑھیا تھی ۔ اس نے غصہ سے اماں کو دیکھا اور آنگن سے جانے کے لئے مڑی "

" نانی اماں ۔ ایں ۔ نانی اماں ٹافی ۔ ہائے آں " چنے نے ہاتھ آئے ہوئے مال کو یوں نکلتے ہوئے دیکھ کر فریاد کی ۔

" منی بیٹی " اماں نے بڑے میٹھے لہجے میں پکارا لیکن منی نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی ۔ اور بڑی تیزی سے کمرے کی طرف مڑی وہ اماں کے میٹھے لہجے کا مطلب اچھی طرح جانتی تھی اور کسی قیمت پر بھی ہاتھ آئی ٹافیاں ان ندیدوں کو دینے کیلئے تیار نہیں تھی — لیکن اماں کی مسلسل پکار اسکے قدموں میں زنجیر سی لپیٹ گئی اور وہ آہستہ آہستہ مری ہوئی چال سے اماں کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی ۔

" بیٹی اتی ساری ٹافیاں ہیں ان میں سے بے بی اور ننھی اور منے چنے کو بھی دیدو یہ سب تمہارے بھانجے ، بھانجیاں ہیں نا ۔ اور پھر بانٹ چونٹ کر کھانے سے راجہ گھر بیاہ ہوتا ہے ۔ راجہ گھر جائیگی میری بیٹی رانی کہلائے گی " اماں نے بہلا دیا ۔

" نہیں جاتی راجہ کے گھر نہیں بنتی رانی " منی نے چلبلا کے ٹافی کا لفافہ پھینک دیا اور زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی ۔

اماں نے اسکی حالت زار کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ٹافی گن گن کر چنے منے اور دوسروں کو دیں اور اس کے حصے کی ٹافیاں اس کے آگے ڈال کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں منی نے ٹافیوں کو اٹھا کر دور پھینک دیا ۔ اور زار و قطار رونے لگی " اللہ کرے مجھے موت آجائے ۔ دوسروں کی آئی مجھے آجائے — " ابھی کل بڑی آپا اپنی موت کی دعا مانگ رہی تھیں تو اس نے سنا تھا ۔"

" میں مر ہی جاؤں اللہ میاں " مارے غصے کے منی کی آواز نہیں نکل رہی تھی ۔

" ارے تم مرنا چاہتی ہو منی " منے نے زمین پر بکھری ہوئی اسکے حصے کی ٹافیاں اپنے قبضے میں کرتے ہوئے کہا ۔

" ہاں ۔ اور کیا " منی نے سوں سوں کرتے ہوئے کہا ۔

" بڑی اچھی بات ہے کل کو مرتی آج ہی مر جاؤ " منے بڑے مزے لے لے کے اسکی ٹافیاں کھا رہا تھا ۔ اور جیسے کسی نے منی کا کلیجہ چٹکیوں سے مسل دیا ۔

" کیوں مر جاؤں بھلا " منی بلی کی طرح غرائی ۔

" ارے تم مروگی تو میلاد ہوگا مٹھائیاں کھانے کو ملیں گی چالیسیں میں پلاؤ میٹھا ٹکڑا پکے گا اور ہم مزے سے کھائیں گے جیسے دادی بی کی چالیسیں میں کھایا تھا " چنے نے لٹو پر لتی لپیٹتے ہوئے کہا ۔

" پھر اللہ کرے تم سب مر جاؤ منے ۔ بی بی ۔ ننھی تم سب کے سب تاکہ مجھے ڈھیر ساری مٹھائی ملیں اللہ کرے تم لوگ مر ہی جاؤ ۔ لے کے میری ساری ٹافیاں "

" کیا بک بک لگا رکھی ہے ۔ بڑی آپا سر پر کھڑی اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھیں ۔ وہ سہم گئی ۔

" ہمارے مرنے کی دعائیں مانگ رہی تھیں منی خالہ " ۔ ننھی نے آگ لگائی یہاں چھوٹے بڑے سب ہی اس کے بیری تھے ۔

ننھی کا یہ کہنا تھا کہ بڑی آپا نے آفت ڈھا دی اور جب تک اماں نے دو چار طمانچے منی کو نہیں لگائے چپ نہیں ہوئیں ۔ اماں کی تھپڑیں کھا کے پناہ کے لئے ، بھیا کی طرف بھاگی تو وہاں بے بی پہلے ہی براجمان تھی بھیا میز پر جھکے کچھ لکھ رہے تھے اور بے بی دوسری کرسی پر بیٹھی انکا دماغ کھا رہی تھی ۔

" آج انکی پٹائی ہوئی ہے " بے بی نے منی کی طرف دیکھتے ہوئے اترا کے بھیا کا بال کھینچا ۔

اس نے بے بی کی بات کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا ۔ بس چپ چاپ میز کے پائے سے لگی مڑ مڑ کر بھیا کا منہ دیکھے جا رہی تھی کہ شاید بھیا کو پیار آجائے لیکن بھیا نے کوئی نوٹس نہیں لی خاموشی سے قلم چلاتے رہے اور بے بی اتراتی رہی وہاں سے چڑ کے وہ اماں کے کمرے میں جا کر بستر نوچنے لگی ۔ انتقاماً سارا بستر ۔ توشک ۔ لحاف چادریں سب ایک ایک کر کے رکھدیں اور پھر تکئے پر سر رکھ کے بیٹھ گئی ۔

اگر میں ذرا بھی بڑی ہوتی تو منے چنے بے بی سب

کو اتنا مارتی اتنا مارتی کہ بس" منی نے پاس پڑے تکیے کو سہلانا شروع کر دیا۔

"اللہ میاں اے اللہ میاں مجھے جلدی سے بڑا کر دو بس ابھی بڑا کر دو" وہ بلک بلک کر گڑگڑانے لگی اس نے دادی جی سے سنا تھا کہ وہ دعائیں جو گڑگڑا کر مانگی جاتی ہیں قبول ہو جاتی ہیں۔

وہ بلکتی رہی اور تکیے پہ ہاتھ پھیرتی رہی۔ پھر اس نے محسوس کیا جیسے وہ بڑھ گئی ہے یہ بڑے بڑے ہاتھ پیر ہو گئے ہیں اسکے۔ لانبا قد باجی سے بھی آگے نکل گیا ہے اور انگلی بھر کا بال بڑھ کے گھٹنوں کو چھو رہا ہے۔ بالکل بڑی آپا کی طرح وہ مارے خوشی کے جھوم اٹھی۔

"واہ اب آئیں یہ منے چنے بتاتی ہوں انکو"

وہ بڑے اطمینان سے اپنی لمبی چوڑی جسامت دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی کہ سامنے سے منے چنے بی بی اور ننھی جھگڑتے چیختے ہوئے آتے دکھائی دیئے انھیں دیکھ کر اسے اپنی ایک ایک مصیبت یاد آنے لگی۔ وہ بڑی تیزی سے ان پر جھپٹی اور دے دھوں دھوں انھیں پیٹ کر رکھ دیا ابھی وہ اسے جی بھر کے پیٹ بھی نہ پائی تھی کہ اس کا جوڑا کھل گیا اور وہ اپنے گز بھر لمبے بال میں لپٹ کر گر پڑی اس نے سنبھل کر چنے کو پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو وہ اس کی زد سے باہر تھا۔ دور کھڑی بے بی اپنی ناک سے بہتے ہوئے خون کو خاک آلود دامن سے پونچھ رہی تھی۔

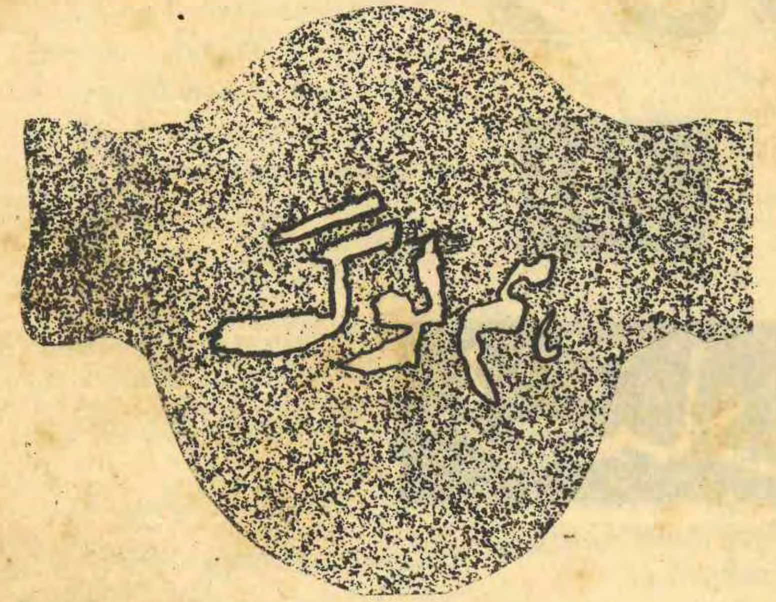
"ٹھہر تو جا چنے کے بچے" اس نے منے کا سر دیوار سے ٹکرا دیا۔ ساتھ ہی اسے اپنے سر میں تکلیف سی محسوس ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ زمین پر پڑی تکیہ کو دونوں ہاتھوں سے دبائے تھی اور اماں کی چادر اسکے گرد لپٹی ہوئی تھی۔

"کیا مصیبت ہے اماں" اس نے چونک کر دیکھا پاس کھڑی بڑی آپا ڈکرا رہی تھیں۔

"سوتے میں بھی اس کے ذہن پر میرے ہی بچے سوار رہتے ہیں، — میرے بچے نہ ہوئے —"

آپا کو آنکھیں نکالتے دیکھ کر اسے فوراً یاد آ گیا کہ وہ بھی تو آپا کے اتنی بڑی ہو گئی ہے۔ اب اسے کس چیز کا ڈر ہے اور وہ بڑی پھرتی سے لپٹی ہوئی چادر اور تکیہ پھینک کر بڑی آپا کے مقابل کھڑی ہو گئی۔ اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس کا قد بڑی آپا کی کمر کو چھو رہا تھا۔ ننگی پتلی پتلی ٹانگیں اور وہی گرد خوردہ فراک اس نے جلدی سے سر پہ ہاتھ پھیرا گز بھر کے بال کی بجائے مشکل سے بالشت برابر بال ربن میں سمٹے ہوئے تھے۔ اس نے بڑی حسرت سے آپا کو دیکھا۔ آنگن میں منے چنے، بے بی اور ننھی کی شکل میں اسکی مصیبتیں کھیل رہی تھیں اس نے مایوسی سے ادھر ادھر دیکھا سامنے اسارے میں اماں بڑی آپا کے ننھے کو گود میں لئے بہلا رہی تھیں۔ مجھے کوئی نہیں پوچھتا اس نے اداس ہو کر اماں کو دیکھا اور اپنی بے چارگی پر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ ٭

خالد (علیگ)



سحر کا نور، گلوں کا نکھار ہیں ہم لوگ!
بہار کیا ہے؟ کہ جانِ بہار ہیں ہم لوگ

نمودِ حسنِ مکمل ہماری ذات سے ہے
جمالِ دوست ترا شاہکار ہیں ہم لوگ

بکھر گئے ہیں زمانہ کی وسعتوں میں تو کیا
کسی حسین کے دل کا غبار ہیں ہم لوگ

کہو نسیم سے دامن سمیٹ کر گذرے
کہ اک چراغِ سرِ رہگذار ہیں ہم لوگ

مثالِ خالِ سیہ ہیں سیاہ بخت نہیں!
صباحتِ رُخِ غم کا نکھار ہیں ہم لوگ

غمِ حیات کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں مگر
غمِ حبیب کے آئینہ دار ہیں ہم لوگ

خبر کرے یہ کوئی ساکنانِ پستی کو!
فرازِ عرش پہ بھی آشکار ہیں ہم لوگ

دھواں دھواں ہے مشیّت کا دبدبہ ہم سے
"بجبرِ دوست" بھی با اختیار ہیں ہم لوگ

ہمارا "دامنِ تر" ہے بڑا "سبب انگیز"
دلیلِ رحمتِ پروردگار ہیں ہم لوگ

"کرم نمائی اہلِ رسن" کا خوف نہیں
ہلاکِ عشرتِ لیلائے دار ہیں ہم لوگ

خوشا یہ عظمت "پاکیزگی" فکر و نظر
ز روئے "جہلِ خرد" داغدار ہیں ہم لوگ

مٹا سکیگا زمانہ کا ہاتھ کیا ہم کو
کہ وجہ گردشِ لیل و نہار ہیں ہم لوگ

صحیفۂ سحر و شام ہم سے ہے منسوب
خود اپنے وقت کے پروردگار ہیں ہم لوگ

ہمارا نام ذرا احترام سے لینا!
بڑے "عظیم" بڑے "باوقار" ہیں ہم لوگ

نبوّتِ غمِ دوراں کے فیض سے خالد!
رسالتِ دلِ انساں شکار ہیں ہم لوگ

سی۔ آر۔ اسلم

مخصوص حالات اور تضاد

مخصوص حالات میں ترقی اور تبدیلی کے عمل میں بہت سے تضاد ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم تضاد ہوتا ہے جس کی موجودگی اور جس کی ترقی اور تبدیلی دوسرے تضادات کی موجودگی اور ترقی اور تبدیلی پر اثر انداز ہوتی ہے پہلے اس اہم تضاد کو تلاش کرنا چاہیئے چونکہ ہر تضاد کے دو پہلو ہوتے ہیں جن میں سے ایک اہم ہوتا ہے اسلئے اس اہم تضاد کے دونوں پہلوؤں میں سے اہم پہلو... کو دریافت کرنا ضروری ہے۔

مثال کے طور پر سرمایہ داری سماج میں اہم تضاد سرمایہ دار اور مزدور کے مابین ہے دوسرے تضادات جاگیرداری عناصر اور سرمایہ داروں کے مابین دیہاتی عوام اور سرمایہ داروں کے درمیان سرمایہ دار جمہوریت اور فاشزم کے درمیان سرمایہ دار ملکوں کے درمیان سامراج اور نوآبادیاتی ملکوں کے درمیان ان سب تضادات کو پہلا تضاد متاثر کرتا ہے۔

پاکستان جیسے نیم نوآبادیاتی ملک میں اہم اور غیر اہم تضادات کو سمجھنے میں خاصی دشواری پیش آتی ہے کیونکہ سیاسی آزادی حاصل ہونے کے بعد سامراج پس پردہ چلا جاتا ہے گا لیکن پھر بھی یہ بات واضح ہے کہ امریکی سامراج پاکستان میں اپنا اثر بڑھانے اور کنٹرول قائم کرنے کیلئے معاشی اور سیاسی اور تہذیبی ذرائع استعمال کرتا ہے پاکستان کے حکمران اس سے سودے بازی کرتے ہیں اور پاکستان کے عوام کے خلاف اور ان کا استحصال کرنے کیلئے جاگیرداروں اور امریکی سامراج کا اتحاد عمل میں آتا ہے۔

جب عوام اور سامراج کی کش مکش شدت اختیار کرنے لگتی ہے تو سامراج عوام کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کیلئے حکمرانوں کو معاشی اور فوجی امداد دینے لگتا ہے اس حالت میں اہم تضاد سامراج اور عوام کا ہوتا ہے جو دوسرے تمام تضادات پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ تبدیلی کے عمل کے ہر مرحلے میں صرف ایک اہم تضاد ہوتا ہے جو ان حالات میں سب سے اہم رول ادا کرتا ہے حالات کی تبدیلی ہی سے تضادات کی اہمیت بدلتی ہے جب تک حالات نہیں بدلتے تبدیلی کے عمل کے اس مرحلے میں دوسرے تضادات اہم تضاد کے تابع رہتے ہیں اور ان کی حیثیت ثانوی رہتی ہے۔

اس لئے کسی خاص حالت میں تبدیلی کے عمل کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں اہم تضاد ڈھونڈنے کی ضرورت ہے کیونکہ اہم تضاد کی دریافت سے یہ مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔

تبدیلی کے کسی عمل میں ہم سب تضادات کو یکساں اہمیت نہیں دے سکتے ہم کو اہم اور غیر اہم بڑے اور چھوٹے تضادات میں تمیز کرنا ہوگی۔

جب ہم اہم اور بڑا تضاد تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو اس کے دونوں پہلوؤں میں اہم پہلو تلاش کیا جائے تضاد کے دونوں پہلو ایک جیسی اہمیت نہیں رکھتے اور نہ وہ دونوں یکساں ہوتے ہیں اگر کبھی وہ متوازن نظر آئیں تو یہ حالت عارضی ہوتی ہے بنیادی حالت دونوں کی غیر یکساں ہوتی ہے۔ تضاد کا اہم پہلو ہی تبدیلی کے عمل میں اہم رول ادا کرتا ہے اور اس کی مخصوص تضاد میں غالب حیثیت ہوتی ہے۔

تضاد کی یہ حالت ایک سی نہیں رہتی اس کے اہم اور غیر اہم پہلو اپنی حالت بدلتے رہتے ہیں اور اس طرح ہر تبدیلی سے اس شے یا عمل کی کیفیت بدل جاتی ہے اہم اور غیر اہم پہلو کی آپس میں تبدیلی کا باعث وہ طاقتیں ہیں جو اس کش مکش اور آویزش میں آمنے سامنے آتی ہیں اور جن کے بڑھتے یا گھٹنے سے تبدیلی کا یہ عمل رونما ہوتا ہے۔

جدید کا قدیم پر غالب آنا قانون قدرت ہے اور تبدیلی کا یہ عمل جدید اور قدیم کی باہمی کش مکش سے ظہور پذیر ہوتا ہے اسی کش مکش میں جدید طاقت پکڑتا ہے اور قدیم کمزور ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ جدید قدیم پر غالب آجاتا ہے اور جونہی جدید قدیم پر غالب آتا ہے تو اس سماجی عمل شے یا فطرت کی قدیم کیفیت بدل جاتی ہے اور اس کی جگہ جدید کیفیت لے لیتی ہے کیفیت کی یہ تبدیلی بڑے تضاد کے غالب آنے سے ظہور میں آتی ہے۔

جاگیرداری سماج میں سرمایہ دار طبقہ جدید طبقہ تھا جب یہ طبقہ پیدا ہوا تو اس وقت سماج میں اس کی ثانوی حیثیت تھی۔ آخر جب سرمایہ دار طبقے نے جاگیردار طبقے کے خلاف جدوجہد کی تو جدید اور قدیم کی باہمی آویزش میں سرمایہ دار طبقے نے غالب

پوزیشن اختیار کرلی اور اس کے غالب آنے سے سماج کی کیفیت بدل گئی اور وہ سرمایہ دار سماج بن گیا اس جدید سماج میں جاگیری قوتیں ثانوی حیثیت اختیار کرگئیں اور آہستہ آہستہ نابود ہوتی گئیں جیسا کہ برطانیہ اور فرانس میں ہوا ہے۔

سرمایہ دار سماج میں سرمایہ دار اور مزدور طبقے ہیں ان میں سے سرمایہ دار قدیم اور مزدور جدید طبقہ ہے سرمایہ داری سماج کے آغاز میں سرمایہ دار کی غالب پوزیشن تھی اور مزدور کی ثانوی حیثیت تھی لیکن پیداواری قوتوں کی ترقی سے قدیم اور جدید کی آویزش بڑھی حتیٰ کہ مزدور طبقہ سماج میں غالب آگیا اور سرمایہ دار طبقہ کا غلبہ ختم ہوگیا۔ اور یہ طبقہ ذرائع پیداوار سے محروم ہوکر آہستہ آہستہ نابود ہونے لگا۔

مزدور طبقہ جو سرمایہ دار کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور اس کی ضد ہے آغاز میں یہ طبقہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ یہ طبقہ قوت پکڑتا ہے اور بالآخر سماج میں غالب آجاتا ہے اور سرمایہ دار طبقہ نابود ہوجاتا ہے۔

پاکستان میں امریکی سامراج اور عوام کا تضاد اہم تضاد ہے پاکستان کے جاگیردار طبقے اور امریکی سامراج میں ۱۹۵۴ء میں اتحاد عمل ہوا اور یہ اتحاد اب تک باقی ہے پاکستان کے عوام کی طاقت بڑھ رہی ہے اور یہ تضاد حل ہو کر رہے گا اور عوام امریکی سامراج کے غلبے سے آزاد ہوں گے اور اس طرح نیا پاکستان جنم لے گا تبدیلی کے اس عمل میں پاکستانی سماج کے مختلف طبقوں میں بھی تبدیلی آئے گی — اور جاگیردار طبقہ اور رجعتی عناصر جو اس وقت سماج میں غالب اکثریت رکھتے ہیں پیچھے دھکیل دیے جائیں گے اور عوام و قومی جمہوری عناصر غالب حیثیت اختیار کرلیں گے اور اس طرح پاکستان میں جمہوری سماج قائم ہوگا۔

گزشتہ سترہ سال میں پاکستان میں تبدیلی کے اس عمل کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں جاگیردار طبقہ پاکستان کے سماج میں غالب طبقہ تھا اور اس طبقے نے ۱۹۵۴ میں امریکی سامراج کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور اس سے سمجھوتہ کرلیا اور اس طرح امریکی سامراج کو غالب حیثیت حاصل ہوگی۔

سرمایہ دار طبقہ کو ۱۹۴۷ میں ثانوی حیثیت حاصل تھی پیداواری قوتوں کی ترقی سے سرمایہ دار طبقہ سترہ سالوں میں اس قابل ہوا ہے کہ وہ جاگیردار طبقے کے مقابلے میں حکومت کی پالیسی پر زیادہ اثر انداز ہو رہا ہے۔ لیکن امریکی سامراج کے سامنے اس کی حیثیت اب بھی ثانوی ہے۔

ان سترہ سالوں میں سامراج جاگیرداروں اور رجعتی عناصر کی انتشار اور تشدد کی پالیسی کے باوجود عوام کی طاقت بڑھی ہے اور قومی جمہوری قوتیں مضبوط اور متحد ہوئیں۔

جدوجہد کے دوران میں بعض اوقات مشکلات زیادہ ہوتی ہیں اور سودمند صورتیں کم لیکن کارکنوں کی ہمت سے مشکلات پر قابو پایا جاسکتا ہے اور جب مشکلات پر قابو پالیا جاتا ہے تو جدوجہد کی ترقی میں آسانیاں بڑھ جاتی ہیں اور بعض اوقات کارکنوں کی سہل انگاری اور کوتاہی سے آسانیاں مشکلات میں بدل جاتی ہیں —

یہ درست ہے کہ ترقی و تبدیلی میں مادی حالات نظریات کو اور سماجی زندگی سماجی شعور کو متعین کرتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نظریات مادی حالات پر اور شعور سماجی زندگی پر اثرانداز نہیں ہوتے ترقی پسند خیالات تبدیلی کے عمل کو تیز کرتے ہیں اور رجعتی خیالات اس عمل میں رکاوٹ ڈالتے ہیں لیکن تبدیلی کا عمل تضادات کے مابین کش مکش سے واقع ہوتا ہے۔

اگر مخصوص تضاد کا مطالعہ کرتے وقت اہم اور غیر اہم تضاد میں تمیز نہ کی جائے اور اہم تضاد کے اہم اور غیر اہم پہلو کو نظر انداز کردیا جائے تو ہم غلط نتائج اخذ کریں گے اور اس تضاد کے حل کرنے کیلئے غلط طریقے اختیار کریں گے جو تبدیلی کے اس عمل کو تیز کرنے کی بجائے اس میں رکاوٹ بنیں گے۔

دنیا میں کسی شے کی ترقی اور تبدیلی یکساں اور ہموار نہیں ہوتی بلکہ ترقی اور تبدیلی کے ہر مرحلے پر اس کی صورت بدلتی رہتی ہے مخصوص حالات میں اہم اور غیر اہم کے جائزہ ہی سے جدید صورت حال کے پیدا ہونے اور قدیم صورت حال کے معدوم ہونے کی کیفیت ظاہر ہوسکتی ہے۔

تضاد کے دونوں پہلوؤں کے مابین کش مکش بھی ہوتی ہے۔ اور اتحاد بھی سرمایہ دار اور مزدور لازم و ملزوم ہیں اور ان کی کش مکش بھی ناگزیر ہے۔ ان ہر دو میں سے ایک کا وجود دوسرے کے وجود کا ثبوت ہے۔ تضاد کے دونوں پہلوؤں میں سے خاص حالات میں سے ایک پہلو اہم ہوتا ہے اور دوسرا غیر اہم ہوجاتا ہے۔

تبدیلی اور ترقی کے سادہ عمل میں صرف دو متضاد پہلو ہوتے ہیں اور پیچیدہ عمل میں متضاد پہلوؤں کے کئی جوڑے ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کے مقابل اور ایک دوسرے سے مصروف جدوجہد ہوتے ہیں خارجی دنیا میں اور خیالات میں تبدیلی اور ترقی اسی وجہ سے ہوتی ہے ایک رہا تضاد قائم نہیں رہ سکتا۔ بقا اور فنا زندگی اور موت بدقسمتی اور خوش قسمتی جاگیردار اور کسان مزدور اور سرمایہ دار لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود قائم نہیں رہ سکتا۔ سامراج کا وجود نوآبادیاتی ملکوں کے بغیر اور نوآبادیاتی ملکوں کا وجود سامراج کے بغیر تصور نہیں کیا جاسکتا — یہ ایک دوسرے سے پیوست بھی ہیں اور ایک دوسرے کے مقابل اور ایک دوسرے سے متصادم بھی ہیں۔

تضاد کے پہلو دونوں ایک دوسرے سے متعلق اور ایک دوسرے کے مقابل اور ایک دوسرے سے متحارب ہی نہیں ہوتے بلکہ ایک دوسرے کی جگہ بھی تبدیل کرلیتے ہیں۔ مثلاً مزدور محکوم ہوتے ہیں اور پھر حاکم بن جاتے ہیں۔ اور سرمایہ داروں کی جگہ حکمرانی کرنے لگتے ہیں۔ کسان جو آج زمین سے محروم ہیں کل زمین کے مالک بن جائیں گے — اور جاگیردار جو زمین کے مالک ہیں کل زمین سے محروم ہوں گے۔

ترقی اور تبدیلی کا یہ عمل مخصوص خارجی حالات میں واقع ہوتا ہے — یہ مخصوص خارجی حالات ہی ہیں جن کے سبب پاکستان میں مغربی ممالک کی طرز کا سرمایہ دارانہ نظام قائم نہیں ہوسکتا بلکہ قومی جمہوری نظام کے راستے سوشلزم قائم ہوگا لیکن خارجی اسباب کو ترقی اور تبدیلی میں مرکزی اور بنیادی حیثیت حاصل نہیں ہوتی بلکہ اندرونی تضاد کے مقابلے میں انکی حیثیت ثانوی ہوتی ہے اور ترقی اور تبدیلی کا عمل ان خارجی اسباب میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

تبدیلی اور ترقی۔ متضاد پہلوؤں کی جدوجہد سے ہوتی ہے پہلے مقداری تبدیلیاں ہوتی ہیں اور اس وقت کیفیت جامد نظر آتی ہے جب مقداری تبدیلیاں ماہیتی تبدیلیاں بن جاتی ہیں تو سماج میں بھی ماہیتی تبدیلی واقع ہوجاتی ہے۔

متضاد پہلوؤں کا اتحاد عارضی ہوتا ہے لیکن ان کی جدوجہد اور کش مکش اور تصادم قطعی ہوتا ہے۔

تصادم تضاد کے دونوں پہلوؤں کی کش مکش کی ایک صورت ہے جو ایک تضاد میں ہوتی ہے انسانی سماج میں طبقات ہیں — اور ان طبقات کی کش مکش بھی موجود ہے طبقات برس ہا برس سماج میں موجود رہتے ہیں غالب طبقہ دوسرے طبقے کا استحصال کرتا رہتا ہے لیکن جب ان کا تضاد اتنا ابھر آتا ہے کہ وہ کھلم کھلا ایک دوسرے سے متصادم اور متحارب ہوجاتے ہیں تو انقلاب برپا ہوجاتا ہے۔



بشیر پردیپ





تم سے الجھتے وقت، تم سے کھنچتے وقت میں یہ بھی سوچا کرتا تھا۔ تم سے کسی طرح چھٹکارا مل جائے تو میں دوسری شادی کر لوں! یا تمہاری موجودگی ہی میں تمہیں نظر انداز کر کے دوسری بیوی گھر میں لے آؤں! تمہاری خاموشی، تمہارا سانولا چہرہ، سفید سادہ دھوتی میں لپٹا تمہارا دبلا پتلا جسم، یہ سب میرے غصے کو بھڑکانے لگتے اور میں سوچنے لگتا کتنا بدقسمت ہوں میں ۔۔۔؟

لیکن اب ۔۔۔؟"

ابھی ابھی بھائی صاحب کو گاڑی پر چڑھا کر لوٹا ہوں۔ کل شام کو آئے تھے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے اپنا اصرار دہرایا تو میں نے پہلے کی طرح ہنس کر ٹال دینے کی کوشش کی۔ لیکن اب کی بار تو وہ جیسے اپنا آخری فیصلہ سنانے آئے تھے! رات کو سونے سے پہلے انہوں نے صاف کہہ دیا کہ "بچے ہم سے نہیں پلتے دوسری شادی نہیں کرنی تو انہیں یہاں اپنے پاس لے آؤ۔ خود ان کی پرورش کرو ہم نے کوئی ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے؟" اور یہ سن کر میں ہنس دیا میں جانتا تھا کہ ایک روز وہ یہی بات کہیں گے ۔۔۔ لیکن پھر بھی میری ہنسی میں کھسیانہ پن تھا!

میں اٹھارہ برس کا تھا جب ہماری شادی ہوئی تھی۔ اور تم اس وقت سولہ برس کی تھیں اس زمانے میں انیس بیس کی عمر ہی میں ہر ایک کی شادی ہو جاتی تھی۔ اٹھارہ برس کی عمر کوئی ایسی چھوٹی عمر نہ تھی۔ تم جہاں خوبصورت تھیں اور گھر کے کام کاج میں سیانی تھیں وہاں حساس اور خوددار بھی پرلے درجہ کی تھیں یہ تمہاری بدقسمتی تھی کہ ہماری شادی کے دو ہی دن بعد میرے پتا جی کو ایک حادثہ پیش آیا اور وہ سرگباش ہو گئے۔ اور پھر اس کے تیسرے دن میرا چھوٹا بھائی ایک فساد میں مارا گیا۔ اور ہمارا گھر ماتم کدہ بن گیا میری ماں کچھ دکھ سے نیم پاگل ہو جانے کی وجہ سے اور کچھ پرانے خیالات کی ان پڑھ عورت ہونے کے ناطے تمہیں منحوس سمجھنے لگی۔ اور اس بات میں میری بھابی میری ماں کی ہم خیال تھی۔ میری ماں بات بات پر تمہیں پھٹکارنے لگتی۔ تمہارے ہر کام میں نقص نکالنے لگتی اور بھابی اسے اور بھڑکایا کرتی۔ تم بھی آخر انسان تھیں ایک روز تم نے بھی زبان کھول لی۔ اور گھر میدانِ جنگ بن گیا۔ اب یہ روز کا معمول ہو گیا۔ اب ماں اگر کچھ کہتی تو تم بھی ہولے سے جواب دیتیں اور اس کے بعد ماں کتنی کتنی دیر تک بولتی رہتی اور تمام گلی والے سنتے جب بھی میں گھر آتا میری ماں اور میری بھابی تمہارے خلاف میرے کان بھرنے لگتیں۔ اگرچہ تم مجھے بےقصور نظر آتی تھیں جب بھی میں تمہیں ڈانٹ دیتا ۔۔۔ آخر تم موقع ہی کیوں دیتی ہو لڑائی کا ۔۔۔؟ میں بھول جاتا کہ ماں اور بھابی جب لڑائی کیلئے آمادہ ہوں تو موقع تو وہ خود ہی ڈھونڈھ لیتی ہوں گی! اماں اور بھابی کو

دکھانے کیلئے میں تمہارے پاس بیٹھا، تم سے بول چال حتیٰ کہ تمہارے کمرے میں سونا تک بند کر دیا۔ ان دنوں میں ایک چھوٹی سی فرم میں بطور سیلزمین ملازم تھا اور مجھے کام کے سلسلے میں دس دس بارہ بارہ دن باہر رہنا پڑتا تھا۔ جب گھر آنے پر مجھے ماں اور بھائی کی طرف سے تمہارے خلاف شکایتیں سننے کو ملنے لگیں تو میں نے دورے کے ایام بڑھا دیئے اب میں مہینے بھر میں صرف ایک بار ایک دو روز کیلئے گھر آتا۔ اور یہ ایک دو دن بھی میں تمہارے ساتھ نہ بولتا۔ شروع شروع میں اپنے آپ کو سخت مزاج ظاہر کرنے کیلئے مجھے کچھ کوشش سی کرنی پڑتی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں تمہارے سامنے ایک جابر اور سخت مزاج انسان کی اداکاری کر رہا ہوں! اور پھر آہستہ آہستہ یہ کوشش یہ اداکاری میری فطرت کا ایک حصہ بن گئیں — اور میں ہر بات میں تم سے سختی سے پیش آنے لگا۔

جب تم خاموشی سے میرا یہ سلوک برداشت کرنے لگیں تو مجھے تم کو تنگ کرنے کا ایک نیا طریقہ سوجھا میں نے اپنی پسند کی وہ تمام چیزیں جو تم جانتی تھیں کہ مجھے پسند ہیں، ترک کرنا شروع کر دیں اور جو چیزیں کہ میں پسند نہیں کرتا تھا وہ اپنانا شروع کر دیں۔ مثلاً تمہیں معلوم تھا کہ میں بینگن کا بھرتہ بہت رغبت سے کھاتا ہوں۔ اور تم میرے لئے بینگن کا بھرتہ خود تیار کیا کرتی تھیں میں نے یکدم بینگن کا بھرتہ کھانا چھوڑ دیا۔ مجھے ترکاریوں میں آلو اچھے نہیں لگتے۔ جس روز آلو بنتے میرے لئے دوسری ترکاری بنتی۔ میں نے اچانک آلو کی ترکاری کھانا شروع کر دی۔ مجھے عمدہ اور قیمتی کپڑے پہننے کا شوق تھا لیکن ایک روز میں اپنے لئے گاڑھے کھدر کے کپڑے خرید لایا اور ساتھ ہی جو کا آٹا پسوا لایا میں نے گھر میں کہہ دیا کہ میرے لئے جو کی روٹی پکے گی۔ کھانے اور پہننے میں میری یہ تبدیلی کسی طبعی نکتۂ نگاہ کی وجہ سے ہوتی تو ایک معمولی بات تھی لیکن تم اچھی طرح سے جانتی تھیں کہ میں اپنے اوپر یہ جبر صرف تمہاری وجہ سے کر رہا تھا۔ اور یہ دیکھ کر تم دل ہی دل میں کڑھنے لگیں۔ کھانسی زکام ہو جانے پر میں احتیاط کے طور پر نہایا نہیں کرتا۔ جوشاندہ بنوا کر پیتا ہوں۔ یا دودھ میں بادام ابال کر پیتا تھا ایک بار دورے پر سے واپس آیا تو مجھے سخت زکام تھا تم میرے لئے چائے بنا کر لائیں۔ میں نے نہیں پی دودھ میں بادام ابال کر لائیں۔ میں نے نہیں لئے۔ اور سخت زکام ہونے کے باوجود میں نے تولیہ اٹھایا اور غسل خانے کی طرف جانے لگا۔ تم نے میرے ہاتھ سے تولیہ چھیننے کی کوشش کی میں نے تمہارا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور نہانے چلا گیا۔ میری تکلیف بڑھ گئی۔ اور میں چارپائی پر پڑ گیا۔ درد سے میرا سر پھٹا جا رہا تھا۔ اور میں ہاتھ سے اپنا سر دبا رہا تھا تم چپکے سے میرے سرہانے آئیں میرا سر دبانے لگیں میں نے تمہارے ہاتھ پرے کر دیئے۔ میرے ہاتھ پر ایک گرم گرم آنسو گرا۔ اور میں خوش ہوا کہ میرا طریقہ کارگر تھا۔

رات کو جب میں دوسرے کمرے میں سو یا تو میں چپکے سے یہ دیکھنے کیلئے آیا کہ تم رو رہی تھیں یا نہیں تمہاری سسکیوں کی آواز سن کر میں دروازے پر سے سر اونچا کئے یوں پلٹا جیسے میں نے بہت بڑی فتح حاصل کر لی ہو وہ سسکیاں مجھے اس رات کئی بار سنائی دیں لیکن میں نے اپنے اوپر ان کا کوئی اثر نہیں ہونے دیا۔ اس کے بعد بھی وہ سسکیاں مجھے اکثر سنائی دیتی رہیں۔ لیکن میں نے ہر بار اپنے آپ کو ان کے اثر سے بچا لیا۔ اب تمہارے مرنے کے بعد وہ سسکیاں جیسے ایک نئی زندگی پا گئی ہوں۔ اب ان کے ساتھ میں خود بھی سسک سسک اٹھتا ہوں۔ لیکن دیکھنے والے دیکھ نہیں پاتے انہیں میں پرسکون جو نظر آتا ہوں! میں ہر وقت اپنے کام میں مصروف رہنے کی کوشش کرتا ہوں رات کو دس ساڑھے دس بجے سے پہلے کسی کام پر سے نہیں لوٹتا۔ کبھی تو سیدھا گھر آتا ہوں اور کھانا کھانے کے بعد سو جاتا ہوں۔ اور کبھی کام پر سے دوسرے شو میں پکچر دیکھنے چلا جاتا ہوں۔ جاننے والے مجھے "من کا موجی" کہنے لگے ہیں۔ طرح طرح کی پوشاکیں بنوالی ہیں میں نے کبھی تکلف لگی پگڑی — چوڑی دار پاجامہ اور لمبا کوٹ، کبھی پتلون کوٹ نکٹائی اور ہیٹ، کبھی جواہر جیکٹ، کھدر کا کرتہ — کھدر کی دھوتی اور سر پر گاندھی ٹوپی کبھی مونچھیں چھوٹی ہوتی ہیں اور میں جوان دکھائی دینے لگتا ہوں تو کبھی بڑی بڑی مونچھیں رکھ لیتا ہوں اور ان پر تاؤ دیتا رہتا ہوں۔ میرا ہر انداز ایک بے فکرے کا سا ہے۔ میرے چہرے سے کوئی نہیں جان سکتا کہ تمہارے مرنے کے بعد مجھے اپنی زندگی میں کسی قسم کا فرق محسوس ہوتا ہے۔

ایک بار میں دورے پر سے واپس آیا تو تم مجھ سے تنہائی میں ملیں۔ بولیں۔ "بچوں کے منڈن کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے — ؟"

"کیوں ؟" سوچنا کیا ہے اس میں۔ ؟" نائی کو بلوا لو اور ان کے بال کٹوا دو —!"

میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"نہیں میں — میں تو وشنو دیوی جا کر ان کے منڈن کراؤں گی —"

تمہاری آنکھوں میں ممتا کا اشتیاق اور لہجے میں ماں کی معصوم ضد تھی —

"کوئی ضرورت نہیں —"

میں نے سختی سے منع کر دیا۔

میں خود چاہتا تھا کہ بچوں کے منڈن خوب دھوم دھام سے ہوں اور خاندانی روایت کے مطابق وشنو دیوی یا ہردوار جائیں۔ اور تم میری اس خواہش کو اچھی طرح سے جانتی تھیں۔ اور پھر میری ازدواجی زندگی کی یہ پہلی تقریب تھی۔ لیکن اسوقت تو مجھے تمہارے دل کو ٹھیس پہنچانا مطلوب تھی تمہاری خواہش کو دبا دینا مقصود تھا۔ اور تم یہ سب جان گئیں تمہارے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ تم بے چین سی اندر رسوئی کی طرف چلی گئیں۔ میں نے دیکھا تم تمام دن بے چین رہیں۔ بے چین اور گم سم۔

دو دن بعد تم نے نائی کو بلا کر بچوں کے بال کٹوا دیئے۔ شگن کے طور پر گھر میں کوئی میٹھا بھی نہ بنایا یوں ان کے بال کٹوا دیئے جیسے عام طور پر نائی سے بچوں کے بال کٹوائے جاتے ہیں۔ اور اپنے رویے سے یوں ظاہر کیا جیسے تم بہت خوش تھیں۔ بہت خوش!

دوسرے دن میں نے نوٹ کیا تم ان دنوں میری اماں کی بہت خدمت کرنے لگی تھیں — تم اس کا اگالدان اٹھا لاتیں اور صاف کر کے رکھ دیتیں۔ اس کے بستر کی چادر بدل ڈالتیں۔ اس کے کپڑے دھو ڈالتیں ماں اپنی عادت سے مجبور بڑبڑانے لگتی۔

"اری رہنے بھی دے تو —! چل ہٹ پرے بڑی بہو خود کرے گی یہ سب کچھ۔ چل ہٹ نا۔ کوئی ضرورت نہیں —"

لیکن تم ڈھیٹ بنی مسکرائے جاتیں۔ اور ماں کا کام کئے جاتیں۔ اور کام ختم کرنے کے بعد تم ماں کی چارپائی پر بیٹھ کر اس کی ٹانگیں دبانے لگتیں۔

"رہنے دے۔ رہنے دے۔!" ماں ٹانگیں ہٹانے کی کوشش کرتی لیکن تم زبردستی ٹانگیں پکڑ کر دبانے لگتیں۔ اور پھر ماں چپ سی پڑ رہتی!

میں جب ماں کے اس بڑبڑانے کے باوجود تمہارے چہرے پر مسکراہٹ دیکھتا تو مجھے اپنی شکست اور تمہاری فتح کا احساس ہونے لگتا۔ میں چاہتا تھا کہ ماں کے اس برتاؤ کے جواب میں تم پہلے کی طرح کڑھتی ہوئی نظر آؤ۔ تمہارا چہرہ غمگین اور اداس نظر آئے۔ تمہاری آنکھیں بے چین نظر آئیں — لیکن نہ جانے کیا بات تھی تم اب ہر وقت خوش نظر آتی تھیں۔

میرے ماموں کے لڑکے کی شادی تھی میں آٹھ دس روز کی چھٹی پر گھر آیا ہوا تھا ایک دن میں اپنے اس بھائی کے ساتھ شادی کے لئے کچھ سامان خریدنے کیلئے شہر جانے لگا تو ماں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ بولی۔

"تو شہر جا رہا ہے سیتارام —؟"

"ہاں — ماں!"

"اچھا تو یہ لے بیس روپے! — اور بہو کیلئے بھی ایک ساڑھی لیتا آ —"

میں حیرت سے ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

"یوں دیدے پھاڑ کر کیا دیکھ رہا ہے رے کبھی تو نے یہ بھی سوچا کہ بہو کو بھی کپڑوں کی ضرورت ہے؟ تو نہیں لا دے گا تو اور کون لا کر دے گا۔ لے پکڑ روپے اور ایک اچھی سی ساڑھی لے آ۔ ہاں"

اور میں بہت سا ہنا ماں کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اور مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ کب میرے ہاتھ میں ماں نے بیس روپے تھما دیئے۔

عجیب ہوتی ہیں یہ عورتیں بھی! میں دو دن شہر رہا اور تمام وقت ماں کے رویئے میں اس تبدیلی کے بارے میں سوچتا رہا! مجھے حیرت تو ہو ہی رہی تھی لیکن ساتھ ہی ایک عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ دل چاہتا تھا گانے لگوں۔ ناچنے لگوں۔ اور سچ مچ بازار میں سے گذرتے ہوئے میں کئی بار گنگنا اٹھا۔ میں نے اپنے لئے کپڑے خریدے تو اس رقم میں سے بھی پیسے بچا کر میں نے تمہارے لئے بیس روپے کی بجائے چالیس روپے کی ایک بڑھیا سی ساڑھی خرید لی۔ اور پھر میں نے تمہارے لئے بندی، پوڈر، نیل پالش، رومال ایک ایک عمدہ سی جوتی بھی خرید لی — میں بہت خوشی محسوس کر رہا تھا مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی چند ہی روز پہلے میری شادی ہوئی ہو!

میں نہایت خوش خوش گھر پہنچا لیکن گھر آنے پر معلوم ہوا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں اور اندر چارپائی پر لیٹی ہو۔ میں سیدھا تمہارے پاس آنا چاہتا تھا۔ تم بیمار تھیں مجھے تمہارے پاس جانا ہی چاہیئے تھا لیکن جو سخت قسم کی دیوار میں اپنے گرد بنا چکا تھا وہ یوں سب کے سامنے توڑنی بہت مشکل تھی۔ میں جھجک گیا۔ شادی کے اس ہنگامے میں جب کہ بہت سے رشتہ دار ہمارے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے تم سے ملنا ویسے ہی بہت مشکل تھی۔ میں تم سے تنہائی میں نہ مل سکا میں کتنے ہی عرصے سے تمہارے کمرے میں نہ سویا تھا میں ان دو دنوں میں بھی تمہارے کمرے میں نہ سو سکا بس ایک بار وہ بھی چند رشتہ دار عورتوں کی موجودگی میں، تم سے تمہاری طبیعت کے بارے میں پوچھ سکا۔ "کیا حال ہے؟" اور تم نے اسی لہجے میں جواب دیدیا — "ٹھیک ہوں"

اور شادی ختم ہونے کے بعد ہی مجھے واپس ملازمت پر آ جانا پڑا۔ اور پھر اچانک مجھے تمہاری خطرناک حالت کا تار ملا۔

تمہاری چارپائی کے پاس سب لوگ بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر جواب دے گیا تھا ڈاکٹر نے بتایا کہ تمہارا دل بہت کمزور ہو چکا تھا تم چند گھڑیوں کی مہمان تھیں! — میری ماں پہرے چارپائی پر لیٹی آنسو بہا رہی تھی اور پاس کی چارپائی پر میں حسرت بھری نگاہوں سے تمہیں دیکھ رہا تھا — اچانک تم نے آنکھیں کھول دیں اور میری طرف دیکھنے لگیں۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔ تم مسکرا دیں۔ ایک بے بس سی، پھیکی سی مسکراہٹ!

اور پھر تم نے اپنا سوکھا زرد ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"یہ تو — یہ تو میں — جانتی ہوں — آپ — آپ دوسری شادی نہیں کریں گے؟"

تم نے جیسے اپنی تمام قوت کو سمیٹ کر قوت گویائی میں بدل ڈالنے کی کوشش کی تھی — میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے!

تم غور سے مجھے دیکھنے لگیں — جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ تمہیں شاید میرے آنسوؤں کو دیکھ کر دھوکا ہو رہا تھا کہ یہ میں ہی تھا یا کوئی اور؟

میں نے بہت چاہا۔ تم سے کہوں۔ مجھے تم سے پیار تھا۔ مجھے تم سے پیار ہے مجھے تم سے ہمیشہ پیار رہے گا۔ میں اپنے پیار کو جان نہ سکا۔ میں اپنے آپ کو جان نہ سکا۔ میری اداکاری نے مجھے بھی اپنے آپ سے چھپا لیا۔ جب تم موت کے نزدیک پہنچیں تو میں نے جانا کہ میں تم سے پیار کرتا تھا لیکن میں یہ سب کہہ نہ سکا۔ میں کچھ بھی کہہ نہ سکا —! ہاں میری نگاہوں نے شاید تمہیں سب کچھ بتا دیا تھا اور اب تمہاری آنکھوں میں حیرت کی جگہ اطمینان تھا۔ اس بات کا اطمینان کہ میں تمہارا تھا — اور یہ دیکھ کر مجھے کتنی راحت محسوس ہوتی تھی! لیکن تمہارا یہ اطمینان اور میری یہ راحت یکدم دکھ میں بدل گئی۔ تم مجھے چھوڑ کر جا رہی تھیں — مجھ کو۔ بچوں کو — گھر کو — سب کو — چھوڑ کر جا رہی تھیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے!

تمہاری آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تمہارے پپڑی جمے سیاہ ہونٹوں میں سے پھڑپھڑاتی ہوئی سی ایک کمزور آواز نکلی۔

"آپ سے — آپ سے — اب مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ ان بچوں کا — خیال رکھیئے گا"

اور پھر تم خاموش ہو گئیں۔ اس کے بعد تم کچھ نہ بول سکیں صرف دیکھتی ہی رہیں۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں مجھ سے پوچھتی رہیں۔ ان بچوں کا خیال رکھیئے گا نا آپ —؟ وعدہ کیجئے ان کا خیال رکھیئے گا —؟"

اور تمہاری نگاہوں میں یہ سوال منجمد ہو کر رہ گیا!

بھائی صاحب اور گھر کے دوسرے افراد مجھ سے دوسری شادی کیلئے اصرار کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں مجھے کبھی تم سے محبت تھی ہی نہیں اور اب تمہاری یاد بھی میرے دل میں نہ ہوگی۔ میں انہیں کیسے بتاؤں کہ میں تمہاری یاد کو سینے سے لگائے ہوئے ہوں! میری یہ خود غرضی، میرا یہ بے فکرا پن صرف اس وجہ سے ہے کہ دیکھنے والوں کی نگاہوں سے میری محبت اسی طرح چھپی رہے جیسا کہ پہلے چھپی ہوئی تھی۔ اپنے دکھ اپنے ہی تک محدود رکھنے سے مجھے میرا دکھ ہمیشہ تازہ محسوس ہوتا ہے!

وہ میرے بچوں کی دیکھ بھال نہیں کرنا چاہتے نہ کریں۔ میں ان کو یہاں لے آؤں گا۔ اپنے پاس رکھوں گا۔ آج سے میں ان کا باپ ہی نہیں ان کی ماں بھی ہوں۔ ٭



اردو کا مزاحیہ ادب

دیوندر اسر

انسان کی زندگی میں مزاح کو ایک اہم مقام حاصل ہے ادب میں مزاحیہ تحریروں کی وہی اہمیت ہے جو اسکی دوسری اصناف کی ہے بدقسمتی سے اردو کی بیشتر مزاحیہ تحریروں کا معیار ایسا نہیں کہ انھیں ادب کے زمرے میں شامل کیا جاسکے شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اکثر تخلیقی ادیب مزاحیہ ادب کو دوسرے درجہ کی چیز سمجھتے ہیں جس کے بعد آج بھی طنز وظرافت پر صحافت کا رنگ غالب ہے۔ دراصل اردو میں مزاحیہ تحریروں کا باقاعدہ آغاز ہی صحافت کے میدان میں ہوا ہے۔ تاریخی طور پر جس کی مثال اودھ پنچ کی اشاعت ہے۔

اودھ پنچ سے پہلے اور بعد میں اردو میں بیسیوں مزاحیہ پرچے نکلے اور بند ہوئے۔ لیکن جو مقبولیت اودھ پنچ کو نصیب ہوئی کسی دوسرے پرچے کو حاصل نہ ہو سکی۔ اس کے معاونین میں رتن ناتھ سرشار۔ منشی سجاد حسین۔ نواب سید محمد آزاد۔ اور اکبر الہ آبادی جیسے پختہ کار ادیب سر فہرست تھے۔ ان کے علاوہ تربھون ہجر۔ مجھو بیگ ستم ظریف جوالا پرشاد برق۔ احمد علی شوق۔ عبد الغفور شہباز اور سید محفوظ علی بھی اس کاروان میں شریک تھے سرشار اس کارواں کے سالار تھے ان کی زندہ جاوید طویل داستان فسانہ آزاد انکی تخلیقی صلاحیت کا شاندار کارنامہ ہے خوجی کا کردار اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود اردو کے سارے مزاحیہ کرداروں پر حاوی ہے۔ سجاد حسین کا طنز سیاسی تھا۔ ان کی شہرت کا باعث ان کا ناول حاجی بغلول ہے اس ناول کے ذریعہ انھوں نے ایک اور مزاحیہ کردار سے روشناس کرایا۔ سرشار۔ سجاد حسین اور محفوظ علی میں خالص ظرافت کے نمونے ملتے ہیں۔ محفوظ علی کا طنز مودبانہ طرز اور انداز فکر لئے ہوئے ہے۔ محمد آزاد کی ظرافت میں قدرے زیادہ گہرائی اور شگفتگی ملتی ہے شاعروں میں اکبر الہ آبادی میں شدت جذبات اور فنی شعور کی فراوانی ملتی ہے اکبر میں رعایت لفظی محاورے کا چٹخارہ اور فقرے بازی کے عناصر خوب ملتے ہیں لیکن انکی تحریروں میں بھی گہرائی کا فقدان ہے۔ اودھ پنچ کے دوسرے مزاح نگاروں میں بھی فکر کی پختگی، اور فنی شعور کی کمی کھٹکتی ہے۔

دراصل اودھ پنچ کا بنیادی مقصد سیاسی بیداری تھا۔ اور وہ مغربی زندگی کی بڑھتی ہوئی رو کو روکنا چاہتا تھا اس مقصد کے حصول کیلئے ان ادیبوں نے طنز وظرافت کا سہارا لیا اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف صلاحیتوں اور موضوعات کے تنوع کے باعث پرچے میں کچھ رنگا رنگی تو آگئی لیکن بنیادی طور پر نقطۂ نظر کی یکسانیت کے باعث پرچہ قدامت پرستی کا شکار ہو گیا۔ مجموعی طور پر پرچے کی ظرافت میں لطافت اور طنز کی گہرائی کی کمی تھی الفاظ کی شعبدہ بازی پر زیادہ زور دیا جاتا تھا اور معنویت کو بارہا نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ لیکن پرچے کو دلچسپ بنانے کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا۔ اودھ پنچ کے ہی ایک شاعر کا شعر ملاحظہ ہو۔

مزا عجب ہے کچھ اس پرچہ میں کہ صورت طفل
جوان و پیر کے منہ سے ٹپک رہی ہے رال

اودھ پنچ کے بارے میں چکبست نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"قوموں کے مذاق سلیم نے جو ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم اودھ پنچ کی ظرافت کو بحیثیت مجموعی اعلےٰ درجے کی ظرافت نہیں کہہ سکتے۔ لطیف ظرافت اور بزلہ سنجی و تمسخر میں بہت فرق ہے اگر لطیف ظرافت کا رنگ دیکھنا ہے تو اردو زبان کے عاشق کو غالب کے خطوط پر نظر ڈالنا چاہیئے۔ اودھ پنچ کے ظریفوں کی شوخی وطرارئ طبیعت کا رنگ دوسرا ہے۔ ان کے قلم سے پھبتیاں ایسی نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر ان کا ہنسنا غالب کی زیر لب مسکراہٹ سے الگ ہے۔ یہ خود بھی نہایت بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہیں اور دوسروں کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ مکاتیب غالب نے لطیف مزاح کا جو معیار پیش کیا تھا اودھ پنچ اسے قائم نہ رکھ سکا۔ غالب کے خطوط انکی شوخی تحریر لطف بیان تخیل کاری، بے ساختگی اور بالغ نظری کے زندہ جاوید نمونے ہیں۔ ادبی نقطۂ نظر سے غالب کی انشاء کا درجہ اتنا بلند ہے کہ ان کے بعد آنے والے ادیب اس معیار کو نہیں پہنچ سکے غالب سے قبل طنز وظرافت کے معنی تمسخر اور ابتذال تھا غالب نے اپنی شاعری میں اس روایت کو توڑا اور حسن لطافت سے اس فن کو روشناس کرایا۔ یہاں سودا کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اگر سودا دل کی بھڑاس نکالنے اور ذاتی بغض کی فکر میں نہ رہتے تو ان کا ہجویہ کلام بھی طنز وظرافت کا اچھا نمونہ بن سکتا تھا۔

اودھ پنچ کے دور میں ہی ریاض خیر آبادی نے "فتنہ" اور "عطر فتنہ" نکالے۔ گو ان پرچوں کا معیار بھی بلند نہیں تھا۔ لیکن ریاض کی شگفتہ بیانی نے انہیں کسی حد تک مقبول بنا دیا۔ یہ پرچے اودھ پنچ سے زیادہ سنجیدہ تھے۔ اس کا مقصد اصلاح یا سیاسی بیداری نہیں تھا بلکہ آسودگیٔ ذہن تھا۔ کافی مدت کے بعد ایک سنجیدہ مزاحیہ پرچہ چراغ حسن حسرت کی زیر ادارت "شیرازہ" کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں موضوعات اور اسلوب

بیان کی ادبی اور علمی حیثیت پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ جس کے باعث پرچے کے مزاح میں وقار اور رچاؤ پیدا ہو گئے۔ دورِ حاضر میں پندرہ روزہ "نمکدان" نے مزاحیہ پرچوں کی کمی کو کسی حد تک پورا کیا۔

جہاں ایک طرف مزاحیہ پرچے شائع ہوتے رہے دوسری طرف روزناموں اور جرائد میں مزاحیہ کالم بھی لکھے جاتے رہے۔ جو پڑھنے والوں میں کافی مقبول ہوئے۔ ان کالموں کے بغیر اخبار ادھورا سمجھا جاتا ہے ظاہر ہے کہ روزناموں کے لئے لکھے جانے والے مزاحیہ کالموں میں صحافتی رنگ غالب رہے گا۔ ان کالموں کے لکھنے والوں میں ایسے ادیب بھی شامل ہیں جو مزاح نگاری زبان کا مزا بدلنے کے لئے یا صحافتی پیشے کے باعث کرتے ہیں۔ محمد علی جوہر، ظفر علی خاں، عبدالمجید سالک، عبدالماجد دریابادی، چراغ حسن حسرت، احمد ندیم قاسمی، مجید لاہوری، فکر تونسوی، حیات اللہ انصاری کے مزاحیہ کالم کافی مقبول ہوئے ہیں۔ ان کالموں میں کبھی کبھی مزاح نگاری کی جھلک بھی مل جاتی ہے لیکن بنیادی طور پر یہ صحافتی کالم ہیں۔

اردو کے خالصتاً مزاح نگار غالب، سرشار، سجاد حسین، محفوظ علی، پطرس، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی ہیں۔ ان کا مقصد اصلاح نہیں بلکہ ظرافت نگاری ہے غالب، پطرس اور رشید احمد صدیقی کا مزاح ادبی خصوصیات کا حامل ہے اس لئے ان کی تحریروں کا درجہ دوسرے مزاح نگاروں کی تحریروں سے بلند ہے۔ غالب کے خطوط کے بارے میں مولانا حالی کی رائے کتنی صحیح ہے۔

"وہ چیز جس نے ان مکاتیب کو ناول اور ڈرامے سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے وہ شوخیٔ تحریر ہے جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم دیکھتے ہیں بعض لوگوں نے خط و کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے اور اپنے مکاتیب کی بنیاد بذلہ سنجی اور ظرافت پر رکھنی چاہی ہے۔ مگر ان کی اور مرزا کی تحریر میں وہی فرق ہے جو اصل اور نقل یا روپ اور بہروپ میں ہوتا ہے۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور قوت متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے اسے مرزا کے دماغ سے وہی نسبت تھی جو قوتِ پرواز کو طائر کے ساتھ۔"

پطرس اور رشید احمد صدیقی نے مزاح کو شائستگی کا درجہ دیا۔ پطرس کے مزاح میں علمیت کے بجائے سادگی اور دلکشی ہے وہ اپنی تحریروں میں ڈرامائی طرز سے دلچسپی پیدا کرنے میں ماہر ہیں۔ غالب کے خطوط کے بعد شاید پطرس کے مضامین ہی اردو ادب میں مزاح نگاری کی صحت مند روایت کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ پطرس بالغ نظری اور گہری شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی ظرافت میں زیرِ لب تبسم، ہلکا ہلکا مزاح ملتا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر نہایت لطیف اور دھیما ہے۔

رشید احمد صدیقی کے طنز کی زد میں ہر وہ حالت آتی ہے جو انسان کے دکھوں کا باعث بنتی ہے بے ساختگی، جوش، غور و فکر، سنجیدگی، خیالات کی گہرائی رشید احمد صدیقی کی تحریروں کی خصوصیات ہے۔ ان کی ظرافت ہمیں دعوتِ فکر دیتی ہے۔ اور زندگی کے بارے میں ہمیں سنجیدہ بناتی ہے۔ لیکن بسیار نویسی کا شکار ہونے کے باعث وہ بھی اپنے معیار کو قائم نہ رکھ سکے۔

شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی کی مزاحیہ تحریریں کافی مقبول ہوئی ہیں لیکن ان کی ادبی حیثیت بہت کم ہے کلیم الدین احمد نے ان کی ذہنیت کو "انڈر گریجویٹ" کہا ہے۔ شوکت تھانوی میں زبان اور محاورے کا مزاح تو ہے۔ لیکن موضوع اور خیال کی سطح پر ان کی تحریریں کمزور ہیں۔ ان میں زندگی اور فن کے بارے میں سنجیدہ نقطۂ نظر کی کمی ہے۔ وہ اصلاح میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ محض قارئین کے غم کو غلط کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے وہ سیدھے سادے خیالات کا اظہار ہی کرتے ہیں۔ شوکت تھانوی روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں مزاح پیدا کرنے میں ماہر ہیں۔ عظیم بیگ چغتائی کا مقصد بھی محض ہنسنا ہنسانا ہی تھا۔ وہ ہلکی پھلکی چیزیں لکھتے تھے اور ادب میں کھلنڈرے پن کے عکاس تھے۔ یہ دونوں حضرات بسیار نویسی کا شکار اس حد تک ہوئے کہ ان کی تحریریں بے مزہ اور بے معنی ظرافت کا نمونہ بن کے رہ گئیں۔

کچھ مزاح نگار اصلاح کے جذبے سے متاثر تھے۔ انھوں نے سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کے لئے طنز و ظرافت کے حربے کا استعمال کیا۔ انسانی کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے یہ ظرافت کے بجائے طنز کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ سید محمد آزاد اور اکبر الہ آبادی میں یہی جذبہ کارفرما تھا۔ ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خاں نے ایسے ہی طنز کو وسیلہ بنایا۔ مولانا ظفر علی میں جذبات کی شدت نہیں لیکن ان میں بیان اور خلوص کی قوت موجود ہے۔ سیاسی طنز میں ابوالکلام آزاد کے بعد شاید انھیں کا درجہ ہے۔ لیکن انھیں وہ شہرت نصیب نہیں ہو سکی جو آزاد کے حصہ میں آئی ہے۔ کیونکہ ان کے موضوعات زیادہ تر ہنگامی حالات سے متاثر ہوتے تھے۔ مغرب کی سیاست اور ریاکاری پر ان کا طنز زیادہ گہرا نہیں۔ اس کے برعکس مولانا آزاد کی انشاء کو انسان دوستی زندگی کے تجربہ کی گہرائی وسعتِ نظر اور نظریاتی پختگی نے ایسے مقام پر پہنچا دیا ہے۔ جہاں ان کا کوئی مقابل نظر نہیں آتا۔ آزاد کی تحریریں پرزور، پرشکوہ، اور جوش سے بھرپور ہیں۔ اپنے علم اور بلند آہنگ کے باعث ان کی تحریروں کا اثر زیادہ دیرپا ہوتا ہے۔ اس کا طرزِ بیان اور فکر انفرادیت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ اردو ادب میں اس قسم کی خلوص سے بھرپور شدتِ جذبات سے لبریز اور بلند خیالات کی حامل طنزیہ تحریریں دوسرے کسی ادیب میں نظر نہیں آتی

بہت کم مزاح نگار ایسے ہیں جن کی تحریروں میں فلسفیانہ رنگ کی آمیزش ہے۔ ان کا اندازِ بیان بھی شعور کا حامل ہے اور ادبی حیثیت رکھتا ہے۔ ان ادیبوں کا مقصد اپنے طنز و فکر کی اشاعت ہے جسے وہ فنی ضبط، خلوص اور گہرائی سے پیش کرتے ہیں۔ ان میں سلطان حیدر جوش اور سجاد انصاری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ قاضی عبدالغفار نے بھی اسی رنگ میں لکھا ہے۔ انکی تحریروں میں سنجیدگی پختگی اور گہرائی ہے۔ جوش انگریزی مصنفین سے متاثر ہونے کے باعث اپنی تحریروں میں نئی زندگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ انکی ظرافت میں فکر کی گہرائی موجود ہے۔ اس کا لہجہ بھی پر وقار اور سنجیدہ ہے۔

اردو میں زندہ مزاحیہ کرداروں کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے بعض مزاح نگاروں نے مزاحیہ کردار پیش کئے ہیں لیکن انکی کوئی واضح شکل نہیں۔ خوجی، حاجی بغلول، چچا چھکن، مرزاجی، قاضی جی، مرزا ظاہر دار بیگ، منشی جی۔ مزاحیہ کردار ہمارے سامنے ہیں۔ لیکن سوائے خوجی کے اور کسی کردار کو یہ فخر حاصل نہیں کہ وہ بدلتے ہوئے دور میں بھی، زندہ رہ سکے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ خوجی کا کردار مکمل ہے بلکہ یہ کہ یہ کردار اپنے معاشرے کا نمائندہ کردار ہے اور اس کی تخلیق میں سرشار نے اپنی تخلیقی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔ شفیق الرحمٰن نے شیطان کے کردار سے قارئین کو روشناس کرایا جو اوپر کے طبقہ کا نمائندہ ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور جدید ہے۔

جدید دور کے ادیبوں میں منٹو، کنہیا لال کپور، کرشن چندر، اے حمید، شفیق الرحمٰن، ابراہیم جلیس، فکر تونسوی مسعود مفتی، امجد حسین، محمد خالد اختر، احمد جمال پاشا، مشتاق احمد یوسفی، عطیہ پروین اور نظیر صدیقی نے مزاح کے اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔ شاعری میں ظریف جبلپوری راجہ مہدی علی خاں، مجید لاہوری، شاد عارفی، سید محمد جعفری اور دلاور فگار نے اس فن کو آگے بڑھایا ہے۔ ان میں سے کئی ادیبوں نے پیروڈی کے میدان میں بھی کامیاب تحریریں پیش کی ہیں۔

منٹو کے طنز میں ایک زخم زدہ شخصیت کی تلخی اور تندی ہے۔ منٹو کے طنز کا نشانہ انسان کی ریاکارانہ ذہنیت ہے۔ کرشن چندر نے ہلکے پھلکے انداز میں رومانی طنز کے انشائیے پیش کئے ہیں۔ ان کے افسانے میں بھی مزاح کی ہلکی، پھلکی آمیزش ملتی ہے۔ فکر تونسوی اور کنہیا لال کپور نے طنز و ظرافت کو باقاعدہ فن کی شکل دی ہے اور ادبی معیار کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ابراہیم جلیس اور محمد خالد اختر میں مزاح کے بجائے طنز کی کاری ضربیں ہیں۔ امجد حسین اور نظیر صدیقی نے بھی مزاحیہ ادب کو سنجیدگی سے پیش کیا ہے اے حمید شفیق الرحمٰن اور مسعود مفتی کا اندازِ تحریر نہایت شگفتہ اور دلپذیر ہے۔ ان کی تحریروں میں طنز کے بجائے مزاح کی شوخی غالب ہے۔ شاد عارفی اور سید محمد جعفری باشعور اور فنی طور پر بلند مزاحیہ شاعری کی تخلیق کرتے ہیں۔

لیکن چند مضامین کو چھوڑ کر اب یہ ادیب بھی اپنے معیار کو قائم نہ رکھ سکے۔ حالانکہ موجودہ دور کی زندگی اور معاشرہ مضحکہ خیز حد تک مزاحیہ پہلوؤں کا حامل ہے۔ زندگی کی اعلیٰ قدروں کا فقدان، معاشرہ کی منافقت اور سیاست کی دورنگی ایسے مسائل ہیں جو بھرپور طنز اور ظرافت کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ —





لالہ شہرت دین ہوکا

احمد جمال پاشا

نام شہرت دین، ہوکا تخلص کرتے تھے۔ قوم کے بنئے تھے۔ پیشہ آبا آڑیاں بنانا اور ڈنڈی مارنا، انہی کے بزرگوں میں لالہ بھوت کال علاؤالدین خلجی کے زمانہ میں گذرے تھے جن کے دونوں ہاتھ کم تولنے کی سزا میں قلم کردیئے گئے تھے مگر اس کے باوجود ان کے خاندان میں ہاتھ دکھانے کا سلسلہ جاری رہا۔

لالہ جی نے جب ہوش سنبھالا تو غلہ سے زیادہ منافع کا کاروبار شعر و ادب دیکھ کر اپنی دوکان شعر خوانی بازار میں اٹھا لائے۔ مگر جب ہوکا پورا نہ ہوسکا تو بازار کا بھاؤ دیکھ کر نظم سے نثر پر اتر آئے۔ جلد ہی کاروبار جم گیا اور دوکان چلنے لگی۔ منافع خوری، رشوت اور ڈنڈی ماری کا پشت ہا پشت کا تجربہ کام آگیا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ رشوت منافع خوری اور چور بازاری وغیرہ کا آنکھوں دیکھا حال لکھ لکھ کر دھوم مچادی۔

لالہ جی نے کاروباری سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے روزگار شروع کرنے سے پہلے ہی کاروبار شعر و ادب کے سارے چور دروازے دیکھ لئے، عظمت اور شہرت ہتھیانے کے تمام گر انھوں نے سمجھ لئے تھے۔ چنانچہ اس کوچے میں قدم رکھتے ہی ان کا طوطی بولنے لگا۔ جہاں طوطی نہ بول پاتا وہاں وہ خود بولتے۔

دوکان کی رونق بڑھانے کے لئے شہرت دین نے ادبی دورے، ادبی جلسے، ادبی ہنگامے اور ادبی دنگل شروع کردیئے۔ اس کے بغیر یوں بھی ہوکا پورا ہونا ممکن نہ تھا اگر شہرت دین کو معلوم ہوجاتا کہ راس کماری کے ہائی اسکول کے طلبا اسکول کی طرف سے میگزین نکالنے جارہے ہیں تو وہ پہلے مبارکباد اور دل بڑھاوے کا خط، ذاتی پیغام تاثرات کی تصویر اور اپنی تخلیقاتِ عالیہ بغیر طلب کئے بھیجدیتے اس کے بعد راس کماری کا طوفانی دورہ کرکے اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور میگزین کے ایڈیٹر کو اس وقت تک گھیرے رہتے جب تک کہ اس میں ان کا کچھ نہ کچھ چھپ نہ جائے۔ اسکول کالج پر موقوف نہیں کوئی بھی رسالہ اردو کے کسی کونے کترے سے نکلے جب تک یہ اس میں اپنے کو چھپوا نہ لیتے اور اس کے ایڈیٹر سے ملکر اور اس کو اپنی ادبی خدمات سے پورے طور پر واقف نہ کرا لیتے اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتے۔ چاہے اس پر کتنی لاگت کیوں نہ آتے مگر وہ نہ دل تھوڑا کرتے اور نہ ہمت ہارتے پھر ان ایڈیٹروں سے خوشگوار تعلقات استوار رکھنے کے لئے شہرت دین رسالے کی تعریف مبارکباد کے کارڈ اور لمبے چوڑے تبصرے برابر بھیجتے رہتے۔ شہرت دین خیال کی رفتار سے لکھتے اور چھپتے۔ اور ظاہر ہے کہ اگر اتنا نہ لکھتے تو محلہ کے بنئے کے بیان کے مطابق ان کے مرنے کے بعد بجائے چند حسینوں کے خطوط اور کچھ تصویر بتاں کے دس ٹرک ردی نہ نکلتی۔

علمی ادبی رسالوں سے لیکر کامیاب مرغی خانہ رسالہ ہومیوپیتھک اور انجمن حجام کے ترجمان تک ہر رسالے کی فہرس پر سب سے پہلا نام لالہ شہرت دین ہوکا کا نظر آتا ان رسائل میں ان کے خود ساختہ انٹرویو ادبی جلسوں اور سرگرمیوں کی فرضی رپورٹیں نفتلی بیانات اور من گھڑت حالات زندگی برابر نظر آتے۔

لالہ جی نے کاروبار شعر و ادب کو جمانے کے لئے پہلا فری اشٹائل ہاتھ یہ دکھایا کہ ایسے شاعروں اور ادیبوں کو اپنے گرد جمع کرلیا جو پچھلی نصف صدی سے بحر ادب کی سطح ناپید کنار پر ابھرنے کی ناکام کوشش میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ شہرت دین نے ان سب کی بلا چون

عظمت مان لی۔ اور اس کے بدلے ان سب نے لالہ جی کی شہرت تسلیم کر لی۔

اس کے بعد بلا تخصیص کہ لکھتا بھی ہے یا نہیں لالہ جی نے شاگردوں کی ایک فوج ظفر موج بھرتی کر لی اگر شاگرد لکھنے سے معذوری کا اظہار کرتا تو شہرت دین کہتے۔

"آخر اس سے کیا ہوتا ہے ہمکو خود استاد زندگی بھر کہہ کہہ کر دیتے رہے۔ انڈو پاک بنا گئے۔ استاد نہ مرتے تو ہم کو کب سے شاعری چھوڑنا پڑتی۔ جب تک ہم زندہ ہیں فکر کی ضرورت نہیں۔ لکھ نہیں سکتے تو کیا ہوا ساتھ تو رہ سکتے ہو۔"

ادھر استاد ہوکا پر ادب کے کسی کونے سے حملہ ہوا اور شاگردوں کی فوج کو کوچ کا حکم دے دیا گیا کہ خبردار جانے نہ پائے۔ بہادروں جانیں دے دو استاد کے خلاف جو کچھ لکھا گیا تھا اس کا دندان شکن جواب شاگرد استاد سے لکھوا کے بھیج دیتے اور دم بھر میں بڑے سے بڑا علامہ اپنی پگڑی بچانے کے لئے نو دو گیارہ ہو جاتا۔

استاد ہوکا میدان ادب کے رانا سانگا تھے بے شمار مرے سے مر گئے۔ دوسروں کو مارا خود زخمی ہوئے مگر کبھی ہتھیار نہ ڈالے کاغذی جنگ میں نہ جیت پاتے تو گوریلا لڑائی شروع کر دیتے۔ حریف کی سات سات پشت آگے پیچھے ایسی خبر لیتے کہ غنیم بوکھلا جاتا۔

استاد جس سے خوش ہو جاتے اس کی عظمت کے ڈنکے بجاتے جس سے ناراض ہوتے اس کو ادیب یا شاعر نہ خود مانتے نہ دوسروں کو ماننے دیتے۔ مگر مانتے صرف اسی کو جو ان کو مانے اور ماننے بھی لکھ کر نہ کہ زبانی۔

استاد خود اپنا ایک "یادگار نمبر" ترتیب دے رہے تھے اس میں جو کچھ بھی ان پر دوسروں کو لکھنا پڑا تھا وہ سب محفوظ تھا۔ استاد اسے صبح اٹھ کر دیکھتے اور روتے کہ اس کے بہت سے صفحات ابھی خالی ہیں۔ اس میں استاد کی نظم و نثر کے شاہکار، مشاہیر کی ان کے بارے میں رائے، خطوط، تصاویر، حالات اور نہ جانے کیا کیا الم غلم بھرا ہوا تھا۔ استاد ہر ایڈیٹر کو گھیر گھار کر اپنے گھر لاتے اور رجسٹر دکھا کر اسے مجبور کرتے کہ "میرا نمبر" نکالو۔ پورا ایڈیشن خرید لینے کی لالچ دیتے، رسالہ کی مالی امداد اور چندے دلوانے کے سبز باغ دکھاتے مگر اس کے باوجود کوئی سر پھرا اس بار گراں کو اٹھانے پر راضی نہ ہوا۔ اس کے بعد استاد ہوکا نے بطور قلمی نسخہ اسے کسی لائبریری میں محفوظ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ استاد ہوکا کے اچانک انتقال کے بعد ان کے کسی شاگرد نے استاد کے مرنے کے بعد بھی ادبی دنیا میں جمے رہنے کے خیال سے یہ رجسٹر پار کر دیا اور اس طرح ادبی دنیا ایک "یادگار نمبر" سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی۔

استاد ہوکا اپنی شہرت برقرار رکھنے کے لئے بڑے بڑے پینترے دکھاتے شاگردوں کے بعد کی صف کو یقین دلاتے کہ ہم بھی نئی نسل کے بزرگوں سے رونا روتے کہ پرانی نسل کو کون پوچھتا ہے اور برابر والوں پر کڑی نظر رکھتے کہ ادھر کوئی جوان ذرا بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرے اور اسے فوراً ٹنگڑی مار دی جائے۔ شہرت دین نے نہ جانے کتنے ہونہار ادیبوں سے لکھنے پڑھنے سے توبہ کروا دی۔ اب اگر اچھا لکھنے کی کوشش کی تو شاگردوں سے ہاتھ پیر توڑ وا دیئے جائیں گے۔

شہرت دین کو ادبی تھیٹر لگانے کا بڑا ہوکا تھا مگر اسمیں صرف انہی کو بلاتے جو استاد کی صرف تعریف کریں شامت کی مار اگر کوئی اصول وصول کی بات اور تنقید کر بیٹھے تو استاد کے فرمانبردار شاگرد فوراً برخوردار کی گردن میں ہاتھ دے کر باہر کر دیتے۔

لالہ شہرت دین ہوکا ابھی کل تک بالکل بھلے چنگے تھے۔ ان کی اچانک موت پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا مرے بھی تو سیفے میں۔ صاحب تذکرۂ احمقاں نے

"اس کو شہرت کا ہوکا ہو گیا"

سے مادہ تاریخ نکالی۔ اور عاقل دانا پوری نے

"خس کم جہاں پاک"

سے تاریخ نکالی۔

استاد ہوکا کے مرنے کی خبر کسی اخبار یا رسالہ نے نہیں چھاپی۔ مگر اس میں قصور غلطی استاد کا ہے ایڈیٹر لوگ عادی ہو چکے ہیں کہ جب تک استاد نہ گھیریں تب جان بچانے کے لئے استاد کو چھاپیں۔ نہ کہ نمبر نکالنا۔ استاد ہوکا کے شاگردوں اور پارٹی ممبروں نے کوئی تعزیتی جلسہ تک نہیں کیا۔ البتہ بہت سے رسالوں نے استاد ہوکا کے مرنے کی خبر سنکر فوراً اپنے رسائل کی ضخامت کم کر دی کیونکہ بیشتر حصہ استاد اوران کے گروپ کا ہوتا تھا۔

میں نے اسی امید پر استاد ہوکا پر اپنے تاثرات قلم بند کئے تھے کہ استاد پر نکلنے والے نمبروں میں دیکھیں گے مگر ابھی تک باوجود کوشش کے کوئی صورت نہ نکل سکی۔

شیر افضل جعفری

غزل

جوانی کے تقاضے مفلسی میں
پپیہے کُوکتے ہیں بے کسی میں

مری گونگی کراہیں خامشی میں
کہ جیسے کنکرے گہری ندی میں

مجھے آوارگی راس آگئی ہے
پناہیں ڈھونڈلی ہیں بے گھری میں

فضا چمکارتی ہے آدمی کو!
محبت کی اندھیری کوٹھڑی میں

تماشا ہے کہ عالم آفریں نے
چھُپا رکھی ہے سولی زندگی میں

تخیّل کی جواں مرگی پہ افضل
ترنم چیخ اٹھا شاعری میں

عابد صدیقی



سادھو کی بانی

عابد جی کل یوں کہتے تھے اک سادھو کی بانی
دور دور سے جس کے درشن کو آتے تھے گیانی

اک دن اس سے سب نے پوچھا "جیون کیسے بیتے؟"
من بھی مارا، مٹی ہو گئے، دنیا ساری چھانی

بادل بادل گھومے لیکن چاند کا کھوج نہ پایا
نگری نگری پھر کر دیکھا، رام ملے نہ رانی

جنگل جنگل دھول اڑائی، مکتی پھر نہ پائی
من کا مول نہ جانے کوئی، یہ ہے رام کہانی

سادھو بولا "من مارے سے رام ملن نہ ہوئے
من کو اجلا کرنا سیکھو، جیسے بہتا پانی،

مٹی پاؤں چھونا جانے، پانی پاؤں دھونا
من کو مٹی کرے ہے مورکھ، کبھی کرے نہ گیانی

مٹی میں تو سبھی سمائیں، کیا جوگی کیا بھوگی
پانی میں ہے چندرا، جیسے جل پریوں کی رانی!"

شعور صدیقی

معصوم تمنا



بارہا فصلِ بہاراں میں کہا ہے تو نے
ایک اچھا سا کھلونا میرے بابا لا دو!
میرے معصوم کنول میرے شبستاں کے چراغ
بس میں ہوتا تو تیرے واسطے کیا کیا کرتا
ایک ادنیٰ سی تمنا بھی تو پوری نہ ہوئی
کیسے بتلاؤں تجھے وقت کی گردش کیا ہے
کیسے سمجھاؤں تجھے زیست پریشاں کیوں ہے
تو کہ اک حسن ہے ہنستے ہوئے غنچے کی طرح
چاند تاروں کی ضیا تجھ پہ نچھاور کرتا
لیکن اے نورِ نظر اے میرے سپنوں کے دیئے
تیرا بابا ہے ستایا ہوا مفلس دہقاں
گاؤں میں چند امیروں کے یہاں سب کچھ ہے
ایک تو ہے کہ تیرے پاس کھلونا بھی نہیں
بلبلا اٹھتی ہے یہ سوچ کے روحِ ناشاد
کتنا اندھیر ہے کیسی ہے فضائے آزاد
سوچتا ہوں کہ ہر اک سازِ شکستہ کیوں ہے
نغمگی منہ کو چھپائے ہوئے کیوں روتی ہے
سنتے آئے تھے بہار آئیگی آئی بھی گئی!
زرد پتوں پہ اداسی کا وہی عالم ہے
اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چمکتے جگنو
ڈوبتی نبضوں کی کچھ آس بندھا دیتے ہیں
ہے یقیں صبحِ طرب صبحِ جمیل آئے گی
چاکِ دامانِ گلستاں یہ کہا کرتے ہیں





ایک پتھر

قاضی عبدالستار

عباسی اقبال کی طرح سورج اپنے عروج پر تھا۔

افسر الشرطہ (انسپکٹر جنرل پولیس) کے قرنا کی بھیانک آوازوں سے رقاح کے نخلستان میں آباد خیموں کا شہر دہل اٹھا سیاہ ریشمیں مدوّر بارگاہ خلافت کے چاروں طرف سیاہ گھوڑے سنہری کاٹھیاں اور زریں رکابیں لئے اپنے ان سواروں کو لادے بت بنے کھڑے تھے جن کے پیر ہیں موزے تک سیاہ تھے اور مہمیز تک طلائی تھے بارگاہ کے آبنوسی ستون سیاہ غلافوں کے کپڑے اور سنہرے پھولوں کے زیور پہنے مرصع کمر حبشی غلاموں کی طرح سانس روکے کھڑے تھے قالینوں کی سیاہ زمین پر سونے کے تاروں کی آبادیاں اور ویرانے آدمی اور عورتیں، اونٹ اور گھوڑے اور شیر اور ہاتھی سب تصویروں کی طرح ساکت تھے۔ اس حریری قبے کے نیچے جس پر بنو عباس مغرور علم لہرا رہا تھا کاشانی پسندوں کے تخت پر ہارون الرشید نیم دراز تھا پشت پر گھوڑے کے پیٹ سے بڑا تکیہ تھا۔ جس کی ڈوریوں میں دیدے کی برابر موتیوں کے گچھے پڑے تھے قبا پر سیاہ طیلسان خلافت تھی جس نے بائیں ہاتھ کو ڈھانپ لیا تھا سیاہ ڈاڑھی کے نیچے مرصع پٹکے میں خنجر لگا تھا۔ سیاہ عمامے پر کلغی کے نیچے مالا سے مروارید کا سرپیچ تھا، سیاہ آنکھوں سیاہ ابروؤں، اور سیاہ آنکھوں نے اس کے رنگ کو اور چمپئی بنا دیا تھا سیاہ ازار کے پائنچوں سے جھانکتے ہوئے پاؤں کندن کے بنے معلوم ہوتے تھے مسند کے پیچھے دو ایرانی غلام سیاہ عقاب کے پروں اور سونے کی ڈنڈیوں کے پنکھے ہلا رہے تھے داہنی طرف دو کمانوں کے فاصلے پر وزیر اعظم فضل بن ربیع کھڑا تھا۔ اس کی پشت پر دور تک سپہ سالاروں والیوں اور عاملوں کی قطاریں تھیں۔ بائیں جانب جلادوں کا بادشاہ سرور الکبیر تھا جو اپنی رنگت، اونچے قد، اور بھاری بدن کی بدولت سنگ سیاہ کا دیو معلوم ہو رہا تھا۔ اسکی کمر میں وہ ظالم تلوار تھی جس پر بنو عباس کے عظیم الشان وزیر اعظم جعفر برمکی کے خون نے صیقل کی تھی۔ اس کے پیچھے بارگاہ کے آخری ستون تک سوڈانی غلاموں کے پرے تھے ان کے بدن کی جلد انکی داڑھیوں سے زیادہ کالی اور انکے دیدوں کی سفیدی آبدار تلواروں سے زیادہ روشن تھی۔ مسند کے سامنے بارگاہ کے داخلے پر بارہ کم سن ترکی مجسمے سیاہ لباس پر جڑاؤ پٹکے اور ہتھیار باندھے ایستادہ تھے۔

ہتھیاروں کی کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ ترکی غلاموں نے چھ چھ کی دو قطاریں بنائیں ان کے درمیان سے گذرتے ہوئے حبشی ایک بدو کا ایک ایک بازو اپنی انگلیوں کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے لائے اور مسند کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ بدو پرانا کرتا پہنے تھا جس کے دامنوں سے میلا تہبند جھانک رہا تھا چمڑے کی پیٹی میں خالی نیام جھول رہا تھا۔ ناف تک چھائی ہوئی داڑھی میں کہیں کہیں سفید بال چمک رہے تھے دونوں ابرو پیشانی پر چڑھے تھے عمامے کے پیچ ڈھیلے ہو گئے تھے آنکھوں سے وحشت اور چہرے سے دہشت ٹپک رہی تھی گلے میں اونٹ کے بالوں کی فلاخن (گوپھن) تھی جسکے چرمیں سرے گھٹنوں تک لٹکے ہوئے تھے فضل بن ربیع نے سینے پر وہ ہاتھ باندھ لئے جن میں روئے زمین کی سب سے بڑی حکومت کی مہر وزارت رہتی تھی اور بارگاہ اسکی آواز سے گونج گئی۔

"یہی وہ بدنصیب ہے جس نے بارگاہ خلافت پر پتھر پھینکے تھے۔"

ہارون نے نگاہ اٹھائی جو بدو کا جائزہ لیتی مسرور کو حکم دیتی گذر گئی۔ مسرور نے گردن جھکائی اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ صف سے دو حبشی نکلے ان کے ہاتھوں میں سرخ چمڑے کے دو دو کونے تھے۔ سرخ چمڑہ زرنگار قالین پر بچھا دیا گیا تاکہ بدو کے مجرم خون سے قالین کے نقش و نگار محفوظ رہیں ان غلاموں کی واپسی پر ایک دوسرا غلام آیا جس کا تیغہ قبضے

کے نیچے ایک بالشت چوڑا ہو کر نوک کے قریب سے مڑ گیا تھا۔ بدو نے جلاد کی صورت دیکھی تو گھٹنوں پر گر گیا اور زبان باہر نکال دی۔ ہارون کے اشارہ پر اس کے بازو شکنجے سے آزاد ہوئے ایک غلام نے شیشے کا لمبا چوڑا گلاس دیا جس پر سونے کے پانی سے پھول بوٹے بنے تھے اور جس کا پانی پہاڑو نکی برف سے سرد کیا گیا تھا بدو نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا اور اپنے کرتے کے خریطے میں ڈال لیا۔ غلام اسکی صورت دیکھتا رہ گیا۔ ہارون نے کنکھیوں سے بدو کی اس حرکت کو دیکھا اور گرج کر بولا۔

"نام"

"عاصی ابن افلاس۔"

ہارون نے اسے گھور کر دیکھا بدو نے کانپتی پنڈلیوں کو سنبھالا اور اپنے آپ کو گھسیٹ کر سرخ چرمے پر گرا دیا جو اس کے قتل کے لئے بچھایا گیا تھا اور اپنے حواس کو سمیٹ کر بولنے لگا۔

"اے وہ... جس کی جوتیاں سلطانوں کے تاج ہیں ... میں اس قبیلے کا بیٹا ہوں جسکے گھوڑے کسریٰ کی خوابگاہ میں باندھے گئے۔"

وہ چپ ہو گیا جیسے ان جملوں کے بوجھ سے تھک گیا ہو۔ آواز آئی۔

"پھر؟"

بدو نے اپنی آنکھیں بند کیں اور شمع دونوں سروں سے جلا دی۔

"امیر المومنین... میں نے بچپن میں سنا تھا کہ پھلدار درختوں پر پتھر مارنے سے پھل ملتے ہیں۔ یہ جملہ دل پر لکھا ہوا تھا۔ کل دوسرے فاقے کی شدت میں شور ہوا کہ میرے دیار میں اس عظیم الشان درخت نے نزول فرمایا ہے جس کی شاخیں عرب سے عجم تک روم سے فرانس تک اور افریقہ سے بلخ تک پھیلی ہوئی ہیں میں پیاسے گھوڑے کی طرح آیا اور درخت پہ پتھر مار دیا۔

تیرے جاہ و جلال کی قسم یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ کبھی کبھی درختوں سے پھلوں کے بجائے تلواریں بھی ٹپکتی ہیں۔

وہ جلاد کے تیغے کو دیکھ کر ہانپنے لگا۔

ہارون جو سیدھا ہو کر بیٹھ چکا تھا۔ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر حکم دیا۔

"مانگ..... کیا مانگتا ہے۔

بدو گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ آنکھیں پھاڑ کر منہ کھول دیا

"جان... جان کی امان"

"وہ تو عطا ہو چکی... کچھ اور مانگ

بدو نے پہلی بار زندہ انسان کی طرح بارگاہ پر نگاہ کی۔ جلادوں کو بے خوفی سے دیکھا اور بولا۔

"اے بنو عباس کے آفتاب خدا کرے تیری کبھی شام نہ ہو... مجھے ایک کتا دیدے۔"

بدو کے اس سوال پر نگاہیں ہنس پڑیں۔ چہرے قہقہے لگانے لگے سرگوشیوں کے مودب گھنگرو کھنکنے لگے۔

ہارون نے پاؤں پر پاؤں رکھ لیا۔ آہستہ سے فرمایا۔

"سچ ہے بھوک نے تیری عقل چر لی"

اور سرور کی طرف دیکھا پھر ایک زرد تازی کتا زنجیر میں جکڑا ہوا آیا اور بدو کے پاس ہمکنے لگا۔ بدو مسکرایا تو داڑھی اور مونچھوں کے درمیان دانتوں کی قطار چمک اٹھی اس نے کتے کی کمر... چوڑی میں پروئی جانی والی کمر پہ تھپکی دی۔ پھر ہاتھ باندھ کر اپنی داڑھی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"امیر المومنین پر میرے ماں باپ قربان... میری عمر کا آدمی شکار میں اس شاہی کتے کے ساتھ کیسے دوڑ سکتا ہے۔

امیر المومنین نے بغیر نگاہ اٹھائے حکم دیا۔

"گھوڑا عطا کیا جائے۔"

سرور نے بدو سے کہا کہ ڈیوڑھی پر گھوڑا تیرا انتظار کر رہا ہے۔ اس نے طمانیت سے سنا۔ شکر میں گردن جھکائی لیکن اسی طرح اسی جگہ کھڑا رہا۔ ہارون کی نگاہ اٹھی تو اس نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔

"اے وہ سورج جو رات میں بھی چمکتا ہے۔ جب میں شکار سے واپس آؤں گا اور گھوڑے اور کتے کی خدمت کروں گا یا چولہا پھونکوں گا؟"

آج کے دربار نے پہلی بار ہارون کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی۔ اس نے ارشاد کیا۔

"اسے ایک کنیز دی جائے۔"

ایک ستارہ لباس کنیز بدو کے پاس لا کر کھڑی کر دی گئی اور غلام نے بدو کا بازو پکڑ لیا۔ لیکن وہ اسی طرح اڑا رہا۔

"میرا اپنا خیمہ اتنا تنگ ہے کہ اس میں گھوڑا اور کتا کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کنیز"

اس کے جملے کو تراشتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔

"مکان کے لئے دس ہزار درہم بخشے گئے۔"

"اے خدا امیر المومنین کی عمر میں برکت دے۔"

ہارون نے اسے الٹے قدموں واپس جاتے دیکھا تو فضل بن ربیع کی طرف متوجہ ہوا۔ فضل نے حکم عالی کی پیشوائی کے لئے آگے بڑھ کر گردن جھکا دی۔ لیکن ہارون نے ملاحظہ کیا کہ بدو غلاموں سے بازو چھڑائے کتے اور کنیز کو داہنے بائیں لئے مسند کے سامنے آ گیا۔

"میری آل اولاد امیر المومنین پر قربان۔"

جنبش ابرو نے بیان کی اجازت دی۔

"سونے اور چاندی کے محلوں میں پرورش پانے والی کنیز اور سنگ مرمر کے اصطبل میں بندھنے والے گھوڑے کی رہائش کا تو بند و بست ہو گیا۔ مگر میری جو کی روٹیاں سوکھی کھجوریں اور سوختہ گھاس۔"

ہارون پھر مسکرایا اور بدو نے سنا۔

"عمر بھر کے لئے روزینہ مقرر کیا گیا۔"

بدو نے سر جھکا کر نظروں سے سلام کیا۔ زرد کتے کا زرد و زینہ دبوچ لیا۔ کنیز کے حسن و جمال سے بے نیاز کتے کی گردن تھپکتا بارگاہ سے باہر نکل گیا۔

بندۂ مزدور کے اوقات

احسان عظیم



گذشتہ چار پانچ سال سے پاکستان کے مزدوروں میں بدترین حالات کار اور بڑھتے ہوئے معاشی استحصال کے خلاف شدید بے اطمینانی پیدا ہو رہی ہے جس کا اظہار جلسہ، جلوسوں، مظاہروں اور ہڑتالوں سے بخوبی ہوتا ہے مزدوروں کے مظاہروں کے نتیجہ میں جہاں ایک طرف عوام الناس مزدوروں کے مسائل سے کسی حد تک واقف ہوئے ہیں۔ وہیں سرمایہ داروں اور اہلکاروں کی جانب سے مزدوروں کے خلاف کئے گئے پروپیگنڈے نے بھی عوام کو متاثر کیا ہے بیشتر افراد یہ سمجھتے ہیں کہ صنعتی ترقی کیلئے ہڑتالیں سود مند نہیں ہیں اور عام طور پر مزدوروں سے قربانیوں کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ سرمایہ داروں کے پروپیگنڈے نے ایسی فضا قائم کر دی ہے کہ اکثر افراد ٹریڈ یونین تحریک کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ان حالات میں اس بات کی ضرورت ہے کہ ٹریڈ یونین تحریک اور مزدوروں کے مسائل کا جائزہ لیا جائے۔

ٹریڈ یونین کیا ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟ مشہور ماہر معاشیات سڈنی ویب کہتا ہے۔

"ٹریڈ یونین اجرت حاصل کرنے والوں کی ایک ایسی انجمن ہے جس کا مقصد حالات کار بہتر بنانا ہے۔"

بین الاقوامی ادارۂ اعمال (ا۔ل۔ا۔و) کے الفاظ میں (ٹریڈ یونین تحریک) "مزدوروں کے حالات کار بہتر بنانے اور قیام امن کا ایک ذریعہ ہے" یہ ذریعہ کسی معجزے یا خیرات کے طور پر مزدوروں کو نہیں دیا گیا بلکہ صنعتوں کے قیام کے ساتھ مزدور طبقے کے وجود میں آتے ہی مزدور اس بات کی ضرورت محسوس کرنے لگے کہ وہ ملازمت کی بہتر شرائط طے کریں۔ انفرادی طور پر مزدوروں کے لئے یہ ممکن نہ تھا۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ دنیا آقا و غلام کے نظریات کے تحت سماجی اور پیداواری تعلقات متعین کرتی تھی۔ اس دور کے مزدور کو سورج کے طلوع ہونے سے غروب ہونے تک مسلسل کام کرنا پڑتا تھا۔ رات میں انہیں کوٹھریوں میں بند کر دیا جاتا تھا تاکہ وہ سخت مشقت کے نتیجے میں بھاگ نہ جائے۔ اور اجرت اتنی قلیل دی جاتی تھی۔ جس میں ان کی گذر بسر ممکن نہیں تھی۔

تکلیف، وہ مصائب کے نتیجے میں آہستہ آہستہ مزدور مطالبہ کرنے لگے اور ان مطالبات کی پاداش میں انہیں انسانیت سوز سزائیں دی گئیں۔ یہاں تک کہ شارع عام پر پھانسیاں دی گئیں لیکن ایک طویل جدوجہد اور قیمتی جان کی بھاری قربانیوں کے بعد خصوصاً جب مزدور تنگ آ کر مشینوں کو ہی اپنے انتقام کا نشانہ بنانے لگے تب کہیں سرمایہ داروں کے غرور کا بت پاش پاش ہوا۔ اور انہوں نے مزدوروں کو انجمن سازی اور اجتماعی سوداکاری کا حق دیا اس کے علاوہ دس گھنٹے یومیہ کام جو اب آٹھ گھنٹے پر آچکا ہے۔ کام کے بعد کلی طور پر آزادی وغیرہ کا حق حاصل کیا۔ یہاں تک کہ قیام پاکستان سے بہت پہلے یعنی ۱۹۲۶ء میں برصغیر کے مزدوروں نے بھی انگریزی سامراج کے قدم اکھاڑ کر انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن آزادی کے بعد مزدوروں سے یہ حق واپس چھین کر انہیں بے دست و پا کر کے انہیں سرمایہ داروں اور منتظمین کے ہاتھوں پامال ہونے کیلئے چھوڑ دیا گیا ہے ٹریڈ یونین تحریک کے خلاف منظم پروپیگنڈہ چلایا جا رہا ہے اور مزدور قوانین میں نت نئی پابندیاں وضع کر کے ٹریڈ یونین تحریک کے فروغ میں رکاوٹ پیدا کی جا رہی ہے۔

اقوام متحدہ کی ذیلی شاخ "بین الاقوامی ادارۂ اعمال" (ا۔ل۔ا۔و) جس کا ایک ممبر پاکستان بھی ہے ۱۹۵۲ء میں ایک قرارداد کے ذریعہ آزاد اور خودمختار ٹریڈ یونین تحریک کے قیام کیلئے ان الفاظ میں زور دیا گیا ہے ٹریڈ یونین "خوشگوار صنعتی تعلقات کی ایک اہم شرط ہے اور اس سے عام طور پر ملک کے سماجی حالات بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔" اور دنیا کی حکومتوں پر زور دیا گیا کہ وہ آزاد اور خودمختار ٹریڈ یونین تحریک کے قیام کی راہ میں رکاوٹیں ختم کر دیں۔ نیز "اپنی معاشی اور سماجی پالیسیوں پر عمل کرتے وقت ٹریڈ یونینوں کا تعاون حاصل کریں"

"ایسی کوشش نہ کی جائے جس کا مقصد ٹریڈ یونین تحریک کو سیاسی مقاصد کا آلۂ کار بنانا ہو" آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ٹریڈ یونین تحریک ایک صنعتی معاشرہ کی کتنی اہم کڑی ہے۔

ٹریڈ یونین تحریک کے متعلق اتنی باتیں کرنے کے بعد آئیے پاکستان کی ٹریڈ یونین تحریک کا جائزہ لیں۔ قارئین جانتے ہیں کہ برصغیر کی تقسیم پر ہمارے حصہ میں جو خطہ آیا۔ وہ ریگزاروں پہاڑی اور زراعتی میدانی تھا۔ اس علاقہ میں تقسیم سے قبل چند معمولی فیکڑیوں کے علاوہ صنعتیں نہیں تھیں۔ آزادی کی بعد ضروریات کی اشیا کے فوری حصول کیلئے کپڑے کی ملیں قائم کی گئیں جس کیلئے ہمارے پاس خام مال موجود تھا۔ بتدریج دیگر ضروریات کی اشیا کیلئے متعدد ہلکی صنعتوں کا اجراء ہوا اور اب ہمارا ملک صنعتی میدان میں آگے بڑھ رہا ہے۔ تقسیم برصغیر نے جہاں بہت سے مسائل پیدا کئے تارکین وطن جو ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آچکے تھے ان کی آبادکاری اور روزگار کا سب سے اہم مسئلہ تھا۔ چنانچہ قائم ہونے والی صنعتوں میں تارکین وطن کی بڑی تعداد بطور مزدور داخل ہوئی ایسے وقت میں جب کہ وہ نان شبینہ کے بھی محتاج تھے ان کیلئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنی ملازمت کی شرائط طے کریں ان کے سامنے پہلا مسئلہ روزگار کا حصول تھا چنانچہ صنعت کاروں نے مزدوروں کی معاشی بدحالی کا خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں قلیل ترین اجرت پر ملازم رکھا دوسری طرف ملکی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے مصنوعات کو گراں ترین قیمتوں پر

فروخت کرنا شروع کیا اس دوہری لوٹ کے نتیجے میں لگائی ہوئی پوری رقم ایک سال اور دو سال کے اندر ان کی تجوریوں میں پہنچ گئی اور پندرہ سال کی قلیل مدت میں چند لاکھ کے سرمایہ سے کاروبار کرنیوالے صنعت کار آج اربوں سرمایہ کے مالک بن چکے ہیں۔

صنعت کاروں اور منتظمین کی لوٹ اور بڑھتے ہوئے استحصال کی ایک بڑی وجہ ٹریڈ یونین تحریک کی کمزوری تھی جس کے کئی اسباب ہیں۔ اول یہ کہ آزادی سے پہلے برصغیر میں صنعتوں کے مراکز عام طور پر ان علاقوں میں تھے جو اب بھارت کا حصہ ہیں۔ چنانچہ ٹریڈ یونین تحریک کا زور زیادہ تر صنعتی علاقوں ہی میں رہا۔ برصغیر کی تقسیم کے نتیجہ میں موجودہ پاکستان سے بیشتر ٹریڈ یونین کارکن ترک وطن کرکے ہندوستان چلے گئے۔ بچے کھچے کارکنوں کا ان نئے مزدوروں سے مکمل طور پر رابطہ نہیں رہا۔ پھر سرمایہ داروں نے مزدوروں کو کمزور بنانے اور ان کی تحریک کو غیر موثر بنانے کے لئے پھوٹ ڈالنے کی حکمت عملی پر عمل شروع کیا اور سب سے بڑی وجہ سامراجی دور کے ناکارہ مزدور قوانین مزدوروں کو منظم ہونے میں رکاوٹ بنے رہے۔ اور اس طرح ٹریڈ یونین تحریک ایک عرصہ تک تقریباً مفلوج رہی۔ چنانچہ صنعت کاروں اور منتظمین نے نہ صرف یہ کہ نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مزدوروں کو بہتر سہولیات فراہم نہیں کیں بلکہ مزدوروں کو سامراجی دور سے حاصل شدہ حقوق بھی غصب کرنا شروع کر دیئے قوانین کی کھلے طور پر خلاف ورزی کی گئی اور محکمہ لیبر ویلفیئر کے حکام بجائے اس کے کہ قوانین پر عمل کراتے۔ وہ اپنی جانب دارانہ خاموشی کے ذریعہ منتظمین کے حوصلے بڑھاتے رہے چونکہ قوانین کی خلاف ورزی کا چالان صرف حکومت یا اس کا افسر مجاز (محکمہ لیبر کے افسران) کرسکتا ہے اس لئے مزدور بے بس رہے

یہی نہیں بلکہ قوانین میں ترمیمات کے ذریعہ ٹریڈ یونین تحریک پر مزید پابندیاں لگا کر مزدوروں کو آزادانہ عہدیدار منتخب کرنے کے بجائے مشروط کر دیا گیا۔ ہڑتال کا حق کلی طور پر چھین لیا گیا ان حالات نے مزدوروں کو پورے طور پر منظم ہونے اور اپنے حقوق کے تحفظ کرنے میں رکاوٹ ـــــ پیدا کر دی۔

انسانی معاشرہ کے ایک فرد کی حیثیت سے آپ انکار نہیں کرسکتے کہ زندہ رہنا آپ کا پیدائشی حق ہے یہ حق جبھی مکمل سمجھا جاسکتا ہے جب آپکو زندہ رہنے کیلئے جملہ ضروریات و سہولیات فراہم کی جائیں۔ جو روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم اور علاج پر مشتمل ہے اور معاشرہ سے یہ حق لیکر آپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ آپ اپنی صلاحیت اور استطاعت کے مطابق معاشرہ کی خدمت کریں۔ لیکن بقول شاعر ؎

ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

پاکستان کے مزدور کو بطور اجرت دو روپیہ یومیہ دیا جاتا ہے جس میں نہ تو وہ اپنے خاندان کو پیٹ بھر روٹی کھلا سکتا ہے اور نہ ہی جسم کو محفوظ رکھنے کیلئے لباس، مکان کے بجائے متعفن جھونپڑی جہاں جراثیم پرورش پاتے ہیں ان کی رہائش ہے دوا۔ علاج اور تعلیم کا نام ان کی زندگی سے خارج تعفن اور غلاظت میں رہنے اور بے آرامی کی محنت انہیں وقت سے پہلے مرنے پر مجبور کر دیتی ہے جان لیوا بیماری ان کی رفیق و دمساز بیماری کے دوران ایک طرف تو بغیر دوا کے زندہ درگور ہوتے ہیں دوسری طرف انہیں تنخواہ بھی نہیں ملتی کیونکہ مزدوروں کے لئے اس اصول پر عمل کیا جاتا ہے کہ کام نہیں، تنخواہ نہیں۔ NO WORK-NOPAY اس طرح نہ صرف انہیں بیماریوں کے درمیان تنخواہ نہیں ملتی بلکہ ہفتہ وار رخصت بھی بغیر تنخواہ دی جاتی ہیں۔ آپ خود خیال کریں کہ ان کی زندگی کو انسانی زندگی کہنا انسانیت کا مذاق اڑانے کے مترادف نہیں ہے؟ جب مزدوران حالات سے تنگ آکر مطالبہ کرتے ہیں.......

...... تو نہ صرف...... انہیں بیروزگار کر دیا جاتا ہے بلکہ پولیس کی لاٹھی، جیل، عدالت اور اکثر ان کی زندگیوں کو خاک میں تبدیل کرکے انہیں خاموش رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مزدوروں کے حالات کا اندازہ اس مثال سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ ۱۹۵۰ء میں ایک خاندان...... (چار افراد پر مشتمل) کا ماہوار خرچ (غذا اور لباس) سرکاری اعداد و شمار کے مطابق تقریباً چھپن روپیہ تھا اور اسے دو روپیہ یومیہ تنخواہ دی جاتی تھی لیکن ۱۹۶۳ء میں سرکاری اعداد و شمار (جس کی صحت کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا) غذا و لباس کے اخراجات کا گوشوارہ ایک سو چھیالیس روپیہ ۱۴۶ تک پہنچ چکا ہے لیکن مزدوروں کی شرح اجرت آج بھی دو روپیہ یومیہ ہے اس کے برعکس صنعتوں کے خالص منافع کی مجموعی شرح سو فیصدی سے بھی زیادہ ہے سرکاری گوشوارہ کے ذریعہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قومی آمدنی اور فی کس آمدنی میں بتدریج اضافہ ہوا ہے لیکن تیز رفتار گرانی پیش نظر تنخواہوں میں اضافہ کے بجائے قوت خرید میں پچاس فیصدی سے بھی زیادہ کمی پیدا ہوتی ہے یعنی ۱۹۶۳ء میں ایک عام آدمی سو روپے میں جس قدر اشیا حاصل کرسکتا تھا آج ۱۹۶۳ء میں سو روپے کی اشیا نصف کے برابر ہوگئی ہیں۔ دوسری طرف سرمایہ تیزی کے ساتھ چند ہاتھوں میں جمع ہوتا جارہا ہے جس کا انکشاف جناب محمد شعیب وزیر خزانہ نے گذشتہ دنوں کیا۔ یقیناً قومی آمدنی میں اضافہ ہوا ہے لیکن یہ اضافہ عام آدمی تک پہنچنے کے بجائے مٹھی بھر خاندانوں میں سمٹ رہا ہے۔

مزدوروں کے خراب حالاتِ کار اور معاشی بدحالی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انھیں اجتماعی سودا کاری کیلئے ہڑتال کا حق حاصل نہیں ہے جس کے نتیجے میں سرمایہ داروں کو یک طرفہ کارروائی کا سنہری موقع حاصل ہے ایک دوکاندار کو اس بات کا کھلا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اشیاء کو خرچ کی ہوئی رقم کے مطابق قیمت مقرر کرے اور اسی طرح ایک خریدار کو بھی یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ مناسب قیمت پر اشیا حاصل کرے فروخندہ دونوں کو اس بات کا آزادانہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ باہمی رضامندی کے ذریعہ قیمت کا تعین کریں۔ یہ قانونِ فطرت ہے لیکن مزدوروں کے سلسلے میں اس فطری قانون کو قطعاً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہاں سرمایہ دار کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ مزدور سے اس کی جنس قوت محنت جس دام پر چاہے خریدے۔ جب تک جی چاہے استعمال کرے اور جب چاہے ملازمت سے نکال دے یا قوت محنت کی خرید کیلئے ایک طرفہ طور پر شرائط کا تعین کرے لیکن جنس قوتِ محنت کے مالک مزدور کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی جنس کی فروخت کیلئے کوئی شرط مقرر کرے یا سرمایہ دار کی شرائط کے خلاف کچھ کہہ سکے۔ چونکہ مزدور کے پاس زندگی کی ضروریات کے حصول کا ایک ہی ذریعہ اس کی قوت محنت ہے لہٰذا اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سرمایہ دار من مانی قیمت پر اس کی قوت خریدتا ہے۔ مزدوروں سے اپنی جنس کی فروخت کے سلسلے میں شرائط کے حق کو روک کر عملاً انہیں بنیادی انسانی حق اور معاشرہ کے فرد کی حیثیت سے مساوی حق تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

فطرت اور اس کے قوانین پر کوئی پابندی قائم نہیں رہ سکتی۔ یعنی نہ تو زمین کی گردش کو روکا جاسکتا ہے اور نہ ہی روشنی سے قوت نمو کو اسی طرح مزدور پر غیر فطری پابندی بھی دیرپا ثابت نہیں ہوسکتی۔ مزدور مصائب کی اس منزل پر پہنچ چکا ہے جہاں اس کے لئے زندگی اور موت کے راستوں میں سے ایک کا انتخاب ناگزیر بن چکا ہے موجودہ زندگی جو زندہ درگور ہے یا بہتر زندگی لہٰذا مزدور سسک سسک کر مرنے کے مقابلہ میں اس بات کو ترجیح دینے لگا ہے کہ یا تو اپنے لئے بہتر زندگی حاصل کرے یا ایک دفعہ ہی میں موت چنانچہ ہڑتال کا حق لینے کے بعد چار پانچ سالوں کے دوران جتنی ہڑتالیں ہوتی ہیں پندرہ سالہ

تاریخ میں اتنی ہڑتال پہلے نہیں ہوئی اور ان ہڑتالوں کے نتیجے میں اکثر ان مزدوروں کو اپنی جان تک قربان کرنی پڑی ہے اور اس طرح پابندیاں ایک کاغذی دستاویز بن کر رہ گئی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر مزدور اپنی زندگی سے اتنے نالاں کیوں ہو گئے ہیں کہ لاٹھی، گولی، جیل کی صعوبتیں بھی انہیں خوفزدہ نہیں کر پاتیں؟ اس کا صاف جواب یہی ہے کہ انہیں ملازمت کی کوئی ضمانت حاصل نہیں نہ ہی کوئی سماجی تحفظات مثلاً پراویڈنٹ فنڈ، گریجوئٹی، بڑھاپا الاؤنس، پنشن بیروزگاری الاؤنس وغیرہ پھر اجرت بھی اتنی قلیل دی جاتی ہے کہ جس میں نہ تو وہ پیٹ بھر غذا حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی لباس، مکان اور دیگر ضروریات سال بہ سال اس کی مہارت بڑھتی رہتی ہے اور گرانی بھی لیکن تنخواہ ایک ہی سطح پر قائم رہتی ہے مہینہ میں تیس روز زندہ رہنے کیلئے تنخواہ صرف ۲۶ روز کی ملتی ہے چھٹیوں وغیرہ کا تذکرہ ہی بے کار ہے ان کی زندگی غربت و افلاس کا مرقع ہے ان کے بچے تعلیم سے محروم گلیوں میں آوارہ گردی پر مجبور ہیں۔ آج کے مزدور نہ صرف اپنی موجودہ حالات بلکہ اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل سے بھی مایوس ہیں اور یہی مایوسی انہیں زندگی سے کھیلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

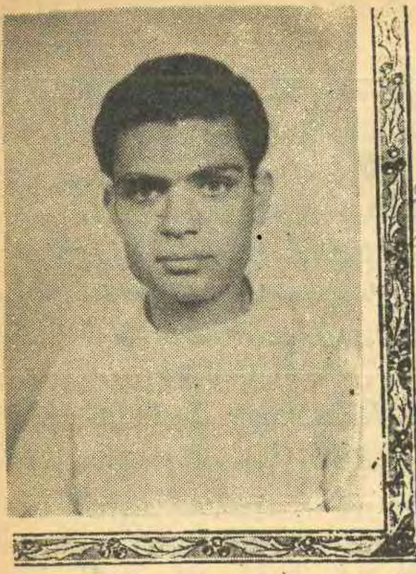
مزدوروں کے موجودہ حالات ان کی مایوسی کی بنیادی وجہ صرف یہی ہے کہ انہیں معاشرہ میں برابر کا مقام حاصل نہیں سرمایہ دار کے مقابلہ میں اپنے حقوق کے تحفظ اور حالات کار کو بہتر بنانے کیلئے انہیں کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ سرمایہ داران کی بے بسی دیکھتے ہوئے اپنے منافع میں اضافہ کیلئے ان کا آخری قطرۂ خون تک نچوڑ لیتا ہے۔ انگریزی سامراج کی دو صد سالہ اور پاکستان کی سو سالہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ . . . . تشدد کے ذریعہ سے بجائے اس کے کہ مسائل حل ہوں کچھ اور پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ شہریوں کو پینے اور دیگر ضروریات کے لئے پانی کی فراہمی جتنی ضروری ہے۔ گندے پانی کی نکاسی کا انتظام بھی اتنا ہی ضروری ہے اگر پانی کی فراہمی شہریوں کو پیاسا مار سکتی ہے تو گندہ پانی تعفن اور مہلک بیماریوں کے ذریعہ آبادی کو قبرستان میں تبدیل کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر سرمایہ کو اس بات کا حق دیا جانا ضروری ہے کہ وہ اپنی صنعت کو چلانے کیلئے مزدوروں سے قوت محنت کی خرید کیلئے شرائط مقرر کریں تو مزدوروں کو بھی اس بات کا حق دیا جانا ضروری ہے کہ وہ اپنے لئے بہتر سہولیات حاصل کریں۔ دونوں فریق کو یکساں حقوق نہ دینا صنعتوں میں عدم توازن اور صنعتی امن کو نقصان پہنچانے کی کوشش کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

مزدوروں کو ہڑتال کا حق نہ دینے کیلئے جواز یہ پیدا کیا جاتا ہے کہ اس طرح پیداوار میں کمی واقع ہوتی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ غیر مطمئن مزدور کی نسبت مطمئن مزدور زیادہ پیداوار کر سکتا ہے۔ جس کی مثال جاپان، اور دیگر ترقی یافتہ ممالک کی پیداوار سے بخوبی ملتی ہے ان ملکوں کی پیداوار پاکستان کے مقابلے میں آٹھ گنا زیادہ ہے جس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ان ممالک کے مزدوروں کو بہتر حالات کار اور بہتر سماجی سہولیات حاصل ہیں صنعتی امن کو استحکام پہنچانے اور پیداوار کو بڑھانے کا واحد حل یہی ہے کہ پاکستان کے مزدوروں کو ملازمت کی ضمانت دی جائے اور ملازمت کی شرائط کے تعین کیلئے انہیں اجتماعی سوداکاری اور ہڑتال کا حق دیا جائے ہڑتال روکنے کا موثر ذریعہ یہ ہے کہ صنعتوں کے منافع میں مزدوروں کا لازمی حصہ مقرر کر دیا جائے جس طرح بیشتر ترقی یافتہ ممالک کے مزدوروں کو منافع میں لازمی حصہ دیا جاتا ہے اس طرح جب منافع میں مزدور کا حصہ لازمی ہو گا تو اس کی کوشش یہ ہو گی کہ منافع زیادہ سے زیادہ ہو تاکہ اسے زیادہ سہولیات حاصل ہوں۔ لازمی منافع کے نتیجے میں جہاں مزدور خوشحال ہوں گے وہیں مجموعی طور پر عمومی خوشحالی بڑھے گی۔

ہمارے ملک کی سیاسی فضا ہمیشہ ان خطوط پر استوار رہی ہے کہ حکومت کا ہر فیصلہ درست اور ناقابل تبدیل اور حکومت سے کسی غلطی کا امکان نہیں۔ لیکن ایک عرصے کے بعد اب خود حکومت بھی یہ محسوس کرنے لگی ہے کہ موجودہ قوانین بدلتے ہوئے حالات کے مطابق نہیں ہیں اس میں تبدیلیوں کی ضرورت ہے ہم بھی ہمیشہ سے یہی کہتے رہے ہیں۔ لیکن ہمارا کہنا چھوٹا منہ بڑی بات تھی۔ اور اسکی پاداش میں ہمیں قید و بند کی سختیاں بھگتنی پڑیں۔ تاہم ماضی کے تجربات سے قوانین میں صحت مند تبدیلیاں کرنا لازمی ہیں ایسے ہی قوانین صحت مند موثر کہلائے اور بن سکتے ہیں جنھیں عوام کی تائید حاصل ہو اور عوام کی تائید اور ان کی مرضی معلوم کرنے کا جمہوری طریقہ یہی ہے کہ انہیں جلسہ جلوس کے ذریعہ اپنے خیالات کے اظہار۔ اور رائے عامہ ہموار کرنے کی آزادی دی جائے ۔ لیکن بدقسمتی سے عوام خصوصاً محنت کش طبقہ اظہار خیال کے بنیادی انسانی اور جمہوری حق سے محروم ہے

سیکورٹی ایکٹ، سیفٹی ایکٹ، مغربی پاکستان مفاد عامہ، فرانٹیئر کرائمز ریگولیشن، کرمنل لا ایمنڈمنٹ، پریس آرڈی ننس اور لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کے آرڈی ننس کی موجودگی میں اظہار خیال کے حق سے یکسر محروم ہیں۔ آج صورت حال یہ ہے کہ کتنے ہی کارکنوں کو بغیر مقدمہ چلائے انہیں صفائی فراہم کرنے کا موقع دیئے بغیر اہلکاران اپنی صوابدید پر جب چاہیں جیلوں میں نظربند کر دیتے ہیں۔ شہر بدر، زباں بندی، اور ضمانتیں وغیرہ طلب کر لیتے ہیں۔ اور یکطرفہ طور پر انہیں ضبط بھی کر لیتے ہیں جو کہ انسانی حقوق اور انصاف کے اصولوں کے قطعی منافی اور وحشیانہ دور کے افعال پر مبنی ہے جس کی اصلاح کے بغیر یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ مزدور تحریک صحت مند بنیادوں پر قائم ہو سکے اور فروغ پا سکے۔

صحت مند قوانین وضع کرنے کا اور عوامی منشا کے مطابق بنانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اسے عوام کے منتخب نمائندے بنائیں۔ موجودہ وقت میں براہ راست نمائندے منتخب کرنے کے بجائے بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے تحت بالواسطہ نمائندے منتخب ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں مزدوروں کو اپنے نمائندے منتخب کرنے کا موقع حاصل نہیں اس طرح قانون ساز اداروں میں نہ تو انہیں نمائندگی حاصل ہے اور نہ ہی ان کی تکالیف پر توجہ دی جاتی ہے۔ مزدوروں کے مسئلہ کا بہترین حل یہ ہے کہ انہیں براہ راست اپنے نمائندے منتخب کرنے اور اظہار خیال اور رائے عامہ ہموار کرنے کا آزادانہ حق دیا جائے تاکہ وہ صحیح ارکان منتخب کر سکیں اور ایسے قوانین وضع کرا سکیں جس کے ذریعہ وہ اپنی ملازمت اور حالات کار اور سماجی انصاف حاصل کر سکیں۔ ماضی کے تجربات مستقبل کے رہنما ہوتے ہیں یہ رہنما ہمیں یہی بتاتے ہیں کہ تشدد ہر حال میں مسئلہ کا صحیح حل نہیں اور اس طرح مسئلہ حل ہونے کے بجائے پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں لہٰذا تشدد کے رجحان کو تبدیل کر کے مزدوروں کو شرائط ملازمت طے کرنے صنعتوں اور انسانی معاشرہ میں مساوی حق حاصل کرنے کیلئے ٹریڈ یونین کی راہ میں حائل شدہ جملہ پابندیاں اٹھائی جائیں اجتماعی سوداکاری اور منتظمین کے استحصال سے محفوظ رہنے کے لئے انہیں ہڑتال کا حق دیا جائے صنعتی استحکام اور مزدوروں کی عمومی خوشحالی کے لئے منافع میں انہیں لازمی حصہ دیا جائے۔ قانون ساز اداروں میں موثر نمائندگی کیلئے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر اپنے نمائندے براہ راست منتخب کرنے اور اظہارِ خیال کے لئے جلسے و جلوس اور رائے عامہ ہموار کرنے کی آزادی دی جائے۔ یہ آزادی حقیقی آزادی اسی وقت کہی جا سکتی ہے جب سیاہ قوانین منسوخ کر دیئے جائیں تاکہ وہ انسانی معاشرہ اور جمہوری ملک کے حقیقی حکمراں ہونے کا فائدہ اٹھا سکیں جو ان کا پیدائشی حق ہے۔



وقاربن الٰہی

سایہ



بچپن کے دنوں کو آج بھی یاد کرتی ہوں تو امی، ابا کی ایک ہی تصویر میری نگاہوں کے سامنے آتی ہے اور پھر یہ تصویر نگاہوں کے سامنے کچھ ایسی رہی ہے اور یوں بار بار آئی ہے کہ ہمیشہ کے لئے جم کر رہ گئی۔ ہوش سنبھالتے ہی جب دیکھا تو یہی سمجھ میں آیا کہ ابو جیسا سخت آدمی دنیا بھر میں نہیں ایسی کوئی استانی بھی نہیں۔ ہوا یوں کہ صبح صبح سو کے اٹھی آنکھیں ملتی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اتری تو صحن میں قیامت آچکی تھی۔ ابو بہت غصّے میں تھے شاید ان کو آفس جلدی جانا تھا اور چائے میں دیر ہو گئی تھی انھوں نے امی کو بے پناہ سنائیں پھر غصے میں آگے بڑھے رسوئی میں چولہے پر سے دیگچی اٹھائی اور لے صحن میں پھینک دیا۔ گرم گرم ابلتا پانی اینٹوں پر بکھر گیا پھر انھوں نے وہ برتن جنھیں امی نے ٹرے میں لگا کے اپنے قریب رکھا تھا۔ زور سے ٹھوکر ماری اور تو ڑ کے صحن سے باہر نکل گئے۔ میری حالت کہ کاٹو تو بدن میں لہو نام کو بھی نہیں۔ مارے خوف کے میں بری طرح سہم گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد حواس ٹھکانے آئے۔ دبے پاؤں رسوئی میں جا کے دیکھا تو امی گھٹنوں میں سر دیئے رو رہی تھیں۔ ان کی سسکیاں اور آنسو مجھ سے سنے اور دیکھے نہیں گئے میں انکی پشت سے چپک کے جھول گئی۔

" امی کیوں رو رہی ہو — نہ روؤ نا " اماں کیلئے یہی الفاظ بہت تھے انھوں نے آنسو پونچھ ڈالے اور بولیں " یہ رونا روتے تو دس برس ہو گئے ہیں بیٹی — اور جب تک زندگی ہے یہ رونا رہے گا " ماں کے گال سرخ اور پپوٹے سوج رہے تھے انھوں نے پھر پانی رکھا اور ہمارے لئے ناشتہ بنایا۔

ہم جب بہت چھوٹے تھے اور نانی اماں زندہ تھیں تو جب ہم ضد کرتے یا مچلتے تو وہ ہوا کا نام لے کے ہمیں ڈرایا کرتیں اور ہم سہم کر دبک جاتے۔ لیکن جب بھیا ذرا بڑا ہوا اور کسی بات پر مچل جاتا تو میں ابو کے نام سے اسے ڈرایا کرتی تھی

اور وہ بھی ایسا ڈرتا تھا کہ خوف کے مارے اس کا خون خشک ہو جاتا تھا۔

آہستہ آہستہ ہم بڑے ہوتے گئے تو ہم پہ ساری باتیں واضح ہوتی گئیں۔ ابو شدید قسم کے غصیلے اور چڑچڑے تھے کیا مجال ہے جو وہ گھر میں ہوں اور دروازے میں کتا بھی، بول جائے مارے غصّے کے انکی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا غلطی کتے کی ہوتی تھی لیکن مارے ڈر کے کانپنے امی لگ جاتی تھیں۔ ابو علی الصبح دفتر چلے جاتے دوپہر سے تھوڑی دیر بعد آتے۔ کھانا کھاتے، کسی سے کوئی بات نہ کرتے پھر گرمی ہو یا سردی، سو جاتے۔ شام اٹھ کے غسل کرتے اور پھر پیدل قدمی کو نکل جاتے۔ رات گئے لوٹتے، کھانا کھاتے کپڑے تبدیل کرتے اور تھوڑی دیر اخبار دیکھتے پھر سو جاتے ان کا یہ معمول ہم نے برسوں دیکھا ہے۔ سورج اپنا راستہ بدل سکتا ہے لیکن کیا مجال جو ابو اپنا راستہ بدل جائیں لیکن ابو سے بھی زیادہ عجیب امی کی ذات تھی

ہم نے اکثر دیکھا ابو ناراض ہوئے ہیں یا انھوں نے امی کو مارا ہے تو تھوڑی دیر رو دھو لیا یا ابو نے برتن توڑ دیئے اور چیخ چیخ کے سارے محلے کو سنایا تو بھی امی چپ چاپ کمرے میں گئیں تھوڑے آنسو بہائے پھر ویسی کی ویسی۔ ابو نے سالن کی گرم پلیٹ انھیں دے ماری یا ان کے کپڑے جلا دیئے اور دوسروں کے سامنے ان کی بے عزتی کر دی تو بھی امی نے سوائے دو آنسو بہانے کے اور کچھ نہیں کیا۔ ہمیں حیرت ہوتی تھی کہ ہماری امی کیسی ہیں جو منہ سے لفظ تک نہیں نکالتیں اسکول میں ایک مرتبہ ایک لڑکی نے مجھے گالی دی تھی تو میں نے تو اسکی بڑی مرمت کی تھی خوب پیٹا تھا اور یہ امی کیسی ہیں کہ جو آگے سے ہوں ہاں بھی نہیں کرتیں ایک دن جب ابو سخت ناراض ہوئے اور امی کو گالیاں دے کر چلے گئے اور امی روتی رہیں تو میں نے غصے سے جھٹ امی سے پوچھا "یہ کیا بات ہے۔ امی آپ کو۔ ابو اتنا تنگ کرتے ہیں اتنا پیٹتے ہیں اور گالیاں دیتے ہیں اور آپ ہمیشہ ہی چپ رہتی ہیں۔ آپ کیوں جواب نہیں دیتیں انھیں؟" تو ان کا چہرہ یک لخت بدل گیا اور مڑ کر انھوں نے فوراً ایک تھپڑ میرے گال پہ جڑ دیا۔ ان کا لہجہ جیسے مجھے کھا جانے والا تھا۔ "بدتمیز کہیں کی۔ خبردار جو آئندہ ایسی بات سوچی بھی تو — تو نہیں جانتی۔ وہ تیرے ابو ہیں اور ابو کے سامنے آنکھ اٹھا کے بھی بات کرنا سخت بدتمیزی ہے جا دفع ہو جا میری نظروں سے —" میں امی کی اس بات کو نہیں سمجھ سکی کہ آخر یہ کیسی تبدیلی تھی ایک شخص ہر روز انھیں تنگ کرتا ہے اور یہ پھر بھی اسکی طرفداری کرتی ہیں۔

ایک مرتبہ ابو بیمار ہو گئے۔ معمولی سا بخار تھا لیکن امی نے سارے شہر کا ناک میں دم کر دیا۔ ایک ڈاکٹر آیا پھر دوسرا، پھر تیسرا، ایک دوائی، پھر دوسری پھر تیسری۔ کبھی پوچھتی ہیں "کمر میں درد تو نہیں۔" کبھی پوچھتی ہیں۔ "پیاس تو نہیں محسوس ہو رہی" ابو جواب نہیں دیتے تو خود ہی پاس بیٹھ کے ان کی کمر دبانے لگ گئیں۔ میں دیکھ رہی تھی، پورے تین دن جب تک کہ ابو دفتر نہیں گئے امی نے پلک تک نہیں جھپکائی۔ وہ دفتر گئے اور میں رسوئی میں تو دیکھا امی بڑبڑا رہی ہیں۔

"یا خدایا انھیں کچھ نہ ہو۔ انھیں گرم ہوا بھی نہ چھوئے۔ انھیں۔"

ایک دن ابو سینما چلے گئے۔ گھر میں کہہ کے نہیں گئے تھے۔ چھوٹا بھیا تو شروع سے بدتمیز تھا، وہ تو اندھیرا پڑتے ہی سو جاتا تھا۔ لیکن میں امی کا ساتھ دیتی تھی ابو آدھی رات کے بعد لوٹ کے آئے آئے امی جاگ رہی تھیں گلی میں چاپ ہوئی تو فوراً اٹھیں اور ابو سے پہلے ہی دروازہ پر پہنچ چکی تھیں۔ ابو اندر آئے تو کہا، کھانا کھا کے آئے ہیں امی نے ان کے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ لیکن چپ چاپ اٹھیں اور برتن سمیٹ آئیں۔

کچھ عرصہ بعد ابو دورے پر گئے تو میں نے دیکھا ہر وقت امی دو ہی لقمے لے کے ہاتھ کھینچ لیتی ہیں میں اصرار کرتی تو کہتیں "جی نہیں چاہتا۔" پھر تنگ آ کے کہنے لگیں۔ "تیرے ابو گھر میں نہیں پگلی۔ میں کیسے کھا لوں" جی مانتا ہی نہیں۔"

میں نے اندازہ لگایا تھا کہ ابو لاکھ بے نیازی برتیں وہ گھر ہوتے ہیں تو امی خوش خوش رہتی ہیں لیکن اس خوشی کا بھی اظہار انھوں نے کبھی نہیں ہونے دیا۔ وہ باہر چلے جائیں تو ان پر ایک عجیب سی مردنی چھا جاتی ہے بس کسی نہ کسی طرح پتہ چل ہی جاتا ہے کہ وہ خوش ہیں یا — اداس —

آپ خود ہی کہئے کہ شفقت کی توقع رکھنے کے بدلے میں جب بچوں کو ایسا ابو ملے جس کے ہاتھ میں ہمیشہ ننگی تلوار ہو تو بچے اسے کس طرح پیار کریں گے وہ تو اس کے سائے سے بھی دور بھاگیں گے لیکن ہم نے پھر بھی اپنے ابو کو چاہا، ان سے پیار کیا، اس لئے کہ امی خفا ہوتی تھیں اور میں سوچتی، وہ امی ہی کو تو سب کچھ کہتے ہیں، ہمیں تو کبھی کچھ نہیں کہا۔

اتنے برسوں میں مجھے ایک دن بھی یاد نہیں جب ابو نے ہنس کے بات کی ہو۔ ہم نے ہر وقت اور ہر لمحے ان کے چہرے پر خفگی اور خشونت دیکھی تھی۔ مجھے بالکل یاد نہیں کہ ابو نے کبھی مسکرا کے پیار سے بات کی ہو وہ، ہمیں کبھی جھولوں پر یا سیر و تفریح کے لئے یا سینما لے کے نہیں گئے ان سب باتوں کے وہ سخت مخالف تھے بلکہ ہم سے تو دنوں بعد ایک آدھ بات ہوتی تھی جس چیز کی ضرورت پڑتی، ہم امی سے کہہ دیتے اور دوسرے روز ابو لا دیتے اور پھر سے تعلق ختم —

ابو گھر میں ہوتے تھے تو چھوٹے بھیا اور میں کسی جگہ بیٹھ کے چپ چاپ پڑھتے یا ہنستے یا ابو غصے میں آتے تو برتن ٹوٹتے یا امی کو بالوں سے پکڑ کے گھسیٹا جاتا تو ہم دونوں بھاگ کے چھت پر برساتی میں چھپ جایا کرتے تھے۔ سہم کے ہمارے دل زور زور سے دھڑکتے اور آنکھیں اس طرح لگتا جیسے ابھی ابل پڑیں گی ابو چپ بھی ہو جاتے اور امی رو کے کام میں بھی لگ جاتیں۔ لیکن ہم چھپے رہتے۔ بہت ہی دیر بعد ہم نیچے اترتے لیکن خوف پھر بھی ہمارے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ گھر میں اگر کوا منڈیر پہ آ بیٹھتا اور کائیں کائیں کرنے لگ جاتا تو ہم ڈر جاتے۔ ابھی ابو باہر نکلیں گے اور ہمیں پیٹ ڈالیں گے۔

ایک مرتبہ ایسا ہی ہوا تھا کہ کوے نے شور مچایا تو ابو بھاگ کر نکلے، تھوڑی دیر کوے کو دیکھتے رہے اور پھر امی پر برس پڑے۔ برسنے سے بھی تسلی نہ ہوئی تو آگے بڑھے اور امی کو پیٹنے لگے۔ اتنے میں چھوٹے بھیا پاس سے گزرے تو ایک تھپڑ انھیں بھی پڑ گیا۔ اس کے بعد چھوٹے بھیا ایسا غائب ہوا کہ اس نے شکل دکھائی چھوڑ دی وہ کیا اس کے ساتھ میں قتل ہو جانے پر تیار تھے لیکن یہ منظور نہ تھا کہ ابو کے کمرے میں جائیں اور ان سے بات کریں۔ وہ گھر میں نہ ہوتے تو بھی ان کے کمرے میں جانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ لگتا تھا وہاں دیواروں پر بھوت چمٹے بیٹھے ہیں کہ جونہی ہم داخل ہونگے وہ سب ہمیں چمٹ جائیں گے۔

زندگی اسی ڈگر پر بھاگتی چلی گئی۔ میں اسکول سے نکل کے کالج پہنچی تو بھیا میٹرک میں تھا۔ میں بی اے میں داخل ہوئی تو بھیا ایف اے کر رہا تھا۔ اور جب بی اے کر کے میں نے پڑھنا چھوڑ دیا تو بھیا تیرھویں میں فیل ہو چکا تھا۔ اس سارے عرصہ میں ابو کے رویئے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس منزل پر تو ہم بھی اچھی طرح سوچ سمجھ سکتے تھے اور ہر بات پہچان لیتے تھے۔ ہمارا خیال تھا، ابو کے مزاج کو درست کرنے کے لئے اب یہ احساس ہی کافی ہے کہ میری بیٹی اور بیٹا جوان ہو گئے ہیں لیکن توبہ کیجئے عمر کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں تیزی اور بھی آتی چلی گئی اور اب وہ ہر روز ایک آدھ جنگ لڑ لیتے تھے۔ امی میں صرف اتنی تبدیلی آئی تھی کہ روتی ضرور تھیں لیکن بے تحاشہ نہیں بس دو چار آنسو — شاید رو رو کے ان کے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ سب باتیں امی، ابو کی ویسی ہی تھیں۔ اور امی حسب دستور اس پر بضد تھیں کہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے، وہ خاوند کے سامنے غصّے کے عالم میں آنکھ بھی نہیں اٹھائیں گی۔

گھر کی اس فضا نے سب سے برا اثر چھوٹے بھیا پر ڈالا۔ یہ تو اس کی بڑی ہمت تھی کہ جو وہ اپنے آپ کو اتنی مدت تک سنبھالے رہا اور میرے کہنے سننے میں آ کے پڑھتا رہا لیکن آپ ہی کہیے جس گھر میں ہر لمحے خوف ہی براجمان رہتا ہو اور ہر کوئی اپنی اپنی جگہ سہم کے دن کاٹ رہا ہو۔ بچے پیار کے ایک ایک بول کو ترس گئے ہوں۔ بول تو رہا ایک طرف، آواز کو بھی ترس گئے ہوں۔ جہاں کبھی کسی نے سیدھے منہ بات نہ کی ہو، گود لے کے پیار کرنا تو ایک افسانہ ہے، وہاں کوئی کتنے دن زندہ رہے گا اور کیسے رہے گا۔ چھوٹے بھیا اب ایسی منزل پر تھا کہ اسے

پیار اور سہارے کی ضرورت تھی جب تک میں دیتی رہی وہ پڑھتا رہا اور جب میں بھی کتابوں میں الجھ کے اس سے بے نیاز ہوئی تو وہ بھٹک گیا۔ میں تو خیر لڑکی ہوں۔ مشرقی لڑکی — جانے دیجئے گیا کیا جائے۔

ایف اے کے بعد بھیا اکثر غائب رہنے لگا کبھی وقت پر کالج جاتا نہ آتا۔ ہم پوچھتے بھی تو ٹال دیتا ظاہر ہے ایک دن وہ تھرڈ ایئر میں فیل ہو گیا۔ اس دن مجھے یقین آگیا کہ آج اس کی خیر نہیں۔ ابو کو اس کو کچا ہی چبا ڈالیں گے۔ بھیا نے بتایا اور باہر نکل گیا۔ اور بہت دیر سے واپس آیا۔

ابو اس دن جانے کہاں غائب رہے تھے کہ رات پڑے جانے پر گھر آئے۔ گھر آ کے انھوں نے کپڑے نہیں بدلے منہ ہاتھ نہیں دھویا۔ امی سے بات بھی نہیں کی اور کھانے کی طرف تو دیکھا بھی نہیں۔ بس جذبات میں ٹہلتے رہے۔ مٹھیاں، بھینچتے اور کھولتے رہے پھر ایک دم وہ میرے کمرے میں آگئے۔ آج پہلی مرتبہ وہ میرے کمرے میں آئے تھے۔ ان کا یہ خوفناک چہرہ دیکھ کے میری چیخ نکل گئی۔ ابو نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پھر چلا اٹھے۔

"جانتی ہو اس کے کرتوت۔ فیل ہو گیا ہے تھرڈ ایئر میں اور پھر میں نے خود اسے اپنی آنکھوں، اپنی ان آنکھوں سے شہر کے لفنگے اور چرسی لڑکوں میں بیٹھے دیکھا ہے۔ یہ میرا نام روشن کرے گا۔ یہ بڑا صاحب بنے گا۔ اس کی اوقات تو چرسیوں والی ہے لیکن قبل اس کے کہ یہ ایسی حرکت کرے میں — میں —" ابو کا سارا جسم اضطراب میں ڈوب گیا اور سارے چہرے اور گردن کی رگیں ابھر آئیں۔

"میں — میں اسکا خاتمہ کر دوں گا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا — میں —" اسی شدید غصے میں وہ باہر نکلے اور چھوٹے بھیا کے کمرے میں چلے گئے اور اسے بازو سے پکڑ کے گھسیٹتے ہوئے میرے کمرے میں لے آئے اور پھر اسے چارپائی پہ دھکیل کے بولے "اب میں تمہیں مزہ چکھاتا ہوں آوارہ لوگوں میں پھرنے کا۔ ابھی — ایک منٹ ٹھہر تو جا ذرا —" بھیا کے چہرے کا رنگ سفید پڑ چکا تھا ابو اندر کمرے میں گئے تو۔ ایک لمحے میں امی اندر داخل ہوئیں اور چپ چاپ دروازے میں رک گئیں۔ ابو ابھی تک بڑبڑا رہے تھے "میں تمہیں — میں تمہیں — تمہارے سینے سے دس گولیاں نکالوں گا۔ قبل اس کے کہ تو میرا نام رسوا کرے میں — تجھے — میں —" باہر نکلے تو ان کے ہاتھوں میں بندوق اور آنکھوں میں خون تھا۔ انھوں نے نال بھیا کی طرف کی اور میری چیخ نکل گئی اور وہی عورت جو خاوند کے سامنے سر اٹھانا بھی گناہ سمجھتی تھی، اس نے کیا کیا۔

امی شیرنی کی طرح بڑھیں اور ابو کے ہاتھ سے بندوق چھین کے پرے پھینک دی۔

"میرے جیتے جی اسے کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ پاگل ہو گئے ہو تم — ؟"

ابو گنگ ہو کے امی کو دیکھ رہے تھے۔



باقر رضوی

دُنیا کو سنبھلنا ہوگا

لیلیٰ عصر کی پوشاک بدلنا ہوگا
غازۂ نورِ رخِ کونین پہ ملنا ہوگا

دوزخِ دہر کو گلزار بنانے کے لئے
اور کچھ روز ابھی آگ میں جلنا ہوگا

آبیاری کے لئے چشمۂ شیریں بنکر
سختیٔ سینۂ صحرا سے ابلنا ہوگا

شاملِ قافلۂ اہلِ جنوں ہونے کو
مثلِ گل حجلۂ گل بن سے نکلنا ہوگا

تا سرِ منزلِ مقصود پہنچنے کے لئے
آبلہ پا کو رہِ خار پہ چلنا ہوگا

بحرِ ہستی کے تلاطم میں مثالِ گوہر
سایۂ دامنِ طوفان میں پلنا ہوگا

سننے والوں کو ذرا لطف نہیں آتا ہے
قصۂ زیست کا عنوان بدلنا ہوگا

عصرِ حاضر کو ضرورت ہے نئی قدروں کی
موت اور زیست کا مفہوم بدلنا ہوگا

مہر و ایثار و محبت کا سہارا لیکر
لڑکھڑاتی ہوئی دنیا کو سنبھلنا ہوگا

امتیاز سعادت

قومی معیشت

چند روز قبل کی بات ہے میرے حلقۂ احباب میں پاکستان کے معاشی وسائل زیر بحث تھے۔ ایک صاحب کا خیال تھا کہ پاکستان کی معاشی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ آبادی میں اضافہ ہے۔ ان کے خیال میں اگر آبادی میں اضافے کو روک دیا جائے تو پھر پاکستان کی معیشت اب سے کہیں زیادہ رفتار سے ترقی کرنے لگے گی۔ اور ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ آبادی کا مسئلہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے اس لئے کہ دراصل سوال اس کا ہے کہ پیداوار بڑھائی جائے تاکہ جتنے افراد بڑھیں اسی قدر غذا موجود ہو اور اسی رفتار سے روزگار کے مواقع میں اضافہ ہو۔ بات خاصے معقول انداز میں ہو رہی تھی۔ لیکن ان دونوں نے یہ دیکھ کر کہ ان کے دلائل کا ایک دوسرے پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے بالآخر ایک دوسرے کی ذات پر بحث شروع کر دی۔ آبادی کو کوئی مسئلہ نہ ماننے والے صاحب نے آبادی کو مسئلہ ماننے والے صاحب کو بیوقوف، کم عقل اور کوتاہ بیں قرار دیا۔ جواب میں انہیں یہ سننا پڑا کہ آپ پاکستان کے اور پاکستان کی ترقی کے دشمن ہیں۔ بات حقائق سے چلی تھی اور جذبات پر ختم ہو گئی۔

مشکل یہ ہے کہ معاشیات اور معاشی معاملات کا افراد کی زندگی سے جس قدر گہرا تعلق ہوتا ہے۔ معاشی مسائل کے بارے میں ان کی معلومات اسی قدر سطحی ہوتی ہے قوموں اور ملکوں کے معاشی مسائل ایسے نہیں ہوتے کہ انہیں گھر بیٹھے سگریٹ کے دھوئیں کے پار نظریں جما کر طے کر لیا جائے۔ ملکی سطح پر کسی معاشی قدم کے اثرات ملک گیر نہیں بلکہ بعض حالات میں تاریخ ساز ہوتے ہیں۔ حکومت کے معاشی رویے سے ملک کی قسمت بنتی ہے اور بگڑ بھی سکتی ہے — چنانچہ ملکی معاشیات کے سلسلے میں جلد بازی اور جذباتیت بے حد نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جب کوئی معاشی مسئلہ یا بحث سامنے ہو تو ہم حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے اس کے سارے پہلوؤں پر غور کریں۔ اس کے بعد ہی ہمیں یہ حق حاصل ہو سکے گا کہ ہم کوئی آخری بات کہہ سکیں۔ دراصل ہم اپنے اطراف کی اشیا کو رنگین عینکوں سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ اگر بات صرف کرکٹ، ہاکی، یا ٹیڈی لباس کی ہو تو شاید یہ رنگین عینکیں اس قدر نقصان دہ ثابت نہ ہوں۔ لیکن جب قوموں کے معاشی مسائل زیر بحث آ جائیں تو یہی رنگین عینکیں روشنی اور اندھیرے کے درمیان دیوار بن سکتی ہیں۔

صورت یہ ہے کہ دنیا کے ممالک معاشی اعتبار سے تین عنوانات کے تحت تقسیم کئے جا سکتے ہیں ایک وہ جن کو صنعتی معیشت کی بخشی ہوئی نعمتیں حاصل ہیں اور دوسرے وہ جن کو صنعتی معیشت بھی نصیب نہیں ہے۔ اور تیسرے وہ ممالک جن کی معیشت رفتہ رفتہ صنعتی معیشت کے مثالیے کی طرف بڑھ رہی ہے پہلی قسم کے ممالک میں روس امریکہ یورپی ممالک اور جاپان وغیرہ شامل ہیں دوسری قسم کے ذیل میں افریقہ ایشیا اور جنوبی امریکہ کے بعض ممالک کے نام آتے ہیں اور تیسری قسم کے تحت جسے ترقی پذیر معیشت کا نام دیا جاتا ہے وہ تمام ممالک آ جائیں گے جو فعال انداز میں معاشی استحکام اور خوش حالی کا وہ درجہ حاصل کرنے کی جد و جہد کر رہے ہیں جو صنعتی معیشتوں کو حاصل ہے اس تقسیم کے تحت پاکستان کو ترقی پذیر معیشت شمار کیا جا سکتا ہے۔

ملکوں کی اس سیاسی تقسیم کا صرف یہی ایک پہلو اہم نہیں ہے کہ کون ملک صنعتی طور پر ترقی یافتہ ہے اور کون پسماندہ اس تقسیم کے پیچھے نتائج کی منطق ہے یعنی یہ کہ کسی معیشت کے صنعتی یا غیر صنعتی ہونے سے عام استحصال اور معاشی استحکام پر کیا اثر پڑا ہے۔ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کو اس لئے بھی ہم ایک الگ حیثیت دینے پر مجبور ہیں کہ ان کی صنعتی ترقی نے ان کے معیار زندگی اور فی کس آمدنی کو اس حد تک بڑھا دیا ہے کہ ساری دنیا

کے ممالک کیلئے باعث رشک اور بعض اوقات باعث حسد بن گئے ہیں۔ امریکہ ہی کو لیجئے دولت کی ایسی بے ہنگم اور لامتناہی فراوانی شاید ہی تصور میں آسکے۔ پیداوار ان حدوں کو چھو چکی ہے کہ اگر فاضل پیداوار کو دوسرے ملکوں کے سامنے معاشی اور فوجی امداد بنا کر پیش نہ کیا جائے تو ایسے بھیانک نتائج مرتب ہوں گے کہ امریکہ کی پوری معاشی عمارت لرز جائے گی۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں تو زندگی اور موت کا مسئلہ یہ ہے کہ زرعی پیداوار کس طرح بڑھائی جائے اور امریکہ میں حکومت کی پریشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ کس طرح زرعی پیداوار کو بڑھنے سے روکا جائے یہ اس لئے کہ اگر غلہ اور دوسری زرعی اشیا کی رسد ملک کی ضروریات سے زیادہ ہو گئی تو قیمتیں گر جائیں گی۔ قیمتوں کا گرنا کسی معیشت کیلئے کیوں نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے یہ ایک وقت طلب بحث ہے جس میں بات خود معاشی نظام تک جا پہنچے گی۔ فی الحال میرا مقصد اس حیرت انگیز خوشحالی کی طرف اشارہ کرنا ہے جس کا ترقی یافتہ صنعتی ممالک شکار ہیں معاشی خوشحالی کا ایک اہم پیمانہ فی کس آمدنی ہے فی کس آمدنی وہ عدد ہے جو قومی آمدنی کو آبادی سے تقسیم کرکے حاصل ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک صنعتی پاکستان کی فی کس آمدنی کا مقابلہ کرنے کیلئے ذیل کے اعداد و شمار ملاحظہ فرمائیں یہ ۵۸-۱۹۵۷ سے متعلق ہیں۔

ملک	فی کس آمدنی
پاکستان	۲۲۹ روپے
جاپان	۱۲۰۵ روپے
برطانیہ	۴۵۶۲ روپے
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۱۰۰۴۸ روپے

۵۸-۱۹۵۷ء کے بعد سے پاکستان کی فی کس آمدنی میں اضافہ ہوا ہے۔ اب فی کس آمدنی ۲۵۶ روپے ہے لیکن یہ بھی امریکہ کی فی کس آمدنی کی صرف ۲½ فیصد ہے۔ اب آپ خود اندازہ کر لیجئے کہ امریکہ کے معیار زندگی تک پہنچنے کیلئے ہمیں ۲½ سے ۱۰۰ تک کا فاصلہ طے کرنا ہے یہ تو خیر خواب ہے لیکن بہر حال حقیقت تو یہی ہے کہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ معیشت اس بات کی ضمانت دے سکتی ہے کہ افراد کا معیار زندگی بلند سے بلند تر، ہوتا چلا جائے گا مختلف ملکوں کے درمیان معیار زندگی اور عام معاشی خوشحالی کے سلسلے میں ایسے خوفناک تضادات ہی نے اس احساس کو جنم دیا ہے جسے بڑھتی ہوئی توقعات کا انقلاب کہا جاتا ہے۔ معاشی طور پر خوشحال ممالک کی خوشحالی پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کیلئے ایک چیلنج بن گئی۔ ہر ملک کی کوشش یہی ہے کہ جلد از جلد اس معاشی خلیج کو پر کر دیا جائے جو صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کے اور غریب ممالک کے درمیان حائل ہے اس بظاہر منفی انداز نظر کے ساتھ ہی ایک مثبت پہلو یہ ہے معاشی خوشحالی کی یہ دوڑ ملکوں کے درمیان معاشی اولمپک کھیلوں کی حیثیت ہی نہیں رکھتی بلکہ اس کے نتیجے میں بڑھتی ہوئی معیشتیں اپنے لئے بہتر سماجی اور سیاسی حالات پیدا کر سکیں گی۔

تو پھر ثابت یہ ہوا کہ پاکستان کے معاشی مسائل کے بارے میں گفتگو کرتے وقت ہمیں چند باتیں طے کرنی پڑیں گی۔ ایک یہ کہ آیا ہم اپنی معیشت کو اس راستے پر لیجانا چاہتے ہیں جو ہمیں خوشحالی کے مغربی معیار تک پہنچا دے اور یہ کہ اگر ہم ایسا چاہتے ہیں تو کیوں؟ دوسرے یہ کہ اگر ہم اپنی معاشیاتی سوچ میں اس مقصد کو اہم ترین مثالیہ قرار دیتے ہیں تو صنعتی ملکوں کے معیار زندگی تک پہنچنے کیلئے ہم کس رفتار کے متمنی ہیں ان سوالات کے جوابات پر اتفاق کر لینے کے بعد ہی ہم پاکستان کے معاشی مستقبل کے بارے میں کسی بحث کا آغاز کر سکیں گے۔

اس نتیجے پر پہنچنے میں ہمیں زیادہ وقت نہیں لینا چاہئے کہ صنعتی معیشت کا مثالیہ ہی ہمیں اپنے عہد کے ساتھ ساتھ چلنے کے قابل بنا سکے گا۔ اگر ہم ایک زرعی معیشت پر قانع رہتے ہیں تو پھر ہمیں اور بہت سے شعبوں میں بھی قناعت پر مجبور ہونا پڑے گا ضروریات زندگی اب صرف غذا اور کپڑے تک محدود نہیں ہیں صنعتی اور سائنسی عہد نے انسان کی عام زندگی کو یکسر بدل ڈالا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اگر ہم زرعی معیشت کے ساتھ ساتھ یہ بھی چاہیں کہ ہمیں صنعتی عہد کی مخصوص زندگی بھی نصیب ہو تو پھر لامحالہ ہمیں غذا کے علاوہ بقیہ ضروریات درآمد کرنی پڑیں گی جس کے لئے اسی قدر دولت کی ضرورت ہے جو ہمیں صنعتی طور پر خود اپنے پیروں پر کھڑا کر سکتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ مثلاً ڈیزل انجن باہر سے منگانے پر ہمیں جتنا روپیہ صرف کرنا پڑے گا اگر وہی روپیہ بالآخر ہم اپنے ملک میں ڈیزل انجن بنانے پر صرف کریں تو ہمیں کوئی نقصان نہیں ہوگا اس کے برعکس اس کے جو فوائد ہوں گے وہ ہمارے لئے معاشی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ سیاسی اور سماجی اعتبار سے بھی زیادہ وزنی ہوں گے۔ خالص زرعی معیشت اس وقت بھی پاکستان میں موجود نہیں ہے ہم اپنے لئے کپڑا بناتے ہیں اور اسی طرح بعض اور ضروریات بھی آزادانہ پوری کرتے رہتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ہماری صنعتوں کو ہم کس تیزی سے اپنی معیشت میں شامل کریں اس کے علاوہ یہ کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمیں صنعتی معیشت کی ضرورت ہے تو ہمارا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ ہمیں زرعی پیداوار بڑھانے کی طرف توجہ نہیں کرنا چاہئیں حقیقت یہ ہے کہ صنعت اور زراعت کا ایک متوازن امتزاج ہی ہمیں آگے لے جا سکتا ہے بین الاقوامی سطح پر بہت سی سیاسی آزادی بھی اکنامک کی متقاضی ہے کہ ہم ہماری صنعتوں کو فروغ دیں یہ سب کیوں ضروری ہے؟ اس کے لئے تفصیل کی ضرورت ہے اور اس کیلئے جو دلائل ہیں ان کی صحیح وضاحت کے لئے پہلے تو ہمیں ترقی پذیر معیشتوں کی میکانیات کو سمجھنا پڑے گا اور پھر ان معاشی اصولوں کو پاکستان کے مخصوص معاشی حالات پر منطبق کرکے نتائج نکالنا ہوں گے۔

ترقی پذیر معیشتوں میں تمام تر معاشی جدوجہد کا رخ قومی آمدنی میں اضافے کی طرف ہوتا ہے ہر ترقی پذیر ملک کی طرح پاکستان کی کوشش اور خواہش بھی یہی ہے کہ قومی آمدنی میں تیز سے تیز تر اضافہ ہو۔ یہ اضافہ کس طرح وجود میں آتا ہے اور اس کی مقدار کو کس طرح بڑھایا جا سکتا ہے اس پر غور کرنے سے پہلے یہ سمجھ لینا مناسب ہے کہ قومی آمدنی کسی معیشت میں معاشی اشیا اور خدمات کے بہاؤ کا نام ہے۔ یہ بات واضح ہو جائے گی اگر ہم یاد رکھیں گے کہ معاشی اشیا وہ تمام اشیا ہیں جو انسانی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں مثلاً غذا کپڑا یا مزدوری، مشین وغیرہ اور خدمات وہ تمام کام ہیں جو کسی اجرت کے عوض پیش کئے جا سکتے ہیں مثلاً۔ ڈاکٹروں، انجینئروں، پروفیسروں یا مزدوروں کی پیشہ ورانہ خدمات جن کا معاوضہ قیمت نہیں بلکہ اجرت کہلاتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ قومی آمدنی کسی معیشت میں معاشی اشیا اور خدمات کے بہاؤ کا نام ہے تو ہماری مراد دراصل ان تمام مصارف سے ہوتی ہے جو ملک کے تمام افراد نے معاشی اشیا اور خدمات پر کئے ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ہر معاشی نظام میں ایک طرف تو اشیا اور خدمات ہوتی ہیں اور دوسری طرف وہ روپیہ جو اشیا اور خدمات پر صرف کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب بھی میں یا آپ کوئی شے خریدتے ہیں یا اجرت کے عوض کوئی خدمت حاصل کرتے ہیں تو ہمارا خرچ اشیا یا خدمات کے مالک کی آمدنی بن جاتا ہے۔

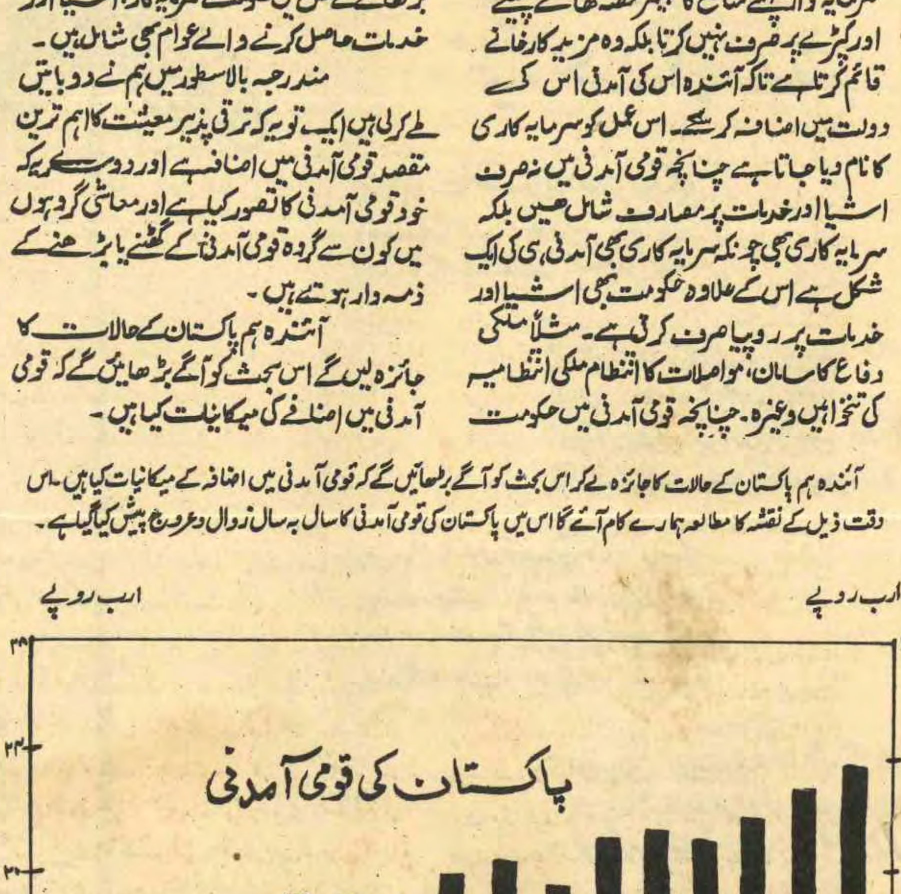
قومی آمدنی ملک کے تمام افراد کی آمدنی کا پیمانہ ہے لہٰذا ہم اسے پورے ملک میں کئے گئے مصارف کے ذریعے ناپ سکتے ہیں ظاہر ہے کہ ہم اشیا اور خدمات پر جو روپیہ صرف کریں گے وہ ان کی قیمت یا اجرت ہوگا چنانچہ اگر ہم تمام غذائی پیداوار کو جو ملک میں کام آتی۔ اس کی قیمت سے ضرب دیں تو قومی آمدنی کا ایک حصہ ناپ لیں گے یعنی وہ آمدنی جو غذا پیدا کرنے والوں کو ہوئی یا دوسرے الفاظ

میں وہ مصارف جو غذا استعمال کرنے والوں نے کئے۔ اس طرح پوری معیشت کی پیداوار کو قیمت سے ضرب کرکے ہم قومی آمدنی کے تخمینے تک پہنچ سکتے ہیں مصارف کے سلسلے میں ایک بات یاد رکھنا ضروری ہے یہ تو آپ اور میں جانتے ہی ہیں کہ ہم اپنی ساری آمدنی کو اشیا اور خدمات پر صرف نہیں کرتے ہم کچھ بچاتے بھی ہیں یہ بچت ہی ہمیں اس قابل بناتی ہے کہ ہم مستقبل کا مقابلہ کرسکیں۔ نتیجہ یہ کہ اشیا اور خدمات پر براہ راست صرف کے بجائے ہم اپنی آمدنی کا کچھ حصہ ایسے کاموں میں لگاتے ہیں جن کے ذریعہ ہم آئندہ بہتر اشیائے صرف پیدا کرسکیں گے۔ مثلاً ایک سرمایہ دار اپنے منافع کا بیشتر حصہ کھانے پینے اور کپڑے پر صرف نہیں کرتا بلکہ وہ مزید کارخانے قائم کرتا ہے تاکہ آئندہ اس کی آمدنی اس کی دولت میں اضافہ کرسکے۔ اس عمل کو سرمایہ کاری کا نام دیا جاتا ہے چنانچہ قومی آمدنی میں نہ صرف اشیا اور خدمات پر مصارف شامل ہیں بلکہ سرمایہ کاری بھی چونکہ سرمایہ کاری بھی آمدنی ہی کی ایک شکل ہے اس کے علاوہ حکومت بھی اشیا اور خدمات پر روپیا صرف کرتی ہے۔ مثلاً ملکی دفاع کا سامان، مواصلات کا انتظام ملکی انتظامیہ کی تنخواہیں وغیرہ۔ چنانچہ قومی آمدنی میں حکومت کے مصارف بھی شامل کئے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ قومی آمدنی میں عام اشیا اور خدمات پر مصارف… سرمایہ کاری اور حکومت کے مصارف شامل ہوتے ہیں۔ اگر ہم یہ اندازہ کرسکیں کہ ایک سال کے عرصے میں پورے ملک میں اشیا اور خدمات پر کیا مصارف ہوئے۔ کتنی سرمایہ کاری ہوئی اور حکومت کے مصارف کیا ہے تو ان کو جمع کرکے ہم اس سال کی قومی آمدنی معلوم کرسکتے ہیں۔ قومی آمدنی کے سلسلے میں اس تفصیل سے مقصد یہ ہے کہ آئندہ بحثوں میں جب قومی آمدنی کو بڑھانے کے ذرائع اور امکانات کا ذکر آئے تو ہم یہ سمجھ سکیں گے قومی آمدنی میں اضافہ معیشت کے کن علاقوں سے آتا ہے قومی آمدنی کو بڑھانے کے عمل میں حکومت سرمایہ کار، اشیا اور خدمات حاصل کرنے والے عوام بھی شامل ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے دو باتیں طے کرلی ہیں ایک تو یہ کہ ترقی پذیر معیشت کا اہم ترین مقصد قومی آمدنی میں اضافہ ہے اور دوسرے یہ کہ خود قومی آمدنی کا تصور کیا ہے اور معاشی گروہوں میں کون سے گروہ قومی آمدنی کے گھٹنے یا بڑھنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

آئندہ ہم پاکستان کے حالات کا جائزہ لیں گے اس بحث کو آگے بڑھائیں گے کہ قومی آمدنی میں اضافے کی میکانیات کیا ہیں۔

آئندہ ہم پاکستان کے حالات کا جائزہ لے کر اس بحث کو آگے بڑھائیں گے کہ قومی آمدنی میں اضافہ کے میکانیات کیا ہیں۔ اس وقت ذیل کے نقشہ کا مطالعہ ہمارے کام آئے گا اس میں پاکستان کی قومی آمدنی کا سال بہ سال زوال وعروج پیش کیا گیا ہے۔



قومی آمدنی کے اس اتار چڑھاؤ کو ذہن میں رکھ کر ہم آئندہ ماہ سے پاکستان کے معاشی مسائل پر باری باری بحث کریں گے تاکہ ہمارے قارئین کے سامنے ملکی معیشت کے وہ تمام پہلو آجائیں جو ہماری ترقی کے لئے ناگزیر اہمیت کے حامل ہیں۔



محسن بھوپالی

غزل

جس کا درد بٹاؤ گے
اس سے رنج اٹھاؤ گے

سب کو دوست بناؤ گے
سب کو دشمن پاؤ گے

دور نہ جاؤ نظروں سے
دنیا میں کھو جاؤ گے

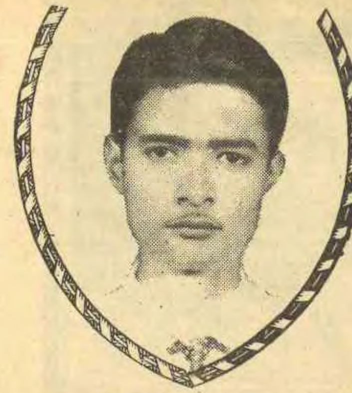
محفل محفل چھپتے ہو!
خلوت خلوت پاؤ گے

دیکھو مت ہشیار ہو
دیکھو دھوکہ کھاؤ گے

تن آسانی کہتی ہے!
مشکل میں پڑ جاؤ گے!

دیوانے کو مت سمجھاؤ
دیوانے کہلاؤ گے!

محسنؔ جو سمجھاتے ہو
خود کو بھی سمجھاؤ گے



شبی فاروقی

غزل

گردِ سفر ہے تیرگیٔ شب قدم بڑھاؤ
منزل سے پہلے راہ میں ممکن نہیں پڑاؤ

ظاہر میں لب پہ موجِ تبسم، دلوں میں گھاؤ
دیکھا ہے تیرے شہر کے لوگوں کا رکھ رکھاؤ

آندھی کی زد پہ بڑھتے چلو عزمِ نو کے ساتھ
بجھنے لگیں چراغ تو دل کے دیئے جلاؤ

تخ بستہ رہگذارِ تمنا ہے ساتھیو
جلتے رہیں کچھ اور ابھی ذہن کے الاؤ!

اپنا لہو بھی مطلعِ خورشید بن گیا
کیا شوخ تر ہے دستِ نگاریں کا یہ چاؤ



محبوب اللہ مجیب

"حیاتِ نکہتِ گُل ہے تو......"

اس اجنبی سے شہر میں مسافروں کی طرح
بھٹکتا پھرتا ہوں، شاید کہ راستہ مل جائے
"ہرن" کا پیچھا کروں تو "شکنتلا" مل جائے

میں تجھ سے دور سہی پھر بھی تیری نرم نگاہ
دلِ عزیز سے سرگوشیوں میں کہتی ہے
"جو پلکیں خشک ہیں، ان کو نہ اشک بار کرو،
خدا کے واسطے مجھ سے نہ اتنا پیار کرو

یہاں پہ میں، مری تنہائی اور اداسی ہے
یہاں کی ریت، زمانے سے ہی نرالی ہے
یہاں کی رات پہ تاریکیوں کا پہرا ہے
جدھر نگاہ اٹھاؤ ادھر اندھیرا ہے

وہاں پہ تم ہو، بہاریں ہیں، آرزوئیں ہیں
سہیلیاں ہیں، اودھم چوکڑی ہے باتیں ہیں
تمہارا کمرہ ہے، تصویریں ہیں، کتابیں ہیں

تمہیں جو فکر، وہاں ہوگی، صرف اتنی سی
تمہاری ننھی سی گڑیا، زباں چلانے لگے
کبھی بلاؤ جو اسکو تو مسکرانے لگے

وہاں تم اور تمہاری سہیلیاں ہوں گی
مہکتی ہوں گی جو پھولوں کی ڈالیاں ہوں گی
"بندرابن" میں بہت ساری "گوپیاں" ہوں گی

تمہیں خبر بھی نہ ہوگی کہ زندگی کیا ہے
حیاتِ نکہتِ گل ہے تو مفلسی کیا ہے
کرم زمانے کے جتنے ہیں مخلصانہ ہیں
ستم بھی جتنے ہیں اسکے دوستانہ ہیں

طفیل عباسؔ

ایک شخصیت

ایک خاکہ

بادشاہ حسین
ایم ۔ ایچ ۔ قیصر
حبیب سجّاد



ادارہ "منشور" کے فیصلے کے مطابق ہمیں منشور کے سالنامے کیلئے ایر ویز ایمپلائز یونین پی آئی اے برانچ کے بانی طفیل عباس صاحب کا انٹرویو لینا تھا لہٰذا ہم ان کے پاس پہنچے اور اپنے مقصد کا اظہار کیا۔ موصوف پہلے تو سنجیدگی سے کچھ سوچتے رہے اور پھر مسکراتے ہوئے انہوں نے ۲۲ر دسمبر اتوار کی صبح کو ہمیں اپنے گھر پر آنے کی دعوت دے دی ہم اتوار کو ان کے گھر جا پہنچے چار پانچ منٹ زیادہ ہو چکے تھے یا خود ان کی ہی گھڑی چار پانچ منٹ آگے تھی کہ ہم نے انہیں چشم براہ پایا۔ مصافحہ اور رسم گفتگو کرتے ہوئے ہم ان کے ساتھ ڈرائننگ روم میں داخل ہوتے۔ سامنے ہی رکھے ہوئے شوکیس میں رنگ برنگی اور پیاری پیاری چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر کچھ تصاویر اور احمد باشام کے بنائے ہوئے مٹی کے انسانی چہرے آویزاں تھے۔ ایک طرف ریک پر کچھ کتابیں اور رسالے ترتیب سے جمے ہوئے تھے درمیان میں میز پر گلدان میں چند تر و تازہ گلاب کے پھول سجے ہوئے تھے ایک پرسکون سا ماحول تھا ہم لوگ بیٹھ گئے۔

جلد ہی ہم نے ایسی کاروباری باتیں شروع کردیں سب سے پہلے تو ان کے وطن ابتدائی زندگی اور تعلیم کے متعلق سوال کیا انہوں نے آہستہ آہستہ اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے بتانا شروع کیا۔

میں ۲۸-۱۹۲۷ء میں ایک چھوٹے سے قصبے ڈبائی ضلع بلند شہر میں پیدا ہوا ہمارا خاندان نچلے متوسط طبقے کا خاندان تھا۔ پہلوٹی کا بچہ ہونے کی وجہ سے میں اپنے والدین اور خصوصاً دادی کا بڑا لاڈلا تھا۔ نتیجتاً شروع سے ہی آوارگی اور شوریدہ سری نے طبیعت میں اپنے قدم جما لئے تھے۔ نو سال ہی کا تھا کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ والدہ نے معاشرہ کی تمام مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے میری اور بہن بھائیوں کی پرورش کی کیونکہ وہ فطرتاً روشن خیال تھیں۔ اس لئے انہوں نے میری تعلیم پر خاص توجہ دی۔ جب میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا تو کچھ لوگوں کو اپنے کاندھوں پر بیلچے رکھ کر پریڈ کرتے دیکھا۔ وقتاً فوقتاً میں نے یہ بھی دیکھا کہ یہ لوگ غریبوں اور ضرورت مندوں کے گھر جا کر ان کا ہاتھ بھی بٹاتے ہیں۔ یہ لوگ بظاہر تو کچھ عجیب اور بے ڈھنگے سے نظر آتے تھے مگر نہ جانے کیوں میرا دل ان کی طرف کھنچتا اور میرا ذہن ان سے متاثر ہوتا تھا یہ لوگ خاکسار تھے۔



۲۱ر جولائی ۱۹۶۰ء کو طفیل عباس پی۔ آئی۔ اے کے ایک جلسہ عام میں تقریر کر رہے ہیں بائیں طرف اس وقت کے جنرل سکریٹری اقبال علوی کھڑے ہیں

تعلیم کے سلسلے میں مجھے ضلع بلند شہر اور علیگڑھ میں رہنا پڑا جہاں قصبے سے بالکل مختلف زندگی تھی سیاسی ہنگامے آئے دن کی باتیں تھیں

بحیثیت مسلمان مسلم لیگ میری مخصوص توجہ اور دلچسپی کا مرکز تھی۔ قائد اعظم کی شخصیت میں میرے لئے ایک کشش تھی لہذا اسی زمانے میں میں نے مسلم لیگ میں ایک عام رکن کی حیثیت سے خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بی۔ اے میں مجھے انہیں سرگرمیوں کی وجہ سے اس وقت کے برطانوی ڈپٹی کمشنر ڈکسن "صاحب" کی خصوصی توجہ کا مرکز بننا پڑا ان کے حکم "اسے یونیورسٹی سے نکال دیا جائے" کی تعمیل میں یونیورسٹی کے مشہور اور نوکر شاہی ذہنیت رکھنے والے افسران نے ہمیشہ کیلئے مجھے یونیورسٹی سے خارج "SENT DOWN" کر دیا لیکن ۱۹۴۵ء میں امتحانات کے قریب آنے پر کچھ با اثر شخصیتوں کی مداخلت سے مجھے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی اور میں نے امتیازی حیثیت سے کامیابی حاصل کرلی۔ والدہ اور میری خواہش تو یہی تھی کہ اور آگے پڑھوں لیکن قدامت پسند بزرگوں اور مذہبی ماحول کی وجہ سے یہ خواہش پوری نہ ہو سکی پھر حالات بھی ایسے تھے کہ میں جلد ہی اپنے باپ کی جگہ لوں چنانچہ دہلی پہنچا اور کئی مہینوں تک جوتیاں گھسنے کے بعد اصفہانی میں ۵۰ روپے ماہوار کی ایک نوکری کر کے میں ایک طالب علم سے کلرک محض بن کر رہ گیا یہاں بھی سیاسی ماحول بڑا زوروں پر تھا تقسیم ــــ آج

اور کل کی بات تھی اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ایک معمولی کلرک نہ تو سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکتا ہے اور نہ ہی اپنی ذہنی صلاحیتوں کو جلا بخش سکتا ہے اس لئے وہ کلرک اپنی ماں کو واپس آنے کی کچھ تسلیاں اور دلاسے دے کر مملکت خداداد پاکستان کے ہونے والے دارالخلافہ کراچی آگیا دل میں صرف یہ ارمان مچل رہا تھا کہ اپنی نئی جنت میں جشن آزادی کی بہار دیکھوں گا مگر...

یہ جملے کہتے ہوئے طفیل صاحب اپنے زخمی دل کے داغ نہ چھپا سکے ان کی گفتگو کا تسلسل ٹوٹ گیا اور کچھ دیر تک تو ایسا ہوا کہ ان کے لب ہلتے رہے مگر ہمارے کان ان کی آواز نہ سن سکے لیکن ہماری آنکھیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ یہ شاید اس داغ داغ اجالے اور شب گزیدہ سحر کی ضرب کاری ہے جس کا ان کے ذہن میں شائبہ تک نہ تھا بہرحال جب ہم نے انہیں متوجہ کیا تو وہ بولے کہ ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کے جشن آزادی میں انہوں نے خون اور آگ کے جو روح فرسا مناظر دیکھے وہ اس بات کے مظہر اور گواہ تھے کہ یہ آزادی اصل آزادی نہیں ہے میں ہنگاموں اور فسادات میں یہیں پھنس کر رہ گیا اور سارے گھر والے دہلی کے فساد زدہ علاقوں میں گھر گئے مگر ایک انسان دوست نے ہندوؤں کا لباس پہن اور پہنا کر گھر والوں کی جان بچائی اور وہ پاکستان آ گئے یہاں ہم نے بے گھر اور بے در زندگی گزاری ایک عزیز نے کرم کیا کہ ایک پلنگ کے برابر جگہ دے دی یہیں پر ماں اور بہن

کو تپ دق کے جراثیم ملے ڈھنگ کی نوکری تو خیر دیوانے کا خواب تھا بھلا کیسے پورا ہوتا...... بڑی سفارشوں اور منت کے بعد ۸۶ روپے ماہوار کی نوکری ملی اسی مختصر سی آمدنی میں بیماری، تعلیم رہائش، مجھے اک اور دوسرے تمام مسائل کا سامنا کرنے پر اس معاشرہ نے مجبور کر دیا تھا۔

ان تمام کٹھنائیوں اور پیچیدگیوں کے ذکر سے ماحول افسردہ سا ہو گیا تھا اور اس کے نقش طفیل صاحب کے چہرے پر بھی نظر آ رہے تھے لیکن ان کی اجلی پیشانی پر عزم اور ہمت کی گہری لکیریں بتا رہی تھیں کہ ان واقعات نے انہیں بہر طور زندگی گزارنے کے ڈھنگ سمجھا دیئے۔

ہمارے دوسرے سوال کے جواب میں جوان کی عملی زندگی، مزدور تحریک سے رابطے اور ان کے ذہنی انقلاب کے متعلق تھا انہوں نے بتایا کہ سب سے زیادہ تو مجھے اس بات سے دھکا پہنچا تھا کہ پاکستان جن نعروں پر قائم کیا گیا ہے ان میں سے کسی بھی ایک نعرے پر یہاں عمل نہیں کیا گیا اور نہ ہی کچھ ایسے آثار نظر آئے جن سے اس بات کا احساس ہوتا کہ آج نہیں تو کل عوام کی فلاح و بہبود کیلئے کچھ نہ کچھ کیا جائے گا۔ دوسری طرف میری ماں اور بڑی بہن کی بیماریوں نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ آخر ہم سب نے کیا گناہ کیا ہے جس کی پاداش میں ہمیں ابتلاء و مصائب کا یہ صلہ ملا، مرض تو مل جائے مگر دوا نہ ملے انسان رہنا چاہے اور اسے گھر نہ ملے بھائی پڑھنا چاہے اور اسے علم نہ ملے، بہن جوان ہو اور اسے بیاہ

ملے یہ تھا وہ بنیادی فرق اور تضاد جو مجھے اور میرے جیسے انسانوں کو چکی کے دو پاٹوں میں انتہائی بے رحمی اور سنگدلی کے ساتھ پیس رہا تھا۔ دن بھر دفتر میں محنت کرتے کرتے اور شام اور رات کو گھر میں آہیں اور کراہیں سنتے سنتے میں ذہنی طور پر مضطرب و بے چین ہو گیا تھا۔ روشنی کی کوئی کرن نہ تھی جوان مسائل سے پیدا ہونے والے بھیانک اندھیرے میں امید و آس کا سندیسہ لاتی اسی زمانے میں مجھے اورینٹ ایرویز کی نئی صنعت میں اپنی تعلیم کی وجہ سے اور ایک کرم فرما کی سفارش پر ۱۷۵ روپے کی جگہ مل گئی جہاں مجھے انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ میں لگایا گیا تھا یہاں میں دن رات مزدور طبقے کو لوہے کے پرزوں میں وہ روح پھونکتے دیکھتا جن کی بدولت ہوائی جہاز بلند و بالا فضاؤں کا سینہ چیرتے ہوئے پرواز کرتے اور میں یہ بھی دیکھتا کہ جہازوں کو اڑانے والے یہ مجبور مزدور خود اپنے آپ شکستہ پیرہن تھا اسی زمانے میں میری والدہ کا انتقال ہو گیا اور میں یہ سوچتا ہی رہ گیا کہ میں کبھی نہ کبھی تو اپنی اس سب سے بڑی محسن ماں کی مثالی انداز میں خدمت کروں یہی زمانہ تھا کہ ۱۹۴۹ء میں اورینٹ کے مزدوروں نے اورینٹ ایرویز ورکرز یونین کی قیادت میں بہتر حالات زندگی اور مناسب حالات کار کیلئے ہڑتال کر دی اس ہڑتال سے مجھے نہ جانے کیوں یک گونہ اطمینان حاصل ہوا کہ ہم بھی اپنے جذبات و احساسات کا اجتماعی و مشترکہ پیمانے پر اظہار کرنے پر قادر ہیں مگر ساتھیوں میں نے یہ بھی دیکھا کہ اورینٹ ایرویز کے منتظمین نے

اپنی بے پناہ قوت و وسائل کچھ نا سمجھ اور ججوں کی بدولت اس ہڑتال کو کچل دیا گیا۔ ہڑتال کے زمانے میں کام کرنیوالوں کو میں نے پندرہ پندرہ دن کا بونس لیتے ہوئے بھی دیکھا اور ہڑتال کے زمانے میں کام چھوڑنے والوں کو نوکری سے بے دخل ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔ انتظامیہ کے اس جابرانہ اور غیر منصفانہ رویے نے مجھے یہ سمجھا دیا کہ ظلم کی بہت سی شکلوں میں سے ایک یہ بھی شکل ہے اور جب اس زمانے کے اصفہانی صاحب نے اس یونین کو باقاعدہ ختم کر کے رکھ دیا تو پھر میں یہ بھی سمجھ گیا کہ شاید یہی ظلم سارے مظالم میں سب سے شدید اور بدترین ظلم ہے اپنے اسی شعور اور احساس کی بدولت ہم نے آپس میں مل جل کر ۱۹۵۰ء میں کریڈٹ سوسائٹی قائم کی تاکہ اسی طرح ہم اپنی نجی اور خانگی الجھنوں کو کسی نہ کسی حد تک سلجھا لیں مگر اس سوسائٹی کی نمایاں ترقی کے باوجود بھی ہماری زندگی سے تعلق رکھنے والے معاشی مسائل نہ سلجھتے ہیں نہ سلجھے زندگی تھی کہ وبال جان بن گئی تھی اس وبال اور بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے ہم نے ایک باقاعدہ ٹریڈ یونین کی تشکیل کر دی۔ اس یونین کا سکریٹری مجھے ہی چنا گیا اس زمانے میں میں نے باقاعدہ مزدور تحریک میں کام کرنا شروع کر دیا تھا مجھے اپنی دن رات کی سرگرمیوں کی وجہ سے جسمانی تھکن ضرور محسوس ہوتی تھی مگر ساتھ ہی ساتھ ذہنی سکون بھی ملتا تھا میرے اندر اس اندھیرے ماحول سے لڑنے کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا میری سرگرمیوں کا

دائرہ دن بدن وسیع ہو رہا تھا کہ ۱۹۵۴ء میں آئین کی منسوخی اور جمہوریت کی پامالی کے سلسلے میں غلام محمد کی حکومت نے باقاعدہ پکڑ دھکڑ کا ایک ہمہ گیر سلسلہ شروع کیا جس میں مجھے بھی دھر لیا گیا الزامات یہ تھے کہ میں نے ہڑتالیں منظم کیں محلہ کمیٹیوں میں کام کیا اور یہ کہ میرا تعلق کمیونسٹ پارٹی سے ہے۔ الزامات کا کھوکھلا پن ظاہر ہی تھا لہٰذا چار پانچ ماہ بعد ہی رہا کر دیا گیا اور اورینٹ ائرویز نے عوام میں کافی مقبولیت ہونے کی وجہ سے کام پر لے لیا۔

۱۹۵۵ء میں اورینٹ ایرویز کی انتظامیہ P.I.A میں ضم ہوئی اور انتظامیہ میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں پرانے منتظمین گئے اور ان کی جگہ اور نئے لوگ آئے جس سے امید بندھی کہ شاید اب ہم مزدوروں کے مسائل حل ہو جائیں گے مگر افسوس کہ نوکر شاہی ذہنیت رکھنے والے آفیسر آہستہ آہستہ ایک بار پھر انتظامیہ پر چھا گئے اور اب ہمیں میدان میں آنا ہی پڑا۔ اور نومبر ۱۹۵۵ء کو نصف گھنٹے کی علامتی ہڑتال کر دی گئی حسب توقع حکومت کی مشینری استحصالی سرمایہ داروں کی مدد کے لئے حرکت میں آ گئی مجھے اور میرے رفیق ادیب احمد خاں کو گرفتار کر کے مزید مصائب اور مشکلات میں ڈالا گیا مگر ہم نے بھی ہمت نہ ہاری اور اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ آخر کار انتظامیہ کو یہ سمجھنا پڑا کہ ہم نے غلط راستہ اختیار نہیں کیا تھا ہمارا نقطۂ نظر قومی اور ترقی پسندانہ تھا اور اسی میں کمپنی کی بہتری تھی چنانچہ انگریز جنرل مینیجر



پی۔ آئی۔ اے کے ایک جلسۂ عام میں خطاب کر رہے ہیں

کے۔ جے بھور۔ کو برطرف کرکے انگلینڈ واپس بھیج دیا گیا اور ہم مارچ ۱۹۵۶ء میں آہنی سلاخوں سے باہر آئے اور ان نئے حالات میں انتظامیہ نے یونین کو سمجھنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں کمپنی کے حالات بہتر ہوئے مگر زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ ادھر ملک میں مارشل لا نافذ ہو گیا۔ اور تیسری بار پھر ایک ماہ کیلئے قید کیا گیا

تھا کہ ہم کسی بھی طرح کی تخریبی سرگرمیوں سے تعلق نہیں رکھتے ہمارا مقصد مزدوروں کیلئے بہتر حالات کا حاصل کرنا اور ان کے جائز مفادات کا حتی الامکان پرامن اور قانونی ذرائع سے تحفظ کرنا ہے اس لئے ان کی اپنی طرف سے کوئی اعتراض و شکایت نہیں کی گئیں لہذا میں دیس کی کھلی فضاؤں میں واپس آ گیا۔ طفیل صاحب اتنا کہہ کر خود بخود ہنس پڑے ان کی آنکھیں دور ماضی میں کچھ تلاش کر رہی تھی کوئی دلچسپ سی بات تھی جو انہیں مضبوط کر رہی تھی یوں بھی ان کی چھوٹی چھوٹی تیز اور چمکدار آنکھیں گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی ہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ وقت کے دبیز پردوں کو چیرتی ہوئی ماضی کے واقعات کو ان کے سامنے لا کر اس طرح پیش کر دیتی ہیں کہ پھر وہ ان واقعات کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے آج کی بات ہو۔ خیر! تو انہوں نے ہنستے ہنستے کہا کہ سالوں نے مجھے پھر پکڑ لیا۔ ارے بھائی ہم تو کہتے ہیں کہ کوئی جرم ہو تو پکڑ دیں، پہلے تو ہم ہڑتال کرتے تھے تو پکڑے جاتے تھے مزدور آبادیوں میں کام کرنے کے جرم میں نظر بند ہوتے تھے۔ مگر اس مرتبہ کی گرفتاری تو بڑی ہی دلچسپ تھی۔ گرفتاری کی وجہ یہ تھی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر عالی وقار آئزن ہاور صاحب پاکستان کے دورے پر تشریف لا رہے تھے "ایک عظیم جمہوری ملک" کے جمہوری صدر کی آمد پر جمہوریت پسندوں کو نظر بند کیا جا رہا تھا۔ اس موقع پر مجھے جاپان کے جمہوریت پسند بیدار اور مضبوط عوام پر رشک آتا تھا کہ انہوں نے مہمانِ موصوف کے طیارے کو اپنی مقدس فضاؤں میں داخل ہونے سے پہلے رخ پھیرنے پر مجبور کر دیا۔ بہرحال صدر موصوف گھوم گھام کر اشیر باد کہتے ہوئے سدھارے اور خدا خدا کرکے ہماری جان چھوٹی۔ مگر سسرال سے بھی بڑی الفت و محبت تھی کہ مجھے پھر بلا بیٹھے اور اس دفعہ مجھے پی۔ آئی۔ اے سے بھی نکال باہر کیا۔ اب کی بار کافی عرصہ انہوں نے مجھے حوالات میں رکھا اور جو چاہا کیا۔ اور برتاؤ سیاسی قیدیوں کی طرح نہیں بلکہ CRIMINAL کی طرح کیا گیا آخر تنگ کرکے اور تنگ آ کر مجھے جیل بھیج دیا گیا جہاں سے ۱۹۶۱ء میں رہا کیا لیکن اس رہائی کے بائیس دن بعد مجھے پھر نہ جانے کیوں گرفتار کر لیا گیا۔ بہرحال اس رہائی سے اتنا موقع ضرور ملا کہ یار و احباب سے مل جل لیا۔ پی۔ آئی۔ اے کے مزدوروں نے وائی ایم۔ سی۔ اے میں دعوت استقبالیہ دی کہ جس محبت اور جانثاری کا مظاہرہ کیا وہ میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ دراصل یہی وہ پیار اور چاہت ہی جو میرے جذبۂ عمل کو متحرک رکھتا ہے ——

طفیل صاحب کے ان جملوں میں ایک عجیب آہنگ و زور تھا ایک نرالا زور و ولولہ تھا بالکل ایسے جیسے انہیں یقین کامل ہو کہ فتح ان ہی کی ہوگی۔ بہرحال مجھے مارشل لا کے اس دور میں قید و بند کی شدید ترین صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ اس سے مجھے بڑا فائدہ ہوا۔ سکون کے ساتھ بہت کچھ سوچنے اور سمجھنے کا وقت و موقع ملا اور وہ تضادات اپنی پوری شدت کے ساتھ ابھرے جن کے سبب سرمایہ داری اور سامراجی نظام کا تحفظ، دار و رسن کے ذریعہ کیا جاتا ہے ساتھ ہی ساتھ ان تنظیمی نقائص کا علم ہوا جن کی وجہ سے پسماندہ طبقہ اپنے حقوق حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ مارچ ۱۹۶۲ء میں مجھے رہا کیا گیا پی۔ آئی۔ اے کی مضبوط مستحکم یونین کی کوششوں

کی بنا پر مجھے دوبارہ ملازمت پر لے لیا گیا بہرحال حالات کے ان تھپیڑوں نے مجھے سمجھایا کہ محنت بیچنے کے بعد بھی مزدور کو کچھ نہیں ملتا۔ میں نے مزدور طبقے پر حکومت اور صنعت کاروں کی عائد کردہ بندشیں اور پابندیاں دیکھیں اور ان بندشوں کے باوجود مزدوروں میں پیدا ہوتے ہوئے شعور کی لہریں دیکھیں ماں کی بیماری اور پریشان حالی میں موت نے میرے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا —— اور وہ اس معاشرہ سے بغاوت کر بیٹھا جس کی کوکھ بانجھ ہو چکی ہے جس میں یا میری طرح کا کوئی اور عام شخص کبھی بھی خوشحالی، سکون اور مسرت سے ہمکنار



۱۵ر نومبر ۱۹۵۶ء کو جیل سے رہائی کے بعد یونین کی طرف سے طفیل عباس صاحب اور ادیب احمد خان کا شاندار استقبال کیا گیا

نہیں ہو سکتا بات معاشرے کی خامیوں اور مزدوروں کے شعور کی چل نکلی تھی لہٰذا ہم نے اس موقعہ پر ایک بڑا نازک سا سوال کر ڈالا۔

" آپ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ کمیونسٹ ہیں پھر بھی ہر بار جیل سے واپس آنے پر آپ کو پی۔ آئی۔ اے میں واپس رکھ لیا جاتا ہے۔ کیا آپ اس کی وضاحت کریں؟"

" پہلی بات تو میں بتا دوں کہ مجھے رکھا نہیں جاتا بلکہ رکھنا پڑتا ہے دوسری بات یہ بالکل صاف ہے کہ میں ایسے معاشرہ کا قائل نہیں جہیں معاشی مساوات موجود نہ ہو" انہوں نے بڑے یقین اور اعتماد کے ساتھ جواب دیا کہ " میں نے تعلیم کے بعد مطالعہ جاری رکھا اور مختلف معاشی نظاموں کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔ میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ جب تک ملک میں ایک ایسا نظام نہیں ہوگا جس میں ہر شخص کو پیٹ بھرنے اور آگے بڑھنے کے یکساں مواقع حاصل ہوں اس وقت تک ملک کے اسّی یا نوّے فیصد انسانوں کے مسائل حل نہ ہوں گے اب اسی ملک کو لیجئے یہاں سرمایہ داروں کو منافع خوری اور مزدور کشی کی کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے ذرا ذرا سی مطالبات کیلئے ہمیں مدتوں لڑنا پڑتا ہے۔ جیلیں کاٹنا پڑتی ہیں مجھے بھی پانچ چھ دفعہ پکڑا گیا ہے ویسے یہ بات واقعی بڑی مشکل ہے کہ ایک شخص اتنی دفعہ گرفتار ہونے کے بعد بھی پھر اسی ادارے میں واپس آجائے جہاں وہ انتظامیہ سے لڑتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ پی آئی اے کی انتظامیہ نے ہماری قربانیاں دیکھیں اس نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ہم غلط اور بیجا مطالبات نہیں رکھتے بلکہ ہمارا نکتہ نظر اور لائحہ عمل سٹیٹ قوم پرستانہ اور پاکستانی ہے ہماری جد وجہد مثبت خطوط پر تھی ہے اور رہے گی ہمارے ساتھ ہر روز نئے لوگ تحریک میں آتے ہیں انہوں نے اپنے ساتھیوں کی قربانیاں اور ایثار دیکھا اور خود اپنے لئے بھی یہ راہ متعین کر لی ان کا شعور ہماری تحریک اور طریق کار کے مطابق نکھرا ہماری یونین اور تقریباً ہر ادارے میں یونین ٹکراؤ کا سبب افسروں کی کم فہمی اور عدم تعاون بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے یہاں بھی یہ چیزیں تجربے میں آئی ہیں۔ ہم نے لڑ کر ہی بات منوائی ہے اگر شبہ کرنے والے درست ہیں تو "خطرناک" لوگوں کی موجودگی میں پی آئی اے کیسے ترقی کر سکتی تھی؟

اور خود ہماری یونین بھی غیر معمولی طور پر مضبوط مالدار اور جیالی یونین ہے آج یہ یونین نظریاتی اور تنظیمی اعتبار سے پورے ملک میں ایک اہم تحریک کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وہ ٹھوس وجوہات ہیں کہ میں پی آئی اے میں ملازم ہوں اور ابھی حال ہی میں ہم نے اپنے بہت سے اہم مطالبات تسلیم کروائے ہیں۔

" یہ تو پی آئی اے کے حالات ہوئے آپ کا خیال کراچی کی مزدور تحریک کے بارے میں کیا ہے۔؟"

" کراچی کیا بلکہ پورے پاکستان میں صنعتی مزدوروں کا حال یکساں ہی ہے ملک غریب تھا اور یہ سرمایہ داروں کے لئے ایک اچھی منڈی ثابت ہوا۔ حکومت اور سرمایہ داروں نے مل کر نئی نئی قائم شدہ صنعتوں کے مزدوروں کو خوب لوٹا اور کچلا کیونکہ اس مزدور طبقہ کو پورا شعور اور تجربہ نہیں ہے۔ تنخواہیں کم سے کم ہیں اور صنعتی ترقی کے باوجود مزدوروں کی حالت



انصاف۔ امن۔ اور آزادی کے موضوع پر پی۔ آئی۔ اے کے محنت کشوں سے مخاطب ہیں

خراب ہے یہاں تو مزدور تحریک کو صحت مند انداز میں ابھرنے ہی نہیں دیا گیا صحیح مزدوروں کو کام کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ لیبر ڈیپارٹمنٹ سروں پر مسلط رہا ہے اور بیشتر مزدور رہنما ذاتی مفادات اور لیبر ڈیپارٹمنٹ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے انتظامی مشینری کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے ہیں ایماندار اور باشعور کارکنوں نے ان حالات میں بھی جنگ لڑی ہے مگر اس کا صلہ یہ ملا کہ ان کو بے دردی سے مارا گیا انہیں قید کیا گیا اور تحریک سے ہٹانے کی پوری پوری کوشش کی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف سے مار پڑنے پر مزدور کارکن بددل ہو کر میدان سے ہٹتے گئے بعض بڑے نڈر اور ترقی پسند کارکنوں کا بھی یہی حال تھا کہ وہ تنگ آ کر تحریک کو چھوڑ دیتے تھے اور خاموش بیٹھ جاتے تھے حکومت اور سرمایہ داروں کا یہ کھیل ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت جاری رہا۔ انہوں نے ان کارکنوں کی بہت ہمت افزائی کی جنہیں وہ خرید سکتے تھے۔ اس طرح یا تو مزدور طبقہ کی اصلی تنظیمیں قائم نہ ہو پاتی تھیں یا اگر ہو جاتیں تو انہیں متوازی اور پاکٹ یونینوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ یہ ساری صورت حال ابھی تک قائم اور جاری ہے تنظیم سازی اور ہڑتال پر پابندی ہے۔ تحریک میں مفاد پرست عناصر کو داخل کیا جا رہا ہے۔ اس وقت ضروری ہے کہ مخلص اور جیالے کارکن آگے بڑھیں اور گندے عناصر سے تحریک کو پاک کر کے خود اس کی باگ ڈور سنبھال لیں یہ صحیح ہے کہ اس عرصہ میں نئے کارکن ابھرے ہیں جو باشعور بھی اور باہمت بھی، جب تک پورے ملک میں تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایماندار باشعور ذہین اور حوصلہ مند مزدور کارکن میدان میں نہیں آئیں گے ہماری مزدور تحریک صحیح سلامت میں ترقی نہیں کر سکے گی بجائے نعرہ بازی کے ٹھوس بنیادوں پر کام کیا جائے۔ تماشا تو یہ ہے کہ اب تک صاحب اختیار لوگوں نے مزدوروں کے مسائل سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے۔

" یہ فرمائیے،" ہم نے ان سے وضاحت چاہی کہ آپ باشعور رہنما چاہتے ہیں۔ مگر ہمارے " عام رہنما" اور مزدور کسان کو سیاست سے دور ہی رکھتے ہیں؟"

" دراصل بات یہ ہے کہ حکومت کی باگیں سامراجی طاقتوں کے زیر اثر جاگیر دار اور... سرمایہ دار طبقوں کے ہاتھوں میں رہی ہے ان کے اپنے مفادات ہیں اپنی سیاست ہے اور وہ اپنا ہی نکتہ نظر بنانا چاہتے ہیں۔ آخر وہ کس طرح برداشت کر سکتے ہیں کہ مزدوروں اور کسانوں میں شعور پیدا ہو اور وہ اپنا حق حاصل کرنے کیلئے ایوان حکومت تک جا پہنچیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مزدور طبقہ کی اپنی ایک سیاست ہے اس سیاست کو سمجھنے والے رہنما پیدا ہونے ضروری ہیں جنہیں اپنے حالات کا شعور ہو اور جو ان حالات میں ڈھنگ اور سلیقہ سے اپنا راستہ بنا لیں، ایسے لوگ اسی وقت حکومت میں پہنچ سکیں گے جب وقت مزدور اور کسان ملکی سیاست میں حصہ لیں اور واضح اکثریت میں اپنے نمائندے منتخب کریں۔ اور بذات خود بھی منتخب

ہوں —

عوامی جمہوریہ چین حالانکہ پاکستان کے بعد آزاد ہوا ہے اور آزادی کے بعد اسے جنگوں میں براہ راست حصہ بھی لینا پڑا لیکن اسکے باوجود اس نے پاکستان سے زیادہ ترقی کی ہے آپکے نزدیک اس کی کیا وجہ ہے؟"

چین کی جنگ آزادی میں طبقاتی شعور کا دخل تھا وہاں قیادت کا سہرا ترقی پسندوں کے سر تھا ہمارے ترقی پسند بددل ہوگئے تھے اس لئے وہ رہنمائی کے فرائض انجام نہ دے سکے ویسے بھی ۱۹۴۶ء نیوی کی ہڑتال کے بعد ترقی پسند بددل ہوگئے یہاں کی جنگ آزادی میں طبقاتی شعور اور ترقی پسند طاقتوں کو پوری طرح نکھرنے، بیدار ہونے اور ابھرنے کا وقت اور موقع ہی نہ ملا اور ادہر مفاد پرست طاقتوں نے اپنا مقصد حاصل کرنے کیلئے اتنے زیادہ مسائل پیدا کردیئے کہ آئندہ بھی مدتوں تک یہاں کے عوام سوچنے اور سمجھنے کے قابل نہ ہوسکیں لہذا یہاں واضح طور پر معاشی منصوبہ بندی نہیں ہے جس کی وجہ سے صلاحیتوں کو بھرپور طریقے سے استعمال کرنے کا کوئی موقع نہ ملا اور عوام کا جوش و خروش ختم ہوکر رہ گیا وہ مرجھا کر رہ گئے۔ ذہین اور باصلاحیت لوگوں نے خود اپنا ذاتی مفاد عزیز رکھا چاندی سونے کی چمک دمک دیکھ کر اس لوٹ کھسوٹ کے نظام میں فٹ ہوکر رہ گئے مگر چین میں باقاعدہ معاشی استحکام اور ترقی کے منصوبے بنے جن میں عوام کو اپنے جوہر دکھانے اور کارہائے نمایاں انجام دینے کے پورے پورے مواقع ملے جس کا عملی اظہار آپ کے سامنے ہے۔ ہمارے یہاں سامراجی باقیات میں کشمیر جیسا مسئلہ موجود ہے جو حل ہونے ہی میں نہیں آتا اور دونوں ملکوں کے عوام میں فرقہ وارانہ بنیادوں پر نفرت کا جذبہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ اور وہ لڑنے کے موڈ میں ہیں، مغرب کی بڑی طاقتیں نہیں چاہتیں کہ ہم اصل مسائل پر توجہ دے کران کے.. سائنٹفک حل تلاش کریں متحد ہوں اور نمایاں طریقے سے آگے بڑھیں۔

سامراجیوں کا جو آپ نے ذکر کیا ہے وہ بڑا اہم اور غور طلب ہے لگے ہاتھوں ملک کی خارجہ پالیسی کے سلسلے میں آپ اپنے خیالات کا اظہار کردیں تو بہتر ہوگا۔

خارجہ پالیسی کا مسئلہ بڑا عجیب ہے مغربی دوستی کی حقیقت ہمیں اپنے دور غلامی میں معلوم ہوہی چکی ہے لہذا

" آزمودہ را آزمودن جہل است "

کے مطابق دولت مشترکہ فوجی معاہدے اور مغربی امداد کی وکالت کرنے والی خارجہ پالیسی میرے اپنے نزدیک حماقت اور منافقت کے سوا اور کچھ نہیں اب رہ گئی" آزاد"خارجہ پالیسی کا مسئلہ اس کے حق میں لوگ عام طور پر بات کرتے ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ محض آزاد خارجہ پالیسی سے ہم آخر سوائے دوغلے پن کے کیا کرلیں گے ہمارا اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ سامراجی ملکوں کے چنگل سے خود کو ذہنی اور سیاسی کے ساتھ ساتھ اقتصادی طور پر بھی آزاد کرالیں لہذا ہم کو لازمی طور پر کھل کر سامراج دشمن خارجہ پالیسی اختیار کرنی ہوگی۔

آپ کے مزدور ملک کے موجودہ سیاسی مسائل کا حتمی حل کیا ہے؟"

جب تک محنت کش عوام ذرائع پیداوار کو بذات خود اپنے ہاتھوں میں نہیں لے لیں گے اس وقت تک ملک میں بالائی سیاسی ڈھانچہ یہی رہے گا اور بےچینی ختم نہیں ہوگی۔

آپ کے خیال میں کوئی سیاسی رہنما اس وقت یہ مقصد حاصل کرنے کیلئے کام کر رہا ہے؟

جی ہاں میرے خیال سے مولانا بھاشانی جیسے نڈر سچے، دیندار اور مخلص رہنما ابھی زندہ اور سرگرم عمل نہیں جن کو کوئی طاقت کسی بھی قیمت پر خرید نہیں سکتی۔

گفتگو اس مرحلے پر وہ مداخلت بیجا شروع ہوگئی جو انٹرویو جیسے کسی موقعوں پر ایک رسم سی بن چکی ہے۔ تواضع شروع ہوئی بات چیت کا سلسلہ ٹوٹا مگر سمجھنے اور سمجھانے والی باتیں تو ہر حال میں کہہ اور سن لی جاتی ہیں۔ طفیل صاحب کی بچی ہما عباس آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئی۔ اور شوکیس میں سے کھلونے نکال کر کھیلنے لگی بات نکلنی تھی سو نکلی ہم نے ان سے نہ پوچھا کہ آپ کے ڈرائنگ روم کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ ایک مزدور کارکن کا گھر ہے اگر آپ سے آپ کی آمدنی اور اخراجات کے متعلق دریافت کیا جائے تو آپ بُرا تو نہ مانیں گے؟

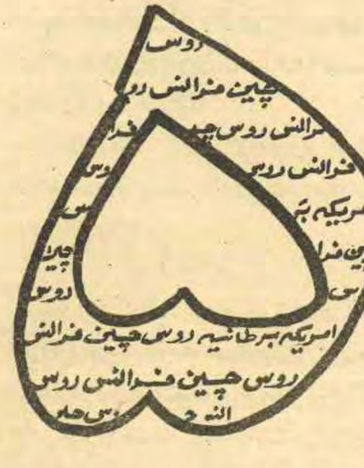
نہیں بھائی آخر اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ جب بھی کہیں میری منگنی کی نوبت آتی تھی تب ہی میں عین موقع پر گرفتار کرلیا جاتا تھا۔ اور بات ختم ہوجاتی تھی اس دفعہ میرے گھر والوں نے باندھ بوندھ کر میری شادی کرڈالی اس موقع پر میرے تمام عام وخاص نئے اور پرانے ساتھیوں نے مجھے مختلف تحفے دیئے جو اس ڈرائنگ روم کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کھلونوں کیطرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ اسکو سالگرہ میں ملے تھے اور بیچ میں رکھی ہوئی میز کے متعلق انہوں نے بتایا کہ صرف یہ میز میری بیوی کی خریدی ہوئی ہے ...... ویسے میں بذات خود اس بات پر بالکل صاف ہوں کہ اگر کسی وقت تحریک کو ضرورت پڑی تو میں یہ سب سامان نیلام کردوں گا کیونکہ اگر سچ پوچھا جائے تو یہ سب کچھ تحریک کے صلے میں ملا ہے جہاں تک میری آمدنی کا تعلق ہے میں بتادوں کہ میری اہلیہ خود بھی ایک مقامی کالج میں لیکچرار ہیں۔ اب رہ گیا اخراجات کا مسئلہ تو بھائی ہم تو مست قلندر آدمی ہیں جو آتا ہے چلا جاتا ہے۔ کہیں کہیں تو ادھار کی نوبت آجاتی

ہم اپنے سوال اور طفیل صاحب کے دوٹوک جواب سے کچھ شرمندہ سے تھے اس لئے تھوڑی دیر خاموشی سی رہی چائے کے بعد گفتگو آگے بڑھی اور ہم نے پوچھا کہ آپ کو یقین کہ فلاحی مملکت کا تصور آپ کی اپنی زندگی میں پورا ہوجائے گا۔

زندگی میں نہ سہی — زندگی کے بعد تو ہوگا طفیل صاحب نے بے نیازی کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا۔ کام تو یارو - اسی لئے کیا جاتا ہے کہ وہ پورا ہو۔ اگر موت کے بعد بھی مقصد حاصل ہوجائے تو اس طرح مقصد کی اہمیت اور صداقت تو کسی طرح کم نہیں ہوتی یہ ضرور ہے کہ خواہش یہی ہوتی ہے کہ جتنی جلد ممکن ہوسکے کامیاب ہوجائیں میں تو جولیس فیوچک کے اس قول پر یقین - اور ایمان رکھتا ہوں جو اس نے اپنی شہادت سے پہلے جیل کی کوٹھری میں خون آلود انگلیوں سے لکھا تھا۔

" مجھے معلوم ہے کہ کل میں مارا جاؤں گا مگر مجھے خوشی ہے کہ آنے والے دور کی مسرتوں میں میری اپنی قربانی بھی شامل ہوگی "

صحرا بہ صحرا کو بہ کو



عظیم طاقتیں

عظیم انقلاب

برطانیہ اور صنعتی انقلاب

برطانیہ عظمیٰ کو تو صرف برطانیہ ہی کہنا چاہیئے کیونکہ اسکی روایتی عظمت اب خاک میں مل چکی ہے۔ یہ ملک جو کبھی حقیقتاً آج کی تمام سامراجی قوتوں سے زیادہ قوی بلکہ خود انکا آقا اور محافظ و نگہبان تھا۔ اب امریکہ کی فوجی چھاؤنی کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اس مضبوط ترین برطانوی معیشت کی اسٹرلنگ کرنسی آئے دن بحرانوں سے دو چار ہوتی رہتی ہے اس کی سلطنت کا آفتاب غروب ہو چکا ہے۔

حالانکہ امریکی نوآبادی کے نکل جانے کے باوجود برطانیہ ایک سامراجی قوت کی حیثیت سے برقرار رہا تھا۔ صنعتی انقلاب جسنے اس کی زندگی بدل ڈالی تھی۔ اس کے لیئے کثیر دولت لایا اور اس نے فرانس کے نپولین اور دوسری سامراجی قوتوں سے نوآبادیات کے حصول کے لئے برطانیہ میں ممکن ترین قوت و توانائی پیدا کی جس کے بل بوتے پر وہ اس زور آزمائی میں سرخرو ہوا۔

سترھویں صدی میں اشیائے صرف کی پیداوار اور فروخت پر گلڈ سسٹم کی جو لامحدود گرفت تھی وہ اس



گرگ باراں دیدہ —— چرچل

انقلاب نے توڑ ڈالی، ضرورت، ایجاد کی ماں ہے۔ جب ماؤں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو اولاد کی تعداد میں اضافہ ہونا یقینی تھا۔ بازار میں مانگ بڑھی تو ٹیکسٹائل اور دوسری صنعتی اشیاء کی زیادہ پیداوار کی خاطر یا تو مزدوروں

میں اضافہ کرنا ضروری تھا یا اوزاروں میں۔ نفع خوروں کے نزدیک اوزاروں میں اضافہ اور ترقی کرنا زیادہ آسان اور نفع بخش تھا۔ لہٰذا "لوکوموٹو"۔ اسپننگ جینی، فلائنگ شٹر، کاٹن گن، "اسٹیم انجن"، کی سرپرستی کی گئی۔ اور صنعتی اشیاء دھڑادھڑ پیدا ہونی شروع ہوئیں۔ نتیجتاً یہ چیزیں سستی پڑیں۔ تو طلب بھی بڑھ گئی۔ پھر پیداوار بڑھی۔ تو مشینوں کے تناسب سے تھوڑے بہت مزدور بڑھے اور ان کی قوت خرید بڑھی اور اس مستقل تسلسل نے پیداواری عمل میں معجزانہ تیزی پیدا کر ڈالی۔ مرکزی اور کلیدی صنعتوں کے ساتھ ساتھ ذیلی صنعتیں بھی قائم ہوئیں کپاس کی کاشت بڑھائی گئی کوئلہ اور لوہے کی تلاش شروع ہوئی ذرائع آمدورفت بڑھانے کے لیئے سڑکیں، ریلیں اور نہریں بنائی گئیں۔ انجن اور اسٹیمر بن گئے۔ ٹیلیفون ٹیلیگراف اور بجلی نے رفتار تیز سے تیز تر کر دی لہٰذا مال کی افراط ہو گئی تو بازار بھی سکڑ گیا اب بیرونی منڈی کی تلاش شروع ہوئی اور بحری جہازوں کے بادبان کھول دیئے گئے۔ اور اس طرح سرمایہ داری سامراجیت میں تبدیل ہو گئی۔ مگر ہمیں ابھی ان حالات و وقعات کا ذرا تفصیلی مطالعہ کرنا پڑے گا۔ اس انقلاب کی، دولت دستی صنعت مشینی صنعت میں تبدیل ہو گئی تو کارخانوں، بندرگاہوں اور دکانوں کے آس پاس شہر ابھر آئے تھے۔ یہ انقلاب، انگلستان کو اپنی برکتوں سے نوازکر امریکہ اور دوسرے یورپی ملکوں میں پھیل گیا۔ جیسے جیسے معیشت تبدیل ہوئی ویسے ویسے

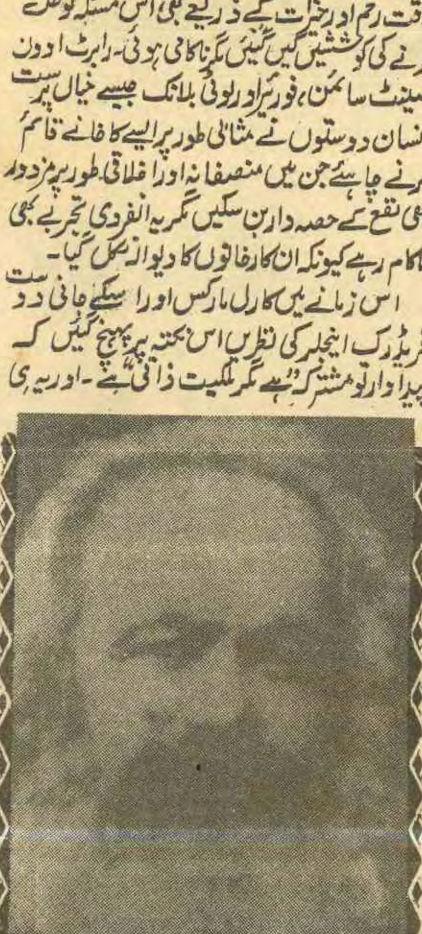
مذہب اور فکر و فلسفہ، معاشرت، سیاست اور تہذیب و ثقافت بھی بدلتی چلی گئی۔ اسٹورٹ خاندان کی ننگی بادشاہت کا خاتمہ ہوا جاگیرداری ختم ہوئی، تعلیم عام ہوئی، رواداری اور روشن خیالی نے پارلیمانی جمہوریت کے نظام کو توانائی اور مضبوطی عطا کی اور تاج کے تمام انتظامی و سیاسی حقوق رفتہ رفتہ عوام کو منتقل ہو گئے۔ پرانی قدریں ملیا میٹ ہو گئیں اور ایک بالکل نئی دنیا وجود میں آئی جس میں متوسط طبقہ کا ستارہ خوب خوب چمکا۔ اس طبقہ نے کارخانوں کے قیام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اسے جب اپنے مقصد کے لئے روپیہ کی ضرورت پڑی تو اس نے بینکوں کے ذریعے، سود کا لالچ دے کر ساری جنتا سے روپیہ جمع کر لیا! ور صنعت میں لگا دیا۔ ان بینکوں اور کارخانے داروں نے جب پوری مالیات پر قبضہ کر لیا تو محنت کشوں کی مجبوری اور بھوک سے فائدہ اٹھا کر انھیں بدترین شرائط پر ملازم رکھا۔ ان سے کم سے کم اجرت پر، زیادہ سے زیادہ وقت میں زیادہ سے زیادہ کام لیا۔ ان کی تیار کردہ اشیاء کو منہ بولے داموں پر بیچا اور اس طرح منافع کما کر "روپیہ کو" "سرمایہ" میں بدل ڈالا۔ اسی سرمایہ نے جب برطانوی عوام کا خون چوس ڈالا تو مزدوروں نے تنگ آ کر مشینوں کو غرق آب کرنا شروع کر دیا تھا۔ بدترین حالات کار اور روح فرسا ایام زندگی بھی اسی انقلاب کی لعنتیں تھیں۔ ایک کثیر فوج، روزگار کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی زندگی کی روز افزوں پیچیدگیوں اور مصیبتوں کے باعث صرف مزدوروں ہی میں نہیں بلکہ پرانی تہذیب کے حامی تمام لوگوں میں بھی بے صبری جھنجھلاہٹ اور نفرت بڑھتی جا رہی تھی جو بڑھ کر امن عامہ کے لئے خطرہ بن سکتی تھی۔ اس خطرناک زور و توانائی کا مخصوص طبقاتی راہوں کے ذریعے کہیں کہیں اظہار بھی ہو رہا تھا! سکا رخ بدیس کی طرف نہ پھیر دیا جاتا تو خود دیس میں ہی کوئی نہ کوئی شورش پھوٹ پڑتی۔

اس بات کو برطانوی نوآبادیاتی محکمہ کے سیاست دانوں میں سے ایک سیسل روڈس نے اور زیادہ واضح انداز میں کہا تھا۔

"کل میں لندن کے مشرقی حصے میں واقع مزدوروں کے محلے میں گیا تھا اور بے روزگاروں کے ایک جلسے میں شریک ہوا۔ وہاں میں نے وہ جنونی اور وحشیانہ تقریریں سنیں جو روٹی روٹی کی پکار کے سوائے اور کچھ نہ تھیں گھر لوٹتے وقت میں نے جب اس منظر پہ غور و فکر کیا تو میں "سامراجیت" کا پہلے سے بھی زیادہ قائل ہو گیا۔ سماجی مسئلہ کا حل میرا چہیتا اور عزیز موضوع ہے۔ سلطنت برطانیہ کے چار کروڑ باشندوں کو خون ریز خانہ جنگی سے بچانے کی خاطر ہم لوگوں کو چاہئے کہ اپنی فالتو آبادی کو بسانے کے لئے اور کارخانوں میں تیار شدہ اشیاء کھپانے کی خاطر نئی منڈیاں بہم پہنچانے کی غرض سے نئے علاقے ہتھیا لیں جیسا کہ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ سلطنت برطانیہ کے لئے اب "دال روٹی" کا سوال ہے اور اس سوال کے جواب میں اگر ہمیں خانہ جنگی سے اپنے آپ کو بچانا ہے تو "سامراجی" ہونا ہی پڑے گا

برطانیہ کے مذکورہ سماجی اور معاشی مسائل کے حل کے لئے۔ برطانیہ کے مزدوروں کو مطمئن کرنا ضروری تھا۔ خواہ وہ کسی بھی طرح سے کیا جائے۔ جس وقت نظریاتی، سیاسی اور فکری بنیادوں پر سامراجیت کے راستے کو منتخب کرنے کی تلقین کی جا رہی تھی۔ اسی وقت رحم اور خیرات کے ذریعے بھی اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوششیں کی گئیں مگر ناکامی ہوئی۔ رابرٹ اوون سینٹ سائمن، فوریئر اور لوئی بلانک جیسے خیال پرست انسان دوستوں نے مثالی طور پر ایسے کارخانے قائم کرنے چاہئے جن میں منصفانہ اور اخلاقی طور پر مزدور بھی نفع کے حصہ دار بن سکیں مگر یہ انفرادی تجربے بھی ناکام رہے کیونکہ ان کارخانوں کا دیوالہ نکل گیا۔

اس زمانے میں کارل مارکس اور اس کے ساتھی فریڈرک انیجلز کی نظریں اس نکتہ پر پہنچ گئیں کہ پیداوار تو مشترکہ ہے مگر ملکیت ذاتی ہے۔ اور یہی



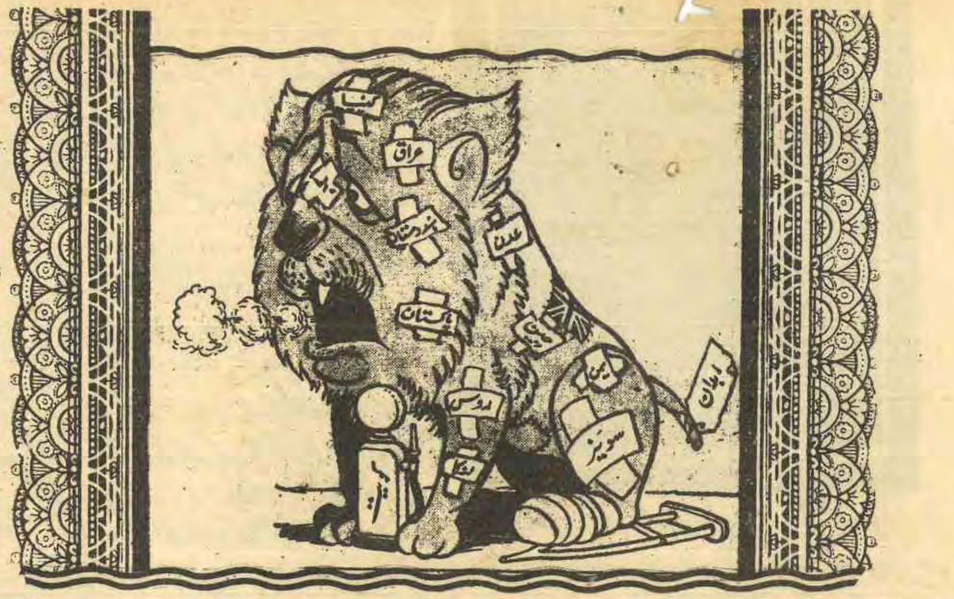
"مشترکہ پیداوار اور مشترکہ ملکیت" کارل مارکس

تضاد شیطانیت کی جڑ تھا۔ لہٰذا اس جڑ کو اکھاڑ ڈالنے کے لئے ان دونوں انقلابیوں نے "مشترکہ پیداوار مشترکہ ملکیت" کا نعرہ بلند کیا۔ ذرائع پیداوار کو فرد کے ہاتھ سے چھین کر سب کے ہاتھ میں دینے کی تعلیم دی۔ لوٹنے اور لٹنے والوں کی طبقاتی کشمکش کا جائزہ لے کر لٹیرے طبقے کے دائمی خاتمہ کی پیشنگوئی کی۔ اس نظر اس تعلیم اور اس پیشنگوئی کی مزید وضاحت و تفصیلات ہی کا نام "مارکسزم" ہے"

مزدور طبقہ کی تنظیم اور تعلیم کے زبردست فقدان کی وجہ سے برطانیہ نے "مارکسی" راستے کے بجائے "سامراجی" راستہ اختیار کر لیا۔

برطانیہ کے تجارتی جہازوں میں اشیاء صرف کے علاوہ گولا بارود بھی رکھا گیا۔ ان جہازوں نے افریقہ اور ایشیا کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ نئے نئے علاقے دریافت کر کے ان کی منڈیوں پر قبضہ جما لیا گیا۔ اور اپنی نوآبادیاں قائم کر دی گئیں۔ پہلی جنگ عالمگیر کے وقت تک یعنی ۱۹۱۴ء میں تین لاکھ مربع کیلومیٹر اور چار سو پینسٹھ لاکھ باشندوں کا یہ حقیر اور دور افتادہ جزیرہ ــ اس وسیع و عریض کائنات میں تین سو پینتیس لاکھ مربع کیلومیٹر کے رقبے اور تین ہزار نو سو پینتیس لاکھ باشندوں کی کثیر و کشادہ آبادی کا بلا شرکت غیرے مالک و آقا بن بیٹھا تھا اور اس ملک کے حکمرانوں کے ہاتھوں میں گو پارلیمانی جمہوریت، مساوات، عدالتی قوانین، انسان دوست ادب، جدید سائنس اور ترقی پسند فلسفہ کی مقدس و متبرک دستاویزات تھیں مگر ان کی انگلیاں خود اپنے ہی ہم وطنوں کے خون سے لہولہان تھیں۔ ان کی زبانیں ہم غلاموں کے گوشت کا مزہ چکھ رہی تھیں اور ان کی ملکہ و شاہوں کے تاجوں میں، ہم محکوموں کی سرزمینوں کے کوہ نور جگمگا رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس سامراج کی یہ حیثیت دائمی نہ تھی ادھر "مال غنیمت" میں اپنے حصہ کی طلب گار دوسری سامراجی قوتوں نے اسے للکارا ادھر محکوم و نیم محکوم ممالک کے انسانوں نے اسے دھتکارا اور اس طرح دو طرفہ حملوں نے اسکا سارا کس بل نکال کر رکھ دیا۔ دو عالمی جنگوں نے اس سے اس کی عظمت چھین لی مگر برطانوی شاطروں نے جلد ہی بھانپ لیا کہ نوآبادیات پر براہ راست قبضہ جمائے رکھنا اب آسان نہیں ہے لہٰذا انہوں نے ایک اور چال چلی اور وہ یہ کہ "تاج برطانیہ" کی سیاسی ساکھ کو اگر نقصان پہنچتا ہے تو پہنچ جائے مگر شاہی خزانہ کے ذخیرے اور مفادات کم سے کم مجروح ہوں۔ اسی لئے اس ملک کے جہاندیدہ حکمرانوں نے رفتہ رفتہ ایک کے بعد دوسری نوآبادی کو بدقت تمام آزاد کرنا شروع کر دیا مگر اقتدار انھیں سونپا جو اسکے اپنے جانے پہچانے لوگ تھے۔ جنھیں انھوں نے اپنی لوٹ کے زمانے میں پالا پوسا تھا۔ اور جو انھیں کے سکھائے، پڑھائے انھیں



کی زبان بولنے والے اور انہیں کی طرح سوچنے والے تھے۔!

مگر یہ سب کچھ بھی انہوں نے برضا و رغبت نہیں کیا۔ جلیانوالہ باغ اور کانپور کے قتل و غارتگری کے تاریخی واقعات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس تشدد اور لوٹ کھسوٹ کی کوئی حد نہ تھی جس کا نام ہندوستان میں برطانوی حکومت تھا اور اسی سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دوسری نوآبادیات میں بھی برطانوی لیڈروں نے کیا کچھ نہ کیا ہوگا لیکن قوم پرست تحریکوں کو کسی بھی شاطرانہ اور جابرانہ طریقے سے دبانا اب ان پرانے مداریوں اور ڈائیروں کے بس سے باہر ہو چکا ہے

یہ بوڑھا سامراج، امریکہ کے کاندھوں پر سوار ہو کر دنیا کو یہ دھوکا دے رہا ہے کہ اسکا قد و قامت اب بھی وہی ہے۔ لیکن ملایشیا، عدن، یمن لنکا، ہانگ کانگ اور بین الاقوامی تجارتی منڈیوں میں ہم اسکے ہانپنے کی آوازیں سن رہے ہیں۔ اس کے دن پورے ہو چکے ہیں اس کے لئے صرف ایک ہی چارہ کار ہے کہ اپنے ملک کے معاشی نظام میں "مشترکہ پیداوار و مشترکہ ملکیت" کی خاطر بنیادی اور انقلابی تبدیلیاں کرے۔ بصورت دیگر ایک ایسے سنگین بحران سے دوچار ہونا پڑے گا جو اس بوسیدہ نظام کی بنیادیں اکھاڑ کر پھینک دیگا

امریکہ اور جنگ آزادی

پہلی اور دوسری عظیم جنگیں یوں تو دنیا بھر کیلئے تباہی اور بربادی کا پیغام لیکر آئی تھیں لیکن امریکہ کو ان جنگوں نے بے شمار زر و جواہر بخشے اور یہ صورت حال ابھر کر آئی کہ ایک وقت کی یہ برطانوی نوآبادی اب بذات خود، برطانیہ، فرانس اور دوسرے مغربی ممالک کی پرانی اور نئی نوآبادیوں پر قابض ہو گئی اور یہ سارے ممالک، امریکہ کے مقروض اور دم چھلہ بن کر رہ گئے۔ امریکیوں کا ابتداً تو یہ کہنا تھا کہ ہم اپنے فوجیوں، اپنے ساہوکاروں اور اپنے تیل کے راجاؤں کے ذریعے، لاطینی امریکہ کے چھوٹے ممالک میں اپنا آئرلینڈ، اپنا مصر اور اپنا ہندوستان تعمیر کر رہے ہیں۔ لیکن اب یہی امریکی بحر اوقیانوس کے اس پار بھی آ دھمکے، اور کیوں نہ آتے کہ ان کے منہ کو خون لگ گیا ہے۔ امریکہ کے اعلان آزادی میں کہا گیا تھا کہ

"جب انسانی تاریخ میں ایسا وقت آتا ہے کہ ایک قوم ان تمام سیاسی بندشوں کو توڑ دے جو اسے دوسری قوم کا پابند کر دیتی ہیں اور اپنا ایک علیحدہ اور مساوی وجود قائم کرے جس کا حق اسے قوانین فطرت اور خالق کائنات نے عطا کیا ہے تو رائے عامہ کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان اسباب کا اعلان کرنا ضروری ہو جاتا ہے جن کی بنا پر وہ قوم علیحدگی اختیار کرنا چاہتی ہے ———!"

لیکن آج، امریکہ دوسری قوموں کو وہ حق نہیں دنیا چاہتا جو اس نے اپنی جدوجہد آزادی میں برطانوی نوآبادکاروں سے بزور چھینا تھا کیونکہ امریکہ اپنی بقا کے لئے یہ لازم سمجھتا ہے کہ وہ بیرونی منڈیوں میں اپنا مال لے جائے نیز دوسرے ممالک میں اپنا سرمایہ لگائے اس طرح ایک طرف تو امریکہ اپنے معاشی نظام کو قائم رکھنے کے لئے دوسرے ممالک پر خونی پنجے گاڑے ہوئے ہے اور دوسری طرف ان ملکوں کا سرمایہ چور دروازوں سے امریکہ پہنچ رہا ہے۔ پسماندہ ممالک امریکی امداد کی برکت سے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے بجائے زیادہ سے زیادہ امریکہ کے دست نگر اور غریب سے غریب تر ہوتے جا رہے ہیں دنیا بھر کے عوام اب یہ سوچنے لگے ہیں کہ آخر امریکہ بھاری صنعتوں کے قیام کے لئے ٹھوس امداد دینے کی بجائے اسلحہ اور اپنا فاضل گندم ہی کیوں دیتا ہے؟ اس سوال کا جواب دراصل یہ ہے کہ جنگوں کے زمانے میں امریکہ نے اپنے زیادہ تر کارخانے اسلحہ خانے کے لئے وقف کر دیئے تھے۔ اور یہ کالا اور جنگی کاروبار اس زمانے میں خوب خوب چمکا لیکن جنگوں کے خاتمے کے بعد ان کارخانوں کی جنگی پیداوار کا کوئی جواز نہ تھا۔ لیکن دوسری طرف یہ مسئلہ تھا کہ اگر یہ کارخانے ختم کر دیئے جائیں تو ملک کی سب سے بڑی صنعت تباہ ہو جائے گی جس سے ایک ایسا بحران پیدا ہوگا جو سینیٹ کے ممبر بڑے بڑے جنگی سرمایہ داروں کو بھی تباہ کر ڈالے گا اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے امریکہ نے ایک نئی حکمت عملی اختیار کی اور وہ یہ کہ پوری دنیا میں مستقلاً ایک ایسی فضا برقرار رکھی جائے کہ اسلحہ کی مانگ کسی طرح کم ہی نہ ہو! نیٹو، سیٹو، سنٹو یہ سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ مختلف فوجی معاہدے ہوں یا فوجی امداد دراصل امریکہ کی اسلحہ ساز فیکٹریوں کو قائم رکھنے کا جواز ہیں۔ ان کارخانوں کے ذریعے امریکی سرمایہ دار کو نفع کمانے سے غرض ہے خواہ دنیا جہنم بن کر ہی کیوں نہ رہ جائے۔

بات صرف یہی نہیں بلکہ امریکہ نے دوسری جنگ عظیم کے بعد پورے ایشیا، افریقہ، اور لاطینی امریکہ میں عوام کی آزادی کا امنڈتا ہوا وہ سیلاب دیکھ لیا تھا جس میں سامراجی ممالک کا ڈوبنا یقینی تھا۔ لیکن امریکہ اس آڑے وقت میں اپنے اتحادیوں کا حلیف بن کر سامنے آیا اس نے تقریباً تمام براعظموں کے ارد گرد فوجی اڈوں کے جال بچھا دیئے جن کا مقصد یہ تھا کہ عوامی تحریکوں کو کچلا جائے اور بین الاقوامی سامراج کے مفادات مجروح نہ ہونے پائیں۔ ابراہیم لنکن نے کہا تھا کہ:-

یہ ایک بڑا پرانا مسئلہ ہے کہ کیا ایک ایسی حکومت جو عوام کی آزادی برقرار

اور محفوظ نہ رکھ سکے۔ بذات خود بھی اتنی مضبوط اور مستحکم ہو گی کہ اور کچھ نہیں تو اپنا ہی وجود قائم و باقی رکھ لے؟"

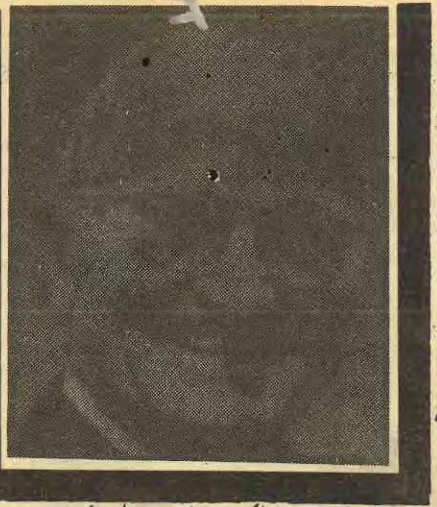


"حکومت عوام کی، عوام کے لئے اور عوام کے ذریعہ"۔ ابراہام لنکن

مگر معلوم نہیں کہ امریکہ کے موجودہ زعماء کے ذہن میں "آزادی" کا کیا تصور ہے۔ کیونکہ ہم جب بھی دیکھتے ہیں کہ امریکہ کو آزادی دشمن رسوائے زمانہ اور عوام کے غیظ و غضب اور عتاب سے خوفزدہ افراد کے ساتھ ہی دیکھتے ہیں وہ خواہ فارموسا کا چیانگ کائی شیک ہو یا ویت نام کا جنرل کھان، کانگو کا شومبے ہو یا ملائیشیا کا تنکو عبدالرحمن اسپین کا فرانکو ہو یا پرتگال کا سالازار، بہرحال اور بہر طور امریکہ کی حفظ و امان میں ہے اور اس کے برعکس وہ مصر کے صدر ناصر الجزائر کے بن بیلا۔ انڈونیشیا کے سوئیکارنو، گھانا کے نکرومہ، مالی کے سیکو لتورے، کیوبا کے کاسترو زنجبار کے بابو اور اسی قسم کے دوسرے ترقی پسند آزاد خیال، حریت پرور اور آزادی کے پرستار رہنماؤں سے خائف ہے۔ جانے وہ کون سی آزادی ہے جسکا امریکہ تمنائی اور خواہشمند ہے۔ شاید برٹرینڈ رسل کے لفظوں میں جب امریکہ کیوبا کو آزاد کرانے کی بات کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہی ہوتا ہے کہ کیوبا کے عوام کو بھوک سے مرنے، بیماریوں میں گھرے رہنے اور جاہل رکھنے کی آزادی ہو گی۔

آج امریکہ امن و آزادی کا سب سے بڑا دشمن اور نئی نوآبادیات کا علمبردار ہے۔ وہ دوسرے ممالک کے داخلی معاملات میں کھلم کھلا یا در پردہ مداخلت کر کے اپنی خواہش کی حکومتیں قائم رکھنے پر بضد ہے۔ یہ حکومتیں یوں تو مقامی افراد پر ہی مشتمل ہوتی ہیں لیکن ان کے وطن فروش حکمراں تحفظ امریکہ اور اسکے حلیفوں کے مفادات کا ہی کرتے ہیں۔ عوام اب اس "کھلے راز" کو جان چکے ہیں۔ اور اب ہر ملک میں ان وطن فروشوں کے خلاف عوامی تحریکیں چل رہی ہیں۔ جس کی وجہ سے امریکہ کو اپنی حکمت عملی میں جگہ جگہ شکست کھا کر "آہنی مردوں اور "بناسپتی نجات دہندوں" کا سہارا لینا پڑ رہا ہے۔

امریکہ شاید بھول گیا ہے کہ اب وہ کسی ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم نہیں برسا سکتا اسے شاید اس بات کا دھیان نہیں ہے کہ پچھلی جنگوں میں وہ جس طرح دور دراز کے فاصلے کی وجہ سے محفوظ و مامون رہا تھا اب جدید ترین جنگی ہتھیاروں کی بدولت وہ اپنے دشمن کے حملوں کی زد میں رہیگا



ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے والا پاپی ——— ٹرومین

اسے شاید اتنا بھی شعور نہیں کہ آج اس کی زرعی اور صنعتی اشیاء کے خریدار، آنے والے کل کو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں گے اور شاید اپنی تمام تر ناکامیوں کے باوجود وہ اسی لئے اپنی خارجہ پالیسی میں کوئی ترمیم کرنے پر تیار نہیں ہے حالانکہ دانشمندانہ طریقہ کار یہ ہی تھا کہ امن اور آزادی کے ان زریں اصولوں کے تحت، جنکا مدعی خود امریکی انقلاب تھا اور جنکے داعی اس کے انسان دوست اور روشن خیال رہنما تھے، امریکہ اپنی تمام پالیسیوں میں انقلابی تبدیلی کرے۔ لیکن چونکہ امریکہ اب پہلے جاگیردارانہ اور نوآبادکارانہ زنجیروں کو انقلابی جھٹکے کے ساتھ توڑنے والا امریکہ نہیں بلکہ ۱۹۶۴ء کا سامراجی امریکہ ہے جو اب خود ہی محکوم، نیم محکوم آزاد اور نوآزاد، پسماندہ اور محروم ممالک کو غلامی آمریت اور نوآبادیاتی زنجیریں اور بیڑیاں پہنانے والا غاصب اور مردار خور گدھ ہے اس لئے یہ سوچ کہ سامراج کی بنیاد میں اصلاح ہو، اپنی جگہ بذات خود فریب محض ہے، ایک نیک خواہش ہے





ان جاگیرداروں کے ہاتھ بیچ ڈالا ہے جواب سرمایہ دار بن چکے ہیں۔

وہ انقلاب جو ساری دنیا کے لئے آزادی ومساوات کا پیغام لے کر آیا تھا اس کا سرمایہ داروں نے اس طرح خون کیا کہ وہ انقلاب دنیا کے لئے غلامی اور سامراجیت کی زنجیریں بن کر گلے میں پڑ گیا جن کو آج پوری دنیا کے عوام متحد ہو کر توڑنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ اور آج وہ زنجیریں کسی حد تک ٹوٹ بھی گئیں۔

گزرا ہوا کل یقیناً امریکی اور اس کے سامراجی حلیفوں کا تھا لیکن آنے والا وقت ابھرتی ہوئی آزاد قوموں کا ہوگا۔

داخلی طور پر بھی امریکہ کا یہ عالم ہے کہ انتہائی امیر اور قدرتی وسائل سے مالا مال اس ملک میں بے روزگاری کا الاؤنس تو دے دیا جاتا ہے لیکن روزگار مہیا نہیں کیا جاتا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا، صاحب مقدور اور گورے لوگوں کا حق ہے۔ سیاست اور تجارت کے میدانوں یعنی سینٹ اور منڈی پر چند خاندان قابض ہیں۔ محکمہ سراغ رسانی کے اعلیٰ ترین افسر انتظامی اور ریاستی حکمرانوں پر چھائے ہوئے ہیں کالی کھال والے نیگروؤں کو ابھی حال ہی میں آئینی حقوق ضرور دے دیئے گئے ہیں لیکن آئے دن نسلی فسادات اس مہذب ملک کی نمایاں خصوصیت ہیں۔ ان کی زندگی اجیرن ہے جو لوگ ظلم و جور کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ وہ قانون کی زد میں ہی نہیں آتے بلکہ انھیں انتہا پسندوں کے ہاتھوں اپنی جان بھی گنوانی پڑتی ہے۔



امریکہ کی پروقار اور عظیم صدارتی کرسی پر بیٹھنے والے جارج واشنگٹن اور ابراہیم لنکن اپنے طور پر یقیناً پُروقار اور عظیم تھے۔ مگر زمانے کا انقلاب دیکھیے کہ اسی کرسی صدارت پر، اپنے بے پناہ اور ناقابل تصور ذرائع اور وسائل سے منتخب ہو کر بیٹھنے والے صدر، سب کے سب اندر تک سڑے ہوئے اور سر سے پاؤں تک خون اور غلاظت میں لتھڑے ہوئے بورژوا طبقے کے ساہوکار، دلال، پاکٹ پتلیاں ہیں اور یہ خون، جابر بادشاہوں کا خون نہیں بلکہ ترقی اور تہذیب، امن اور دفاع کے نام پر گولیوں کا نشانہ بنائے جانے والے باشعور اور جیالے عوام کا خون ناحق ہے۔ انہوں نے مدت ہوئی اپنے ملکی اور قومی عہد شباب کے تمام آدرشوں کو چھوڑ کر پوری طرح عزت فروشی کا پیشہ اختیار کر لیا ہے اور اپنا جسم و روح گردڑ پیتوں، ادب پیتوں اور

فرانس اور عظیم انقلاب

فرانسیسی انقلاب کے تیز و تند سیلاب میں لوئی چہار دہم کی وہ عجیب و غریب شخصیت جو "میں مملکت ہوں" کا دعویٰ کرتی تھی، وہ جاگیردارانہ اور نوابی طاقتیں جو حکومت میں شامل ہونے کی مدعی تھیں۔ وہ ملوکیت جو مرکزی، صوبائی اور میونسپل سطح پر نمائندہ اداروں یا کسی بھی قومی حصے کی شرکت اور محتاجی کی نفی کرتے ہوئے اپنے زرخرید پٹھوؤں مذہبی پادریوں اور نوکر شاہی ذہنیت کے مالک حکمرانوں کے "خدائی حقوق شہنشاہی" کے تصور کے عین مطابق امیر ترین، موثر ترین، اور جابر ترین نمونہ تھی۔ سب کچھ خس و خاشاک کی مانند بہہ گئی۔ فرانسیسی بادشاہت کی یہ تمام خوبیاں انقلاب فرانس کی کامیابی میں ممد و معاون ثابت ہوئیں۔ تاریخ کے اولین ایام سے ہی ایک محفوظ اور کثیر ترین خزانہ اور ایک مستقل فوج پر مطلق العنان ملوکیت کا قیام رہا ہے۔ مگر فرانسیسی عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والے شاہی کارندے، خود اپنے خزانے اور خود اپنی ہی فوج کو نقصان پہنچا رہے تھے۔ کیا یہ دانشمندانہ فعل ہوگا کہ کسی گائے کا بیک وقت دودھ بھی دوہا جائے اور گوشت بھی کاٹا جائے؟ مگر فرانسیسی ملوکیت پرستوں نے ایسا ہی کیا۔ اور نتیجتاً تخت الٹا، تاج گرا، بستائیل کا زنداں منہدم ہوا اور شاہی آمریت حرف غلط کی طرح مٹ کر رہ گئی۔

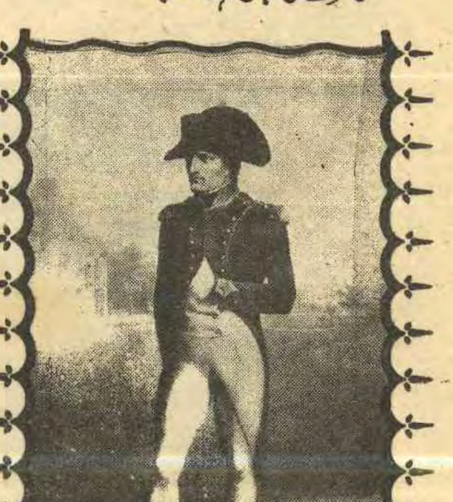
یوں تو فرانس کے حریت پسندوں نے انقلاب



انقلاب فرانس کا ذہنی رہنما — والٹیئر

بہرحال کیونکر ڈالا تھا مگر انقلاب کرنے سے زیادہ مشکل کام انقلاب کی حفاظت ہوا کرتا ہے جس کے یہ لوگ اہل نہ تھے، انھیں کی صفوں میں سے ایک شخص نکلا اور اس نے ساری قوت اپنے ہاتھ میں سمیٹ کر پورے فرانس کو اپنا گرویدہ بنایا۔ باتیں بھی اس کی بڑی لچھے دار ہوتی تھیں۔ اور شمال کی طرف اپنی سرحدیں پھیلانا تو صدیوں تک فرانس کے سیاست دانوں کا خواب رہا ہے۔ چنانچہ اس نے دونوں پہلوؤں پر غور کر کے اپنے طور پر بڑی اچھی پالیسی مرتب کی۔ اور وہ پالیسی یہ تھی۔ فرانس سے باہر نکل کر بیرونی یلغاروں کی پالیسی — اس نے اٹلی فتح کر لیا اور اسپین کا رخ کیا۔ روانگی کے وقت اس نے علان کیا کہ:۔

"میں اپنے پرچم پر آزادی، توہم پرستی سے دائمی نجات اور جاگیرداری کے خاتمے کے نعرے لکھواؤں گا۔ اور میرا ایسا ہی استقبال کیا جائے گا جیسا کہ اٹلی میں کیا گیا۔ اور وہ تمام عناصر جو قومی جذبے کے مالک ہیں، میرا ساتھ دیں گے۔ میں کاہلی اور سستی سے عوام الناس کو نجات دلاؤں گا اور ان میں مخصوص خوبیاں پیدا کر دوں گا اور اور تم دیکھو گے کہ وہ میری ایسی ہی عزت کریں گے جیسی کہ ایک نجات دہندہ کی عزت کی جاتی ہے۔ ۔ !



یہ شخص نیپولین بوناپارٹ تھا۔ اس نے فرانس اور انگلستان کی قدیمی دشمنی کے جذبہ کو مطمئن کرنے لئے کہا کہ:۔
اگر میں صرف چھ گھنٹے کے لئے سمندر کا حکمران بن جاؤں تو انگلستان کا وجود بھی

ختم ہو کر رہ جائے گا ——!

مگر تاریخ میں اس قسم کے "اگر" بہت کم پورے ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ "اگر" بھی پورا نہ ہوا۔ سپین کے قوم پرستوں نے اور انگلستان کے بحری سورماؤں نے نیپولین کی کمر توڑ کر رکھ دی اور نیپولین وہ ملوکیت دوبارہ مستحکم نہ کر سکا جس کو تباہ برباد کرنے کا فرض ایک کروڑ فرانسیسیوں نے اپنے ذمہ لیا تھا۔

اس کے بعد پھر دو عالمگیر جنگوں میں سرمایہ دار ممالک نے عالمی منڈی کے نئے بٹوارے کی جو کوششیں کی تھیں اس میں سامراجی نظام کے موجودہ سربراہ۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور اسکا دست راست برطانیہ عظمیٰ نے فرانس کی رہی سہی قوتیں بھی سلب کر لی تھیں اور فرانس کو یورپ کی اولین صف میں سے نکال باہر کر دیا گیا تھا۔ اور تو اور یہ نوبت آگئی تھی۔ کہ آئے دن وزارتیں بدلتی رہتی تھیں۔ فرانسیسی نو آبادیات، فرانسیسی سامراج کی کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی جد و جہد آزادی تیز سے تیز تر کر رہی تھیں — صنعتی ترقی۔ فوجی قوت، معاشرتی تحفظ، معاشی پھیلاؤ۔ پارلیمانی استحکام اب فرانسیسیوں کے لئے بے معنی الفاظ بن کر رہ گئے تھے۔ اور ان تمام حقائق کی وجہ سے فرانسیسی ذہن آہستہ آہستہ فراریت اور لاتعلقی کے جان لیوا جال میں پھنستا جا رہا تھا۔ دانشوروں نے کھلم کھلا اور فخریہ قنوطیت اور ریاضیت کی تعلیم و تبلیغ اپنا شیوہ بنا لیا تھا۔ بولیراور سارتر اس دعویٰ کے بدیہی ثبوت ہیں۔

وہ فرانس جس کا تصور والٹیر اور روسو، رابس پیری اور دیدرو، فائیستے اور وکٹر ہیوگو کے عظیم ناموں کے ساتھ ابھر کر آتا ہے۔ جس نے ساری دنیا کے عوام کو انصاف، مساوات اور جمہوریت کا سبق دیا تھا۔ جس نے بستائیل کے سیاہ تاریک زندانوں کو مسمار کرنے کی بنا ڈالی تھی۔ ہاں اسی فرانس میں وہ رجعت پسند طاقتیں برسر اقتدار آئیں جنہوں نے الجزائر کی مجاہدۂ آزادی جمیلہ بوپاشا پر شرمناک مظالم توڑے جبری زنداں قائم کئے ویت نامی عوام پر جراثیم سے تیار شدہ نیپام بم پھینکے۔ وہ فرانس جو بین الاقوامی میدان میں خود اپنے ہی اتحادیوں کی خود غرضی کی بدولت مات کھا چکا تھا۔ اب اپنے ہی شاندار اور عظیم انقلاب کے زریں اور بنیادی اصولوں کو پیروں تلے روند رہا تھا۔

" انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر آج وہ ہر جگہ پابہ زنجیر ہے" فرانس کے سامراج تو اسے نے توڑ دیتو کا یہ جملہ بھلا دیا مگر نئے دور کے انسان سے یہ غلطی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہی ہوا اس نے اپنی یہ زنجیریں توڑ ڈالیں

اور آزاد ہو گیا۔ ہو چی منہ اور بن بلا نے، ڈین بن ہو اور الجزائر میں فرانسیسی قاتلوں کو زبردست ٹھوکریں ماری ہیں اور فوجی، سیاسی و معاشی اعتبار سے وہ زک پہنچائی ہے کہ سارے ہوش ٹھکانے لگ گئے۔ اور بالآخر انھیں خود اپنی بقا اور تحفظ کے لئے تھوڑی بہت سنبھلی ہوئی حکمت عملی اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔



ترکش آں را فدنگ آخریں — ڈیگال

وہ تو بھلا ہوا اتفاق سے دوسری عالمگیر جنگ کی قد آور شخصیت، جنرل ڈیگال کے روپ میں ابھی زندہ تھی جس کو فرانس کے برسراقتدار سرمایہ دار گروہ نے اپنے ترکش کے آخری تیر کے طور پر استعمال کرنے کی ٹھان لی۔ اور — اب — فرانس و عظمت کے قدیم نعرے بلند کر کر کے فرانسیسیوں اعتماد بحال کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔

کچھ ہی سال قبل کسی فرانسیسی وزیراعظم نے بڑی حسرت و یاس کے ساتھ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادی خرابی کا لاشعوری اور نادانستہ طور پر سرسری طریقے سے کچھ اس طرح اظہار کر ڈالا تھا کہ

"ایک طرف تو ہمارے کسان اپنی کاشت کردہ اشیاء کی زیادہ سے زیادہ قیمتیں طلب کرتے ہیں اور دوسری طرف ہمارے مزدور ہم سے اشیاء کے صرف کم سے کم قیمت پر مہیا کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ اس اہم ترین مسئلہ کو آخرکار کیونکر حل کیا جائے —— !"

مسائل صرف کسانوں کی زیادہ آمدنی اور مزدوروں کو کم قیمتوں پر اشیا خورد و نوش مہیا کرنا ہی نہیں بلکہ مسئلہ یہ بھی ہے کہ فرانسیسی کارخانوں میں تیار شدہ مال کی کھپت آخر کہاں کی جائے؟ فرانسیسی منافع خوروں کے کارخانے جتنا مال تیار کر رہے ہیں وہ فرانس کی اپنی ضروریات سے بہت زیادہ ہے اور خون چوسنے والے سرمایہ دار یہ کبھی بھی نہیں مان سکتے کہ یہ تیار شدہ اشیاء ہم وطنوں کو کم از کم قیمت پر دے دی جائیں اور اسکا تو خیر دور دور تک امکان

نہیں کہ سرمایہ داران صنعتوں کو قومی ملکیت میں دینے پر غور بھی کریں۔ لہٰذا اب مسئلہ حل ہو تو کیسے ہو؟ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے فرانس پر لازم ہو گیا ہے کہ وہ نئی منڈیاں تلاش کرے ۔ داخلی پالیسی کا یہی خلفشار ہے جو آج ہمیں فرانس کی خارجہ پالیسی میں جھلکتا نظر آتا ہے۔ فرانس یک ایک کر کے اپنی تمام منڈیاں گنوا چکا ہے اور محکوم و نیم محکوم ممالک کی شدید ترین جنگ آزادی میں حاصل کردہ تلخ ترین تجربات کے پیش نظر اس نے یہ بھی جان لیا ہے کہ اب پرانی یا نئی منڈیاں "ہتھیاروں اور جنگوں کے بل پر حاصل کرنا ممکن نہیں رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ممالک بھی منڈیوں کی اس تلاش و جستجو میں اس کے حریف ہیں جن کو وہ اب تک حلیف سمجھتا رہا تھا اسی لئے فرانس نے اب نیا پینترا بدلا ہے اور وہ یہ کہ اس نے نئی ابھرتی ہوئی طاقتوں اور اشتراکی ممالک کی اعانت اور حمائت حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دی ہیں۔ اور سرمایہ دارانہ ممالک کے لئے سامراجی سطح سے نیچے گر کر جب تک کہ وہ سوشلزم اختیار نہ کریں لے دے کر یہی ایک طریقہ رہ بھی جاتا ہے۔ چنانچہ فرانس اب اپنی ناعاقبت اندیشانہ جنگی اور ناکام پالیسیوں کی بدولت تباہ شدہ معیشت کو سنبھالنے کیلئے امریکہ اور برطانیہ کو دھکیل کر "یوروپی مشترکہ منڈی" کی ریل گاڑی میں بیٹھ رہا ہے۔ ایٹمی کلب اور ایم۔ایل۔ایف میں عدم شرکت۔ چین کی سرخ حکومت سے آئے دن تجارتی اور سیاسی تعلقات میں ترقی۔ ایک حد تک ناٹو کی مخالفت کمبوڈیا، لاؤس، ویت نام اور کانگو میں عملاً مثبت غیر جانبدارانہ موقف اور بحیثیت مجموعی امریکی و برطانوی لائحۂ عمل سے مخالفانہ رویہ ۔ ان ممالک کی طرف سے کی گئی زیادتیوں کا انتقام ہے ۔ دراصل یہ سب کچھ ۔ اور کچھ بھی نہیں صرف اور صرف سرمایہ دارانہ نظام میں جکڑے ہوئے ممالک کے اندرونی تضادات و اختلافات کا صاف، شدید عام فہم اور کھلا ہوا اظہار ہے ۔

روس اور پہلا اشتراکی انقلاب

انیسویں صدی کے آغاز میں تمام سرمایہ دار ملکوں کا نو آبادیوں کی تلاش اور تحصیل میں مصروف ہونا اس لئے ضروری ہو گیا تھا کہ جیسے جیسے سرمایہ داری کو فروغ ہوا خام مواد کی کمی زیادہ شدت سے محسوس ہوتی۔ مقابلے کی شدت اور تیزی میں اضافہ ہوا۔ دنیا بھر میں خام مواد کے ذرائع کی تلاش اور تیار شدہ مال کھپانے کے ٹھکانوں کی مانگ بڑھتی گئی ۔ ویسے ویسے نو آبادیات حاصل کرنے کی جدوجہد کے لئے جان پر کھیل جانے کی نوبت آتی گئی ۔ مگر جب حقیقت یہ ہو کہ ساری دنیا کا پہلے ہی سے واضح طور پر بٹوارہ ہو چکا ہو تو پھر نیم محکوم اور کمزور ملکوں کو ہتھیانے کے لئے رسہ کشی اور کشمکش خاص طور پر تند و تیز ہو جاتی ہے ۔ ظاہر ہے باہمی صلاح و مشورہ سے تو اس سلسلہ میں کوئی اتفاق رائے ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ کیونکہ اس وقت ہر سامراجی ملک ایک دوسرے کو ہولناک نگاہوں سے دیکھنے پر مجبور تھا۔ لہٰذا منطقی طور پر یہی نتیجہ برآمد ہوا کہ آگ اور



دنیا کے مزدورو! ایک ہو جاؤ ۔ لینن

خون کی ہولناک ہولی کھیلی جائے اور پہلی ۔ عالمگیر جنگ چھیڑ دی جائے ۔ یہ جنگ صدفی صد سرمایہ دار اجارہ داروں کے مفاد میں چھیڑی گئی تھی ۔ مگر نعرہ یہ لگایا گیا کہ، ملک و وطن، نسل و قومیت اور تہذیب و ثقافت کیلئے میدان میں نکل آؤ ۔ حالانکہ اس جنگ میں دار و رسن آتش و آہن اور استحصال و ناکاری کے ذریعہ مہذب بنانے کا مشن اجارہ داروں کا اپنا مشن تھا۔ یہ ہے وہ پس منظر جس میں انیسویں صدی کا زارشاہی ۔ "غلاموں کے مالکوں کی اس جنگ" میں کودا اور روس کے ہزاروں افلاس زدہ خاندان کے روزی کمانے والوں کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا گیا ۔ قومی قرضہ اور قومی اخراجات میں بے انتہا اضافہ بڑھتے ہوئے محصول، عوام کو لوٹنے کھسوٹنے والے سرمایہ داروں کی طاقت میں زیادتی جمہوری قدروں کی پامالی مزدوروں کی حالت کا بد سے بدتر ہونا کسانوں کا روز افزوں تیزی سے خاتمہ ۔ سائبیریا میں بھوک یہ ہیں وہ چیزیں جو یہ عالمگیر جنگ اپنی آمد کے ساتھ روسیوں کے لئے لائی ۔ روسی حکومت نے اس جنگ میں کروڑوں روبل اسوقت لٹائے جبکہ قحط کے مارے ہوئے کسانوں کی مدد کے لئے پہلے سے منظور شدہ رقوں میں کمی کرتے اور ایک ایک کوپک کے لئے جھگڑا اور مول تول کرتے ہوئے وہ قطعی نہ تھکی ۔ اس حکومت کو تعلیم و صحت کے لئے کہیں سے پیسہ نہ ملتا تھا مگر ایک ساہوکار کی طرح ریاستی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور ڈاکخانوں اور دوسرے سرکاری اداروں کے چھوٹے چھوٹے کلرکوں کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑنے پر تلی ہوئی تھی ۔

مگر شاید زار یہ بھول بیٹھا تھا کہ ایک ایسا نظام جس میں کسانوں کو جابرانہ سزائیں دیکر اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ ایک دیوالیہ ملک کا دفاع کریں جہاں انھیں بھوکا مارا اور جنگ میں نہتا جھونکا جاتا ہے ۔ اٹھارہویں صدی میں تو برقرار رہ سکتا تھا۔ لیکن، انقلاب فرانس، امریکہ کی جنگ آزادی ۔ برطانیہ کے صنعتی انقلاب، مارکسی فلسفہ اور عالمگیر جنگ کے اثرات کے بعد اس انیسویں صدی میں اس نظام کو برقرار رکھنا قطعی طور پر ناممکن تھا۔

۱۹۱۷ء میں روس کے اندر اشتراکی انقلاب برپا ہو گیا۔ روس کے عوام اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے لینن اور بالشویک پارٹی کی قیادت میں اس سرمایہ دارانہ نظام کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکا جس میں منافع کمایا جاتا ہے جس میں ایک قوم دوسری قوم کو اور ایک ملک دوسرے ملک کو غلام بناتا ہے ۔ جس میں استحصال اور ظلم کا کھیل کھیلنا فخر و اعزاز خیال کیا جاتا ہے جس میں جنگیں پرورش پاتی ہیں ۔ یہ بغاوت، یہ انقلاب پوری دنیا کے لئے روشنی کا ایک سورج بن کر طلوع ہوا ۔ اس انقلاب کے مقاصد

سے اختلاف رکھنے والے بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ بنی نوع انسان اور تاریخ عالم پر اس انقلاب کے اثرات ابدی ہیں اور اس انقلاب نے کاروان انسانیت کو ایک نئی شاہراہ دکھائی —— ایک تابناک مستقبل -

روس کے انقلاب نے سامراجی ممالک کو چونکا دیا تھا - انھوں نے اس انقلاب کے خلاف زہر بھرا پروپیگنڈہ کرنے کے ساتھ ساتھ مسلح مداخلت کر کے اس کو ناکام بنانے کی از سر نو کوششیں اور ناپاک سازشیں کیں لیکن وہ انقلاب جو عوام کی ایماء پر عوام کے مفاد میں آیا تھا کیونکر ناکام بنایا جا سکتا تھا -

ابتدا ہی سے اس انقلاب کو جن غیر ملکی ریشہ دوانیوں ، ملکی ہنگامہ آرائیوں کا سامنا کرنا پڑا - وہ بہت سنگین اور شدید تھیں - لیکن اس کے باوجود لینن اور اس کے رفقاء نے انتہائی ذہانت سے ، صبر ، ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے ملکی تعمیر نو کی داغ بیل ڈالی اور ایک نیا معاشی نظام قائم کیا جس میں زمینوں کے مالک ان پر کام کرنے والے کسان بنے اور صنعتیں قومی ملکیت بنیں —— اب منافع کسی فرد کی جیب میں جانے کے بجائے پوری قوم کے مفاد میں صرف ہو رہا تھا - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک کو روزگار ، تعلیم ، طبی امداد اور تفریح کی لازمی ضمانت مل گئی — یہ ایک ایسا نظام تھا جس میں ہر فرد کو اپنی تمام صلاحیتیں استعمال کرنے کے مواقع حاصل تھے اور اسکی ضروریات کی تکمیل کی ضمانت بھی۔

سرزمین روس پر آج دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی (ماسکو یونیورسٹی) قائم ہے کارخانوں کا جال بچھ گیا - بنجر زمینیں زیر کاشت لائی گئیں - پانی اور زیر زمین دوسری معدنیات کو بھرپور طریقے سے کام میں لایا جا رہا ہے اور اس ملک کی پیداوار کم و بیش امریکہ کے برابر ہے -

سائنس ، ٹیکنالوجی ، ادب ، فلسفہ غرض ہر شعبہ زندگی میں روس نے قابل قدر اور حیرانگیز ترقی کی ہے روسی سپوت خلاء تک میں اپنے جھنڈے گاڑ آئے ہیں - اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ سارے کارنامے روس نے ان حالات میں انجام دیئے ہیں جبکہ ہٹلر اور مسولینی کی نازی اور فسطائی فوجیں اس کے دارالخلافہ ماسکو تک دندناتی پہنچ گئی تھیں اور پورا روس آگ و خون میں گھرا ہوا تھا - گلی گلی ، کوچے کوچے میں دست بدست مدافعت کا فرض انجام دیا جا رہا تھا - حالانکہ نئی انقلابی حکومت ابھی پہلی جنگ عظیم کے ہی کارناموں سے نہ سنبھل پائی تھی کہ دوسری جنگ عظیم کے بھیانک شعلوں کی لپیٹ میں آگئی اس کے باوجود آخری نتیجہ جب یہ نکلا کہ دراصل نازیوں اور فسطائیوں نے اس ملک پر حملہ کر کے خود اپنی ہی موت کو دعوت دی تھی اور آخر کار نازی ازم اور فاشزم کو بھی گہری قبر میں دفن کر دیا گیا تو بات حیرت و تعجب کی نظروں سے نکل کر معجزوں کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے اور یہ تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ انسان بھی معجزے تخلیق کر سکتے ہیں -

دوسری جنگ عظیم نے روس پر تباہی کے بھیانک اور موثر یا نشانات چھوڑے تھے جنہیں اس ملک کے باہمت عوام نے جلد ہی مٹا ڈالا اور اسٹالن کی قیادت میں اسی دھن اور لگن کے ساتھ ملک کی تعمیر نو میں لگ گئے اور آج روس کو دنیا کی صف اول کی طاقت تسلیم کیا جاتا ہے اور یہ بات اس کے وہ دشمن بھی مانتے ہیں جو انقلاب کے بعد یہ بشارت دیا کرتے تھے کہ اشتراکی نظام اپنی موت آپ مر جائے گا -

روس نے صرف اپنے اندرونی مسائل کو ہی حل نہیں کیا بلکہ بین الاقوامی ذمہ داریوں کے پیش نظر اسپین کی جنگ آزادی ، نہر سویز کی نیشنلائزیشن ، الجزائر ، کوریا ، انگولا کیوبا ، موزمبیق اور دنیا کے تمام محکوم و نیم محکوم ممالک کی جدوجہد آزادی کی حمایت کر کے استعماری قوتوں کا مقابلہ کیا ہے - آزاد ممالک کے ترقی میں روس نے غیر مشروط ٹھوس اور مفید ترین امداد دیکر سامراجی ممالک کی خودغرضانہ حکمت عملیوں کا بھی پردہ فاش کیا ہے - بہر طور یہ صداقت ناقابل تردید ہے کہ اگر آج - ایشیا ، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں استحصالی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے سوویت یونین جیسی عظیم فوجی طاقت موجود نہ ہوتی تو آج دنیا کا نقشہ اور ملکی سرحدوں کا انداز قطعی طور پر کچھ اور ہی ہوتا اور سامراجی طاقتوں نے آزادی خود مختاری اور مساوات کا نعرہ لگانے والی طاقتوں کو نیست و نابود کر دیا ہوتا -

روس دنیا کی تمام کچلی ہوئی اور غیر ملکی استحصال کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی قوموں کی آزادی کا نقیب ہے - آزاد اور نو آزاد قوموں کے لئے غیر ملکی مدافعت سے حفاظت کی ڈھال ——



بیسویں صدی کے دو بدترین
حیوان انسانی روپ میں
مسولینی ~~~~~~~~~ ہٹلر



سوویت یونین کا معمار —— اسٹالن

چین اور عوامی انقلاب

چین کے ایک عظیم اشتراکی رہنما لی۔تا۔چاؤ نے تختہ دار پر جلادوں کو للکارتے ہوئے کہا تھا۔

تم سب اس مچھلی کی طرح ہو جو ایک مرتبان میں تیر رہی ہے پھر بھی تم یہ شرمناک کام کرکے اپنی حماقت کا مزید ثبوت دینے پر تلے ہوئے ہو۔ صرف مجھے پھانسی دے دینے سے اشتمالیت کا عظیم نصب العین قتل نہیں کیا جا سکے گا۔ ہم نے تو اشتمالیوں کی ایک بڑی تعداد کو تربیت دے دی ہے اور وہ سرخ پھولوں کے ان بیجوں کے مانند ہیں جو آج تمام ملک میں بوئے جا چکے ہیں یہ تو ہمارا ایمان کامل ہے کہ چین میں اشتمالیت کی شاندار اور رقابل رشک فتح ہو کر رہیگی

یہ حقیقت ہے کہ جب نظریات کی آبیاری شہیدوں کے پاکیزہ خون سے کی جاتی ہے تو وہ بہت جلد پھولتے پھلتے ہیں چینی عوام نے اپنے طور پر اپنے ملکی لیڈروں اور غیر ملکی اٹھائی گیروں کے جور و استبداد سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے۔

"ہم محنت کریں گے اور زندہ رہیں گے یا پھر ہم لڑیں گے اور مر جائیں گے۔" کا زریں اصول اپنا مقصد حیات بنا لیا تھا۔

صورت حال یہ تھی کہ سامراجی طاقتیں چین کے جاگیرداروں اور غدار سرمایہ داروں سے ملکر چین کو اس طرح لوٹ رہی تھیں جیسے کفن چور مردے کو لوٹتا ہے اور جب اس شخص نے جسے انہوں نے مردہ سمجھ لیا تھا۔ مداخلت کرنے کی کوشش کی تو وہ شکاری کتوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑیں۔ برطانیہ فرانس روس، جرمنی، جاپان اور امریکہ یہ تمام طاقتیں جب برسوں ...ست چین پر اپنا سیاسی اور فوجی غلبہ برقرار نہ رکھ سکیں اور چینیوں نے :-

"اگر ہم اپنے ہی لئے سب کچھ کریں گے
تو پھر ہم اپنے وطن کے لئے آخر کیا کرینگے
اور اس صورت میں بھلا ہم کس قدر پاپی
ہوں گے۔ لہٰذا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں"

کے مصداق قومی جمہوری تحریک میں کامیابی حاصل کی اور ڈاکٹر سن یات سن کی قیادت میں ایک سرمایہ دار جمہوریت کی داغ دبیل ڈال دی تو مذکورہ سامراجی طاقتوں نے ذرا بدلے ہوئے انداز میں نیا جال پھینکا جسے قرمن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے انہوں نے ۱۰۵ کروڑ روبل کے برابر قرضہ چینیوں کو دیا اور شرح تبادلہ ۸۴ فیصد رکھی اس کا مطلب یہ ہے کہ یوروپ کے سرمایہ داروں نے چینیوں کو دیا تو صرف ۲۰ کروڑ اور ان سے ۲۲ کروڑ ۵۰ لاکھ روبل وصول کرنے کے حقدار بن بیٹھے اس کو کہتے ہیں لمبا ہاتھ مارنا چند ہفتوں کے اندر اندر ڈیڑھ کروڑ کا منافع کما



ستر کروڑ چینی عوام کا عظیم ترین رہنما
ماؤ زے تنگ

کر لینا۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے طور طریقوں سے سامراجیوں نے چین پر اپنی گرفت برقرار رکھی چین کی خاکستر میں وہ چنگاریاں ابھی موجود تھیں جو مغربی استعمار پسندوں کو راکھ کا ڈھیر بنانے پر تلی ہوئی تھیں۔ چین کے عوام کسی بھی شکل و صورت میں یونانی غلاموں کی مانند اب مزید سامراجی آقاؤں کے اقتدار کی رتھ میں جتنے کے لئے تیار نہ تھے۔ انہوں نے کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں بڑی شدت سے جاپانی حملے اور سامراج کے خلاف تحریک شروع کی۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ان کو ماؤ زے تنگ جیسا جہاندیدہ رہنما، چو۔تے جیسا ماہر جنگ، چو۔این لائی جیسا شاطر اور لیو۔شاؤ چی جیسا بھرپور تنظیمی صلاحیتوں کا مالک مل گیا

ان سب کی قیادت میں چین کے افیونیوں اور بیماروں نے سیاست عالم کا نقشہ الٹ کر رکھ دیا چھاپہ مار فوجی جنگ، لانگ مارچ (Long March) کی عظیم مہم، مقامی عوامی حکومتوں کا قیام۔ عوام الناس سے قریب ترین اور اٹوٹ رابطہ۔ انسانی ذہن اور قوت پر ناقابل تسخیر یقین وہ کارگر ہتھیار تھے جنہوں نے بین الاقوامی سامراجی کاغذی شیروں کو لہولہان کر ڈالا۔ اور یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء کو انہوں نے چین کی ایک نئی تاریخ مرتب کی جس کا عنوان تھا "عوامی انقلاب"۔ جو ۷۰ کروڑ انسانوں کے لئے ایک نیا پیغام، ایک نئی زندگی کا ضامن ہے۔

عوامی قوتوں کی اس یلغار سے خوفزدہ ہو کر سامراجی پٹھو چیانگ کائی شک اپنی شخصیت کے تمام روشن پہلو سے دست بردار ہو کر جزیرہ فارموسا میں منہ چھپا کر بیٹھ گیا اور آج وہ اپنے امریکی آقاؤں کی مسلح فوجی حفاظت میں جزیرہ تائیوان میں محصور ہمارے ٹھیٹ پاکستانی انداز میں بار بار یہی ڈینگ مار رہا ہے" اب کے سے مار کے دیکھ!"۔ بھلا ایک ڈوبتی ہوئی شکستہ ناؤ کب تک امریکی سہارے پر چل سکتی ہے؟

چین کی کمیونسٹ پارٹی نے انقلاب کے مقاصد کے حصول کے لئے زرعی اور صنعتی مزدوروں رہنماؤں اور عوام، دانشوروں اور محنت کشوں کا عملی اتحاد قائم کرکے قدیم اسپارٹا کی جفاکشی سادگی اور اولوالعزمی کو اپنایا اور پوری تندہی اعتماد اور بے باکی کے ساتھ انتہائی منظم طریقے سے فرد کو ذرائع پیداوار کی ملکیت سے محروم کر دیا ذاتی منافع کا قلع قمع کرتے ہوئے صنعتوں اور کھیتوں کو اجتماعی ملکیت قرار دیا ہے۔ بیرونی سرمایہ ضبط کر لیا۔ عورت کو مرد کے برابر سماجی رتبہ عطا کیا۔ روزگار تعلیم، صحت، تفریح، رہائش کی لازمی ضمانت دی۔

تنقید اور خود تنقیدی کے اصول کو ایمانداری کے ساتھ اپنایا۔ اپنے ملک کی تمام پوشیدہ دولت کو ملکی مفاد اور تعمیر کے لئے استعمال کیا۔ اور پھر ان تمام اقدامات سے زیادہ اس حقیقت کو اجاگر کیا کہ عوام ہی سے تمام عظمتیں اور برکتیں عبارت ہیں۔ یہ ذہنی انقلاب چینی انقلاب کی مرکزی خصوصیت ہے اور ساتھ ہی ساتھ چین نے سائنس اور ٹکنالوجی میں کبھی حیرت ناک ترقی کی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ جب عوام کو ان کی قسمتیں سنوارنے کے مواقع ملتے ہیں تو وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ، کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ ترقی کی غیر معمولی مثال پیش کرتے ہیں۔ ہیں وہ ناقابل تردید حقائق جو اس سامراجی پروپیگنڈے کی پول کھولتے ہیں کہ چین "کمزور ہے" بیمار ہے" ز...

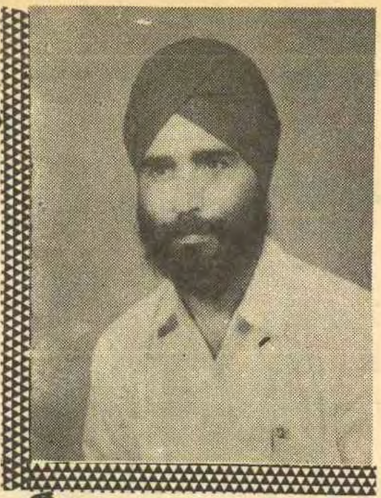
بحران سے گذر رہاہے" سیلابوں میں ڈوب رہاہے" "ظلم وجور کا گہوارہ ہے۔ اگر یہ سب ہی حقیقت ہوتی تو پسماندہ، غریب اور غیر مستحکم، ملک آخر کس طرح ایٹمی طاقت بن کر سامراجی ممالک کو ایسا آئینہ دیکھانے پر قادر رہو تا کہ اس میں انہیں اپنے مکروہ، مدقوق اور گھناؤنے چہرے نظر آجاتے ہیں۔ اور آخر وہ کس طرح جانتے کہ اب ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں لوٹ کھسوٹ کا پرانا اور مذموم ناٹک رچانا اور ابھرتی ہوئی جمہوری طاقتوں کو کچلنا گویا وقت توانائی اور حرکت سے لڑنا ہے۔ جس کے نتیجے میں صرف اور صرف ناکامی اور نامرادی حاصل ہوسکتی ہے۔

یہ سوچنا بنیادی طور پر حماقت ہوگا کہ چین کے انقلاب کا کردار صرف قومی ہے۔ دراصل چینی انقلاب کا کردار سامراج دشمن ہونے کے ناطے بین الاقوامی بھی ہے۔ اور چین میں سامراج دشمنی کا جذبہ زیادہ جاندار زیادہ توانا، زیادہ موثر اور زیادہ سائنٹفک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ اور اس کے حواری چین کی انقلابی حکمت عملیوں سے لرزہ براندام ہیں۔ آج چین، ویت نام، لاؤس، کمبوڈیا، انڈونیشیا، لنکا، کانگو، کیوبا، فلسطین، کشمیر اور یمن عوام دوست موقف اختیار کرنے کی بدولت امریکہ اور اس کے زرخرید غلاموں کی نظروں میں" جارحیت (!) کا علمبردار اور عالمی جنگ (!) کا طرفدار ہے اور اپنے انہی ناکردہ گناہوں کی پاداش میں کثیر ترین انسانی آبادی اور اہم ترین حیثیت کا مالک یہ ملک۔ چین۔ انسانوں اور اقوام کی عالمی انجمن میں جگہ لینے سے محروم رکھا جارہاہے۔ لیکن امریکہ کی یہ پالیسی کہ چین کو دنیا سے الگ تھلگ کردیا جائے آج پانی کا بلبلے اور ریت کی دیوار ثابت ہوچلی ہے اب نئی ابھرتی اور بڑھتی ہوئی آزاد اقوام امریکہ کی اس پرفریب پالیسی کے خلاف صف آرا ہوگئی ہیں۔

چینی عوام کا موقف یہ ہے کہ ہمیں سامراج اور اس کے پالتو کتوں کے خلاف "جیسے کو تیا" کی پالیسی اختیار کرنے کے لئے بنی نوع انسان پر پورا پورا بھروسہ اور اعتماد کرنا چاہیئے۔ سامراج اور اس کے پالتو کتے آج ہر ملک میں انقلابی عوام کی تحریکوں کو کچلنے کے لئے تمام ممکنہ وسائل اور طریقے اختیار کررہے ہیں۔ اور اس لئے تمام ممالک کے انقلابی عوام کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ ان تمام طریقوں اور ذرائع پر نظریاتی اور عملی عبور حاصل کریں جو دشمن زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا سکے اور خود ان کی اپنی صفوں کو محفوظ اور مضبوط بنا سکے جن پر عمل درآمد کرنے کے یہ راستے ہیں کہ سامراج اور اس کے پالتو کتوں کے انقلاب دشمن متحدہ محاذ کی عوام کے سامراج اور اسکے پالتو کتوں کے دشمن، متحدہ محاذ کے ذریعے مخالفت کی جائے دوہرے انقلاب دشمن حربوں کا دہرے انقلابی حربوں سے مقابلہ کیا جائے۔ جارحانہ جنگوں کا دفاعی جنگوں سے سامنا کیا جائے، گفت و شنید کے وقت گفت شنید کی جائے، انقلاب دشمن پروپیگنڈہ کا انقلابی پروپیگنڈہ سے جواب دیا جائے۔ یہ ہے وہ حکمت عملی جس پر چین چل رہاہے جو "جیسے کو تیا" کی حکمت عملی سے موسوم کی جاتی ہے اور یہی پالیسی کسی بھی ملک کے عوام کے وسیع ترین مفاد کی حفاظت کرسکتی ہے۔

چین ایک ابھرتا ہوا سورج ہے۔ ایک ایسا سورج جس نے ماضی میں بھی دنیا کو اپنی تہذیب سے روشن کیا تھا۔ اور آج پھر وہ گہن سے نکل آیاہے اس کی روشنی ہر ملک تک پہنچ رہی ہے اور تمام آزاد اقوام اس کی خوش حالی اور اس کی استحکام کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہی ہیں بلکہ سامراجی طاقتیں جانتی ہیں کہ اس ملک کا استحکام ان کی اپنی موت کا پروانہ ہے۔ اور یہی ان کا مقدر ہے۔

معصوم سوار



گربچن سنگھ



رحیم بابا بس کے اسٹیرنگ پر بیٹھے کچھ سوچ رہا تھا اس کی نظریں سامنے کے شیشے میں سے سڑک پر جاتے ہوئے کچھ بچوں پر گڑی ہوئی تھیں۔ اچانک بس میں بیٹھے ہوئے بچوں نے شور مچایا۔ "چلو نہ بابا جلدی چلو . . . . !"

رحیم بابا نے چہرہ گھما کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی تھی۔ وہ آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ میرے بچو شور کیوں مچا رہے ہو۔ ذرا انتظار کرو۔ پھر اس تیزی سے بس دوڑاؤں گا کہ جھٹ پٹ تم سب کو تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔

اس کی نظریں بغل والی سیٹ کی طرف گھوم گئیں جو ابھی تک خالی ہی پڑی تھی۔ وہ ہارن بجانے لگا۔

اسکول کے لان میں سے ایک ننھی سی بچی دوڑتی آتی [illegible] اس کی بغل میں بستہ تھا اور ہاتھ میں ایک رنگین ڈبہ۔ [illegible] ہی وہ بابا کے بغل والی اس سیٹ پر بیٹھ گئی۔

[illegible] نے بس اسٹارٹ کی۔ جو گھر . . . . . گھر . . . . . کی ایک آواز پیدا کرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

پیچھے کے برتھ پر ننھے بچے بچیاں چلا چلا کر آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے ایک دوسرے سے مذاق کر کے ہنس رہے تھے۔ رحیم بابا کو جیسے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا پہلے جب وہ بچوں کو اس طرح شور مچاتے اور شرارت کرتے ہوئے دیکھتا تو ٹوک دیتا تھا۔ لیکن آج گویا اس نے انھیں کھلی چھٹی دے دی تھی۔

شمیمہ اس کی بغل میں بیٹھی بار بار اس کی طرف معصوم نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کب بابا اس سے کچھ پوچھے اور وہ اس کے سوال کا جواب دے۔ لیکن بابا کو خاموش دیکھ کر اسے مایوسی سی ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے ڈبے میں سے ایک ٹافی نکالی اور بابا کی طرف بڑھا دی۔

رحیم بابا نے اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا اور بولا "تم کھاؤ"۔ وہ بولی۔ "لو نا بابا . . . . . . !"

بابا نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "نہیں بیٹی تم کھاؤ"۔

بابا کی خاموشی ٹوٹنے سے بڑی خوشی ہوئی وہ مچل کر پوچھ بیٹھی۔ "بابا چار دنوں سے تم موٹر چلانے نہیں آئے۔ بیمار تھے کیا؟"

رحیم بابا نے شمیمہ کے معصوم چہرے کی طرف دیکھا "ہاں بیٹی" اور کہتے کہتے اس کے چہرے پر اداسی اتر آئی . . .

بس تیز رفتاری سے کھلی سڑک پر چلی جا رہی تھی بچے بدستور اندر بیٹھے شور مچا رہے تھے۔ رحیم بابا پھر کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔

شمیمہ بولی "بابا تم بیمار کیوں پڑ گئے تھے؟"

بابا نے شفقت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے اس سے پوچھ بیٹھا "میں موٹر اچھی چلاتا ہوں نا بیٹی؟"

"ہاں بابا . . . . . . "

بس ایک کالونی میں داخل ہو رہی تھی۔ کافی دور تک پھیلے ہوئے چھوٹے بڑے بنگلے، لان باغیچے، اور گھنے گھنے سایہ دار درخت۔ یہاں آ کر وہ دھیمی رفتار سے چلنے لگی۔ رحیم بابا کے لئے بس چلانا کچھ دشوار سا ہو رہا تھا۔ شمیمہ سرک کر بالکل اس کے ساتھ لپٹ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ "بابا آج ہم نے نیا سبق پڑھا ہے۔ سناؤں . . . . ؟" اور بستہ میں سے اپنی انگریزی کی کتاب نکال کر سبق سنانے لگی۔

بابا چند لمحے سنتا رہا۔ پھر بولا۔ "اس کا مطلب کیا ہے بیٹی . . . . ؟"

"بابا کیا تم اس کا مطلب نہیں سمجھے۔؟"

"نہیں بیٹی — !"

"تب تم کچھ نہیں جانتے۔ !" اور وہ اسے مطلب سمجھاتی ہوئی بولی۔ "اس کا مطلب ہے، آسمان پر ننھے ننھے تارے چمک رہے ہیں"۔

"واہ بیٹی تجھے تو مطلب بھی آتا ہے"۔

شمیمہ اور آگے پڑھنے لگی۔ پڑھتی رہی۔ رحیم بابا سنتا رہا۔ سامنے ایک موڑ پر سٹاپ تھا وہاں اترنے والے بچوں نے شور مچا کر بس روکنے کے لئے کہا۔ بابا کا دھیان ٹوٹا۔ اس نے ایک درخت تلے موٹر کھڑی کر دی پانچ سات بچے بس سے نیچے اتر آئے۔

بس پھر گھر گھرائی اور سامنے ایک کچی سڑک پر ہولی

ایک ڈیڑھ فرلانگ کی دوری تک گئی اور پھر رک گئی یہاں بھی کچھ بچے بس سے نیچے اتر پڑے - بس پھر آگے بڑھی -

شمیمہ نے باہر نظر دوڑائی اور رحیم بابا سے بولی "بابا کیا بس ہمارے گھر کی طرف نہیں جائے گی -؟"

"جائیگی بیٹا - جائیگی کیوں نہیں ؟"

"ہمارا گھر تو بہت پہلے آجاتا ہے"۔

"دیکھو تمہارے وہ ساتھی جو پیچھے بیٹھے ہیں نا ان کو اتار کر پھر ہم تمہیں بھی گھر کی طرف لے جائیں گے"۔

شمیمہ روٹھنے کے انداز میں منہ بنا کر بیٹھ گئی -

رحیم بابا اس کا روٹھنا دیکھ کر بولا "آج گانا نہیں سناؤ گی بیٹی !"

وہ مسکراتی ہوئی بابا کی طرف دیکھنے لگی -

"نہیں سناؤ گی تو ہم بھی تم سے بات نہیں کرینگے"

شمیمہ چند لمحے رحیم کی طرف دیکھتی رہی - پھر آہستہ آہستہ منہ میں گنگنانے لگی "ایک چھوٹی سی گڑیا کو میں گود کھلاؤں گی"

بابا کی آنکھوں میں ایک برگزیدہ چمک جاگی اس نے گہری سانس لی -

بس اسی تیز رفتاری سے دوڑی جارہی تھی - پانچ منٹ بعد ایک اور اسٹوپیج آیا - باقی سارے بچے وہیں اتر گئے - ایک شمیمہ ہی بس میں رہ گئی تھی - یہ اکیلا پن اسے کھلنے لگا "بابا مجھے جلدی گھر لے چلو -!"

"بیٹی ہمارے گھر نہیں چلوگی ..... ؟"

"نہیں" - ایک معصوم سا انکار تھا -

"نہیں بیٹی ہم تو تمہیں اپنے گھر لے چلیں گے - وہاں ہم نے تمہارے لئے کھلونے لاکر رکھے ہیں - مٹھائی بھی لائے ہیں - !"

"ہمیں کھلونے نہیں چاہیئے - ہمارے پاس بہت سارے کھلونے ہیں"۔

"اچھا ٹھیک ہے - تم ہمارے یہاں نہیں چلوگی تو ہم تم سے پھر روٹھ جائیں گے اور کل پھر اسکول میں بس لیکر نہیں آئینگے"۔

"اچھا چلو -!" شمیمہ فورًا مان گئی -

بوڑھے رحیم کی بس پھر ایک موڑ لینے لگی - وہ بولا "بیٹی تم نے ہمیں پورا گانا نہیں سنایا .... !"

"ہم نہیں گائیں گے"

"اچھا تو لو سنو - میں تمہیں ایک گانا سناتا ہوں -

اور وہ بھونڈے سروں میں ایک لوری گانے لگا - "سوجا راجکماری سوجا ..... !"

شمیمہ کھلکھلا کر ہنس پڑی -

"میرے گانے پر ہنستی ہو بیٹی - تو لو میں نہیں گاتا !"

شمیمہ ہنسے جارہی تھی - بس فراٹے بھرتی ہوئی دوڑی چلی جارہی تھی -

بابا منہ ہی منہ میں گیت کے بول دہرانے لگا -

"تمہارا گھر کہاں ہے بابا ؟" شمیمہ کچھ گمبھیر ہو کر بولی

"بس اب ہم پہنچنے ہی والے ہیں" بابا نے بس کی رفتار اور تیز کردی -

چند منٹوں بعد بس ایک پچھڑے سے محلے میں ایک پرانے ڈھنگ کے مکان کے قریب جاکر رک گئی - رحیم بابا بس سے نیچے اترا - شمیمہ کو بھی اس نے نیچے اتار لیا - پھر وہ اسے اپنی ایک انگلی تھمائے گھر میں لے آیا -

اندر صحن میں ایک بڑھیا بیٹھی چولہا پھونک رہی تھی - آہٹ پاتے ہی اس نے دروازہ کی طرف منہ گھما کر دیکھا - رحیم بابا کے ساتھ ایک بچی دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی آگے بڑھ کر اس نے شمیمہ کو اپنی گود میں لے لیا -

شمیمہ کو سفید بالوں والی بے دانت کی بڑھیا ، بڑی عجیب سی لگی -

بڑھیا نے جھٹ سے اس کا پیار لے لیا - اور پوچھا "بیٹا ذرا اپنا نام تو بتاؤ . . . ؟"

"شمیمہ - !" وہ آہستہ سے بولی -

"تو تو میری بیٹی ہے ـــ ہے نا ؟"

"نہیں میں تمہاری بیٹی نہیں ہوں ـــ"

"نہیں نہیں تو میری بیٹی ہے" کہتے کہتے بڑھیا نے پھر اس کے گال چوم لئے -

شمیمہ اس کی گود سے اترنے کی کوشش کرنے لگی -

لیکن بڑھیا نے اسے گود سے اترنے نہیں دیا -

وہ اسے گھر کے اندر لے گئی - طاقچے میں رکھے ہوئے ایک پلیٹ میں سے کچھ بسکٹ اس نے اٹھائے اور شمیمہ کے ہاتھ میں تھما دیئے -

اس نے لے لئے -

پھر بڑھیا اسے صحن میں لے آئی - رحیم سے کہنے لگی "بڑی پیاری بچی ہے - بالکل اپنے فردوس جیسی" اور کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا -

رحیم بابا لمحہ بھر کے لئے سر جھکائے کھڑا رہا - پھر بولا "اچھا اب اسے گود سے نیچے اتارو - چلوں اسے گھر پہنچا دوں"۔

"اے ہے ! اتنی جلدی لے جاؤ گے ...... ؟" بڑھیا نے تعجب کا اظہار کیا - "مجھے اسے جی بھر کے دیکھ تو لینے دو -"

"پھر آجائے گی - ابھی تو اسکول سے آرہی ہے گھر میں لوگ اس کا انتظار کر رہے ہوں گے -"

"نہیں جی بنا کھلائے پئے کیسے جائیگی بچی - ! رہنے دو - یہ جانے کے لئے تھوڑا ہی کہہ رہی ہے ؟" بڑھیا نے پھر شمیمہ کا پیار لے لیا اور بولی - "بیٹی آج تو یہیں رہ ـــ ہمارے گھر ہی میں رہ - !"

شمیمہ کچھ پریشان سی بولی - "بابا ہمیں گھر پہنچا دو"۔

"ہاں بیٹی چلو" کہتے ہوئے رحیم بابا نے اسے اپنی گود میں لے لیا -

جب وہ گھر سے باہر نکلنے لگا تو بڑھیا کچھ پریشان سی ہو کر بولی - "ذرا ٹھہرو -"

"کیوں کیا بات ہے ؟" رحیم بابا نے پوچھا -

بڑھیا اندر کمرہ میں گئی اور لکڑی کا ایک کھلونا شمیمہ کے ہاتھ میں رکھ دیا -

شمیمہ نے کھلونا نیچے پھینک دیا -

بابا کھلونا اٹھا کر اسے دیتا ہوا بولا - "لے لو بیٹی لے لو ......"

شمیمہ ضد کرنے لگی "چلو نا بابا گھر"۔

"اچھا چلو" - کہتا ہوا وہ گھر سے اسے باہر لے آیا -

چند لمحوں بعد بس پھر ہوا سے باتیں کر رہی تھی - بابا کو شمیمہ کو اس کے گھر پہنچانے کی جلدی تھی اس لئے گاڑی خوب تیز چلا رہا تھا -

"بیٹی کیا سوچ رہی ہے - تو نے بسکٹ نہیں کھائے ؟"

"بسکٹ اچھے نہیں ہیں بابا"۔

"ٹھیک کہتی ہے تو - تیرے گھر جیسے بسکٹ ہمارے یہاں تھوڑے ہی ملیں گے - ہاں یہ تو بتا اگر تیرے ابا یہ پوچھیں کہ آج اسکول سے آنے میں دیر کیوں کردی تو تم کیا جواب دوگی"۔

شمیمہ بھولی بھالی آنکھوں سے بابا کی طرف دیکھنے لگی پھر بولی "رحیم بابا کے گھر گئی تھی"۔

"نہیں پگلی نہیں" - بابا فورًا بولا "یوں مت کہنا نہیں تو تیرے ابا بگڑ جائیں گے - ناراض ہوں گے"۔

"تب کیا کہوں گی بابا ؟"

"کہنا اسکول سے چھٹی دیر میں ہوئی"۔

"میں جھوٹ نہیں بولوں گی" بھولے پن سے وہ بولی "کیا میں تمہارے گھر نہیں گئی تھی"۔

"نہیں بیٹی ایسا مت کہنا - ورنہ تیرے ابا مجھ سے ناراض ہوجائیں گے"۔

بس تیز رفتاری سے دوڑی چلی جارہی تھی -

کچھ ہی دیر بعد وہ ایک بنگلے کے سامنے جاکھڑی ہوئی شمیمہ کے ابا بیرسٹر صاحب بڑی بے چینی سے اپنے گھر کے باغیچے میں ٹہلتے دکھائی دیئے - شاید انھیں شمیمہ ہی کا انتظار تھا - جوں ہی بچی بس سے نیچے اتری وہ آگے بڑھے اور رحیم بابا سے بولے "ڈرائیور ـــ !"

"جی حضور - جی حضور" کہتا ہوا رحیم بابا بس سے نیچے اتر آیا -

"ڈرائیور آج بچی اتنی دیر سے کیوں گھر پہنچی ہے ؟"

"جی آج ذرا دیر ہوگئی - اس لئے کہ ....."

"ابا آج ہمیں چھٹی دیر سے ہوئی" شمیمہ درمیان ہی میں بولی -

"اچھا اچھا" - بیرسٹر صاحب ہنس کر بولے -

"جا اندر جا تیری ماں انتظار کر رہی ہے"۔

شمیمہ دوڑ کر کوٹھی میں چلی گئی -

بیرسٹر صاحب رحیم بابا سے بولے - "ادھر چار چھ دنوں سے تمہیں دیکھا نہیں میاں - کہیں باہر گئے ہوئے تھے کیا"

"جی نہیں تھا تو یہیں - لیکن چھٹی لے رکھی تھی"۔

"کیوں۔؟" بڑھی دادی نے حیرت کا اظہار کیا۔
"اسے یہاں لانے کے لئے جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔"
"جھوٹ...... کیا جھوٹ؟"
"جب شمیمہ کے ابا اس سے اسکول سے دیر سے آنے کی وجہ پوچھتے ہیں تو اس غریب کو جھوٹ بولنا پڑتا ہے کہ اسکول سے چھٹی دیر میں ہوئی۔ وہ بیچاری ہماری خاطر جھوٹ کیوں بولے۔؟"
بڑھیا لاجواب ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔

رحیم بابا پریشان سا آنگن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کے کانوں میں ننھی شمیمہ کی آواز گونج رہی تھی۔ کیسا معصوم سا جھوٹ تھا "ابا آج ہمیں چھٹی دیر سے ہوئی۔"
"نہیں بیٹی نہیں، تمہیں چھٹی دیر سے نہیں ہوئی، میں تمہیں اپنے ہاں لے آیا تھا۔ فردوس سمجھ کر، لیکن فردوس کہاں؟ وہ تو دور چلی گئی ہے۔ بہت دور!۔ تم نے میرے لئے جھوٹ کیوں بولا بیٹی۔!" اس کے دل میں ایک طوفان سا مچا ہوا تھا۔ وہ بڑا پریشان تھا۔ وہ گھر سے باہر نکل آیا اور سامنے سڑک پر ہو لیا۔
وہ رفتہ رفتہ آگے بڑھنے لگا۔ سوچتا ہوا کہ بیرسٹر صاحب کے پاس جا کر انھیں سب باتیں سچ سچ بتا دینی چاہیئے۔
وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ اگر بیرسٹر صاحب نے اس سے اس کے دوبارہ آنے کی وجہ پوچھی تو وہ صاف کہدیگا۔
"حضور آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں!"
وہ پوچھیں گے۔ "کس بات کی معافی رحیم میاں"
"مجھ سے ایک غلطی سرزد ہوئی ہے حضور"۔
"کیسی غلطی۔؟"
"میری وجہ سے شمیمہ نے جھوٹ بولا ہے۔"
"جھوٹ۔ کیسا جھوٹ؟"
"دراصل بات یہ ہے حضور کہ شمیمہ کو چھٹی دیر سے نہیں ہوئی تھی۔ اسے میں اپنے یہاں لے گیا تھا تاکہ فردوس کی دادی اپنا غم بھول سکے۔"
تب......؟
بیرسٹر صاحب کا سنجیدہ چہرہ رحیم بابا کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ تب وہ ضرور اس کی اس حرکت کا برا مانیں گے۔ کہیں گے میں ان کی اجازت کے بغیر لڑکی کو اپنے گھر کیوں لے گیا۔ کیوں ایسی حرکت کی۔؟
رحیم بابا کے پاؤں آگے بڑھتے بڑھتے رک سے گئے۔ اس کی نظریں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ تاروں بھرا آسمان اسے ایسا لگا جیسے اوپر وہاں بہت سارے کھلونے بکھرے پڑے ہیں اور ننھی فردوس انھیں میں کہیں کھیل رہی ہے۔ اور بیچاری شمیمہ —! اس کی آنکھ سے آنسو ڈھلک کر اس کی داڑھی میں الجھ گیا۔

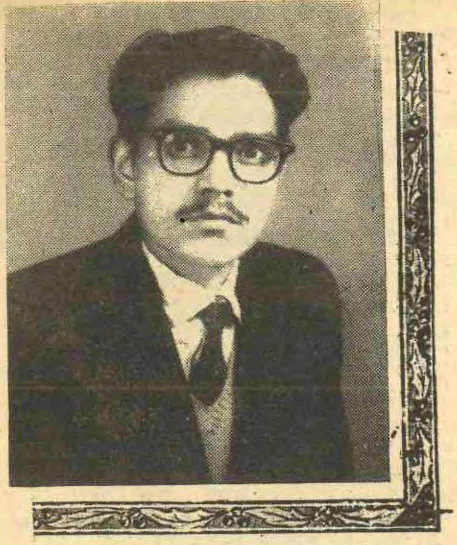
بابا کچھ اداس لہجہ میں بولا۔ "میری ایک پوتی تھی فردوس اس کا انتقال ہو گیا۔"
"بڑے افسوس کی بات ہے۔ کیا عمر تھی بچی کی؟"
"بس شمیمہ ہی کی عمر کی تھی۔ دو سال پہلے اس کی ماں مری تھی اور پچھلے برس اس کا باپ۔ ایک وہی رہ گئی تھی گھر میں وہ بھی خدا کو پیاری ہو گئی۔" بابا کا گلا بھر آیا۔
بیرسٹر صاحب بولے "خدا کی مرضی میں کس کو دخل ہے میاں صبر کرو۔"
"اب تو صبر ہی صبر ہے حضور!" پھر اس نے بیرسٹر صاحب کو سلام کیا اور وہاں سے رخصت ہوا۔
بس گیرج کی طرف چلی جا رہی تھی۔ اور وہ سوچ رہا تھا شمیمہ سے جھوٹ بلوا کر اس نے ٹھیک نہیں کیا۔ کیا تھا اگر وہ خود ہی بیرسٹر صاحب سے سچ بات کہدیتا تو وہ انھیں بتا دیتا کہ شمیمہ کو اپنے گھر لے گیا تھا۔ وہ شاید اس کا برا نہ مناتے بلکہ خوش ہوتے۔ یقیناً وہ اس سے کچھ نہ کہتے۔ ایک بچی سے جھوٹ بلوا کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ اس کا ضمیر اسے لعنت ملامت کر رہا تھا۔
بس گیرج میں چھوڑ کر، وہ کہیں اندھیرا اتر جانے کے بعد گھر پہنچا۔ اس کی بیوی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی اسے دیکھتے ہی بولی "کیا ہماری ننی فردوس کو اس کے گھر چھوڑ آئے۔"
"ہاں چھوڑ آیا۔!" رحیم بابا نے گہری سانس لی۔
"تم نے مجھے اسے جی بھر کر پیار بھی نہیں کرنے دیا"۔
"پرائے بچوں سے اتنا لاڈ جتانا ٹھیک نہیں بیگم"
بڑھیا کے چہرے پر جو اطمینان کی جھلک تھی۔ وہ اداسی میں بدل گئی۔ وہ کچھ پریشان لہجہ میں بولی۔ "کیا بچی کوئی شکایت کر رہی تھی۔؟"
"نہیں"
"تب کیا ہوا۔ اس قدر پریشان کیوں ہو....؟"
"کچھ نہیں ایسے ہی۔ چلو کھانا لگاؤ۔ میں نل سے منہ ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔" بابا خالی بالٹی اٹھا، گھر کے پچھواڑے نل پر پانی لینے چلا گیا۔
لوٹ کر آیا تو اس نے دیکھا فردوس کی دادی نے کھانا لگا دیا تھا۔ ایک بڑی پلیٹ میں روٹیاں تھیں اور دو مختصر سی پیالیوں میں دال اور سبزی۔ ان کے علاوہ ایک چھوٹی سی پلیٹ اور رکھی تھی جسمیں بسکٹ اور مٹھائیاں تھیں۔ دادی ننھی فردوس کی پلیٹ سجانا نہیں بھولتی۔ وہ بولا "آج پھر یہ مٹھائیوں والی پلیٹ یہاں رکھدی۔ اسے یہاں سے اٹھا لو۔"
بڑھیا نے پلیٹ اٹھا کر طاقچے میں رکھدی اور بابا کے قریب آ کر بیٹھتی ہوئی بولی۔ کل شمیمہ کو ذرا جلدی لاؤ گے تو میں اسے......!"
"نہیں! اب نہیں لاؤں گا اسے۔ یہاں نہیں لاؤنگا۔" بابا درمیان ہی میں بولا۔



ادیب سہیل

غزل

مرحلے کتنے ہی ہمکام سفر رہتے ہیں
قافلے جادہ کشاں شام و سحر رہتے ہیں
شہریاری کسی قیمت بھی سراہی نہ گئی
جس کی پاداش میں ہم شہر بدر رہتے ہیں
ایک جرآت کے نہ ہونیکے سبب سے ہملوگ
کس قدر تنگ دل و تنگ نظر آتے ہیں
زندگی کتنی المناک ہے ان پودوں کی
تادم زیست جو بے برگ و ثمر رہتے ہیں
چوم لیتے تھے قدم جنکے نگارِ مہتاب
اب وہی رشکِ قمر خاک بسر رہتے ہیں
پا بہ زنجیر معیشت کو جو رکھتا ہے
کاروبار اس کے سبھی دست نگر رہتے ہیں
اپنے سرمائے پہ تھا ناز بہت جن کو سہیل
فخر سے آج وہی غیر کے سر رہتے ہیں



زندگی، ادب اور ادیب

مجتبیٰ صدیق

"ماضی کے بت کو پوجنے والے شاعرو! حال کی برائیوں کو چھپانے والے ادیبوں اور مستقبل پر تاریکی کا پردہ ڈالنے والے افسانہ نگارو ہٹ جاؤ ورنہ تاریخ تمہیں مٹا دے گی!" ——— گورکی

ادب کی تخلیق و تاریخ کسی دور میں بھی ترقی پسند رجحانات سے خالی نہیں رہی۔ اس کے ارتقاء کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ زندگی کی لامتناہی جدوجہد کے ساتھ ادب بھی ترقی پذیر میلانات کو اپنانے کے لئے ایک سعئ مسلسل کرتا رہا۔ اسے ترقی پسندی کی منزل پر پہونچنے کے لئے زندگی آمیز شعور اور ترقی پذیر خصوصیات کے متعدد مراحل سے گذرنا پڑا ادب کی تاریخ میں ایسی بے شمار تحریکیں پیدا ہوئیں جنھوں نے مختلف راہوں کو ملاکر ایک نئی شاہراہ بنائی۔ جس نے ادب کے فن اور موضوع میں گوناگوں تبدیلیاں پیدا کرکے اسے زندگی سے قریب تر کرنے کی کوشش کی۔ دنیا کے ہر ملک اور ہر قوم کی تاریخ میں وہ دور آیا ہے جب وہاں کے عوام و خواص نے چند اصلاحات کی ضرورت محسوس کی اور اس طرح معاشرے پر اثرانداز ہونے والی خرابیوں کے ازالے کی کوشش کی۔ انھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں مثلاً سیاست، مذہب، معاشرت، تعلیم، صنعت و حرفت تجارت [illegible] زراعت وغیرہ میں مناسب اصلاحات کیں اس [illegible] بوت [illegible] وقت سے ملتا ہے جب [illegible] سے اس کائنات کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ ادب مصوری اور سنگ تراشی نے حیات کی ترجمانی اور انسانی فکر و نظر کی آئینہ داری کرتے ہوئے ان اصلاحوں کو اپنے دامن میں جگہ دی۔

ترقی پسند ادب کی بنیادیں ماضی کی اصلاحی قدروں پر قائم ہوئیں۔ وہ ماضی کو واپس بلانے کا قائل نہیں۔ بلکہ ماضی اور حال کے لازمی تسلسل کو اپنے دامن میں جگہ دیتا ہے۔ علی سردار جعفری لکھتے ہیں۔

"ماضی کی شاندار روایات اور اس کے تہذیبی اور تمدنی آثار کی حیثیت ان جڑوں کی سی ہے جن سے ترقی پسندی کی کونپلیں پھوٹتی ہیں اور پھول کھلتے ہیں۔ ہم ان جڑوں کو نہیں کاٹ سکتے ایک انسان یا ایک نسل کی عمر اتنی مختصر ہوتی ہے کہ صرف اس کے تجربات پر ترقی کا کوئی امکان نہیں ہے۔"

تغیرات عالم کے سبب انسانی زندگی مختلف طبقاتی نظام میں تقسیم ہوگئی ہے۔ فطرت انسانی کا مشاہدہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ کائنات کا ہیولیٰ ایک ایسے متوازن طریقے پر تشکیل پایا ہے جس کا مخزن ایک [illegible] جون منت ہے۔ باوجود زمان و مکان کی تبدیلیوں کے جن سے تاریخ عالم کو دوچار ہونا پڑا۔ انسان اور اسکی فطرت میں ایک ایسی متناسب و ترتیبی قوت ہے جو خوشحال زندگی کے استحکام و دفاع کی پوری کوشش کرتی ہے۔ ترقی پسند ادب زندگی کی ترتیبی قوت اور استحکام، اس کی وحدت اور حقیقت کو پیش کرتا ہے۔ سید احتشام حسین نے کہا ہے کہ:-

"ادب نام ہے مختلف چیزوں میں کوئی مرکزی مناسبت تلاش کرکے متحد کرنے کا۔"

ترقی پسند ادب فطرت و انسانیت کی استحکامی اور ٹھوس قدروں کی آئینہ داری کرتا ہے وہ کائنات کے ان حقائق کے چہروں سے نقاب اٹھا دینا چاہتا ہے جو طبقات کے مغالطے میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ ترقی پسند ادیب قدامت پرستی اور رجعت پسندی کے شکار نہیں۔ ان کے یہاں سرمایہ دارانہ نظام اور ناہموار اقتصادی ضابطے کی پیدا کردہ ہیئت پرستی، قسمت پرستی اور رہبانیت کا گذر نہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ استعماریت اور سامراجی اقوام کی پیدا کردہ مکروہ عریانیت اور عوام دشمن کلچر کے دوغلے پن کو بھی اپنانے کے لئے تیار نہیں۔ وہ زندگی کی مادی اور توانا قدروں کو لے کر آگے بڑھتے ہیں۔ وہ حقائق سے بھاگتے نہیں بلکہ اسباب و علل کی تابناک روشنی میں اس سے مقابلے کی کوشش کرتے ہیں۔ انسانیت اپنی فطری و طبعی صلاحیتوں کے سبب ازل سے خوشحال اور پرامن زندگی کی خواہاں رہی ہے اور آج تو بین الاقوامی ضرورتوں کے پیش نظر اسکی اس خواہش نے اور شدت و اہمیت اختیار کرلی ہے۔ اتحاد اور یگانگت کیونکہ بنیادی طور پر انسان کی سماجی جبلت ہے اس لئے عوامی زندگی کا قدیم دور بھی عوامی اور سماجی بنیادوں پر صحیح و صالح ادب کے وجود سے خالی نہیں۔

ادب کی صحیح تخلیق اپنی جگہ نہ صرف ایک تاریخی حادثہ ہوتی ہے بلکہ ایک روشن حقیقت، واضح واقعہ اور مقدس فریضہ بھی اس سے زندگی کے لئے بہت کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ نئے خیالات، صرف نئے حالات اور نئے واقعات سے ہی پیدا ہوا کرتے ہیں اور ہر نیا واقعہ زندگی کے لئے ایک حقیقی تجربہ ہوتا ہے تاریخ نے جہاں جہاں اپنی نئی منزلوں کا تعین کیا۔ وہاں وہاں ادب کا سنگ میل نصب ہوتا گیا۔ انسانی زندگیوں کی انفرادی، اجتماعی، معاشی اور سیاسی تبدیلیوں سے ہمیشہ افکار و اسالیب میں پہلے سے مختلف قسم کے نقوش پیدا کئے لیکن پھر بھی قدیم تاریخ کو کچھ اس طرح مسخ شدہ صورت میں پیش کیا جاتا رہا ہے کہ وہ محض بادشاہوں کا قصہ ہوکر رہ گئی اور عوام کی زندگی کی مکمل و مجمل عکاسی نہیں کرسکی مگر ترقی پسند ادب وقت

وماحول کی تجربہ گاہ میں پیدا ہوا اور انسان کی خود نوشتہ سرگذشت بن کر تاریخ عالم کی کم نظری اور سطحیت پسندی کا منہ چڑاتا رہا۔

ترقی پسند افکار و عناصر کے منتشر اجزا کی شیرازہ بندی ترقی پسند ادیب کی مرہونِ منت ہوتی ہے

ایک ترقی پسند ادیب کو بادشاہوں جاگیرداروں اور سامراج کی سرپرستی میں پیدا ہونے والا ادب مصنوعی ہونے کے سبب اتنا متاثر نہیں کرتا جتنا وہ ادب جو لوک گیت اور کہانیوں کی شکل میں محنت کشوں اور کسانوں کے طبقوں میں پیدا ہوا کیونکہ وہی ادب صحیح معنوں میں عوامی زندگی کے دکھ درد اور مسرتوں کا نمائندہ رفیق و ترجمان ہے

بین الاقوامی کشمکش اور طبقاتی تضاد نے دنیا کے حالات کو اس قدر بدل دیا ہے کہ قدیم نظام فکر کی قیمت آج کے رائج الوقت سکوں میں گھٹتی جارہی ہے آج دنیا کی اکثریت کی آبادی میں ایک نئے انداز سے سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوچکی ہے کیونکہ اب وہ محض جینے کی خواہش مند نہیں بلکہ زندگی کو زندگی کے طور پر بسر کرنا چاہتی ہے جس طرح انسان نے مختلف راہوں سے گذر کر ایک زندگی آمیز شاہراہ پر قدم رکھا اسی طرح مختلف تجربوں کے بعد جدید تخیلات کو بروئے کار لانے کے لئے ایک نظریہ کی بنا رکھی یہ نظریہ اس کا اپنا نظریہ ہے اس میں کسی تخصیص اور عصبیت کو دخل نہیں اس کے وسائل لامحدود ہیں اور ماخذ زندگی کے حقائق میں پیوست ہیں۔ ترقی پسند ادب کا دامن اتنا وسیع ہے اور اس میں اتنی عالمگیر صلاحیتیں موجود ہیں کہ اس سے ہر قسم کی آسودگی اور خوشحالی حاصل کی جاسکتی ہے۔ جو چیز ضروریات کی تکمیل میں معاون ثابت ہو اور حال اور مستقبل کو خوش آئند بنائے اسکی قبولیت سے انکار کرنا وقت کے دھارے کو منجمد سمجھنے کے مترادف ہے انسانیت کی بھلائی کا تقاضہ ہے کہ جب کوئی رجحان یا نظریہ زندگی میں داخل ہوجائے تو اس سے ہم کناری اور فائدہ اٹھانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم طبقاتی برتری کو ختم کرکے دنیا سے نامنصفانہ عناصر کو مٹا دیں۔ نئے خیالات سے روگردانی کرکے پرانی اقدار سے لپٹے رہنا دراصل زندگی کو ناقابل حرکت تسلیم کرنے کے سنگین اور احمقانہ جرم کا مرتکب ہونا ہے بالفاظ دیگر اس طرح بذات خود اپنے ہی پروانۂ موت پر دستخط کرکے سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام اور اس کے مظالم کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اپنے اوپر برقرار رکھنا ہے۔ آج قدیم افکار و عناصر کا ٹکراؤ سائنسی اقدار سے ہے۔ اگر ہمیں زندگی عزیز ہے، جیسا کہ یقیناً ہے تو ہمیں عہد قدیم کی ہر روایت اور ہر فلسفے کو نئے سانچوں میں ڈھالنا ہی پڑے گا۔ ترقی پسند ادب تقلید محض کا قائل نہیں۔ تقلید محض نے انسان کے جذبۂ عمل کو کند اور نقطۂ نظر کو متعصب بنا دیا ہے۔ لہٰذا ترقی پسند ادیب ان خیالات و اقدار کی نفی کرتا ہے جو اندھی تقلید کے پیدا کردہ ہیں۔ وہ استدلال اور تجزیئے کی روشنی میں ان زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے جو رنگ ونسل، خاندان و قومیت، رسم و رواج، عقائد و توارث اور انفرادیت و معاشرت کو پہنا دی گئی ہیں۔ ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں۔

"انسان کی دماغی ترقی کی راہ
میں سب سے بڑی روک اُس
کے تقلیدی عقائد ہیں اسے کوئی
طاقت اس طرح جکڑ بند نہیں
کرسکتی جسطرح تقلیدی عقائد کی
زنجیریں کردیا کرتی ہیں۔"

ممکن ہے فنی لحاظ سے ترقی پسند ادب کی کوئی جامع تولف کی جائے اسے دوسرے لفظوں میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی تخلیق زندگی کی آئینہ داری کرے، اس میں خلوص و محبت ہو، اتحاد و یگانگت کا پیام ہو۔ اس میں کھلے اور چھپے دشمنوں کو للکارنے کا انداز ہو، کشمکش اور عمل کا درس دے، جس میں تغیر و تبدل سے ہمکناری کا جذبہ ہو، دل سے دل کی بات کہنے والا انسانی لہجہ ہو حرکت و عمل کا درس دے، رہبر کی حیثیت سے زندگی کی مادی اور توانا قدروں کو ابھار کر آگے بڑھائے خوش حالی جس کا نصب العین ہو۔ زندگی کی تفسیر بھی ہو اور تنقید بھی اس کا شمار یقیناً ترقی پسند ادب میں ہوگا اس وقت دنیا کے حالات پر ذرا تفصیلی نظر ڈالی جائے تو صاف پتہ چلے گا کہ انقلاب فرانس کے بعد فرانس نے ساری دنیا پہ چھا جانے کی کوشش کی پھر برطانیہ پر اپنی نوآبادی میں سورج کو غروب نہ ہونے دینے کا بھوت سوار رہا اور آج امریکہ اپنا ستارہ عروج چمکانے پر تلا بیٹھا ہے۔ دوسری جنگ عظیم نے تقریباً سبھی ممالک کی سیاسی و معاشی حالت کو متغیر کردیا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر امریکہ ساری دنیا پہ اپنا تسلط جمانے کی کوشش کررہا ہے۔ اس نے پس ماندہ ممالک کو امداد دینے کا ایک "آزاد بلاک" قائم کرنے کا ڈھونگ رچایا۔ اسکی فوجی طاقت اور ڈالر کی کثرت امن اور معاشی توازن کے منافی ہے امریکہ کے طرز عمل سے یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ اس کے اغراض کے پس پردہ معاشی و تجارتی تسلط ہے۔ آج جبکہ دنیا واضح طور پر سرمایہ دارانہ اور غیر سرمایہ دارانہ —— دو طبقاتی نظام کی چکی میں پس رہی ہے ہمارے لئے یہ قطعی ناممکن ہوگیا ہے کہ ہم اس بین الاقوامی دور میں قطعی غیر جانبدار رہنے کی ناکام کوشش کریں۔ انسانی معاشرہ کی تقسیم کچھ ایسی ہی ہوگئی ہے، ہمیں اس غرض ہے، ہمیں اس سے دلچسپی ہے کہ ہم خود اپنے متعلق بھی یہ فیصلہ کرلیں کہ ہمیں کس طرف ہونا چاہیئے۔ ۱۹۳۶ء کے منشور کے یہ الفاظ اس مرحلے پر قابل ذکر ہیں۔

"انسانیت کے نام پر ہم پوچھتے ہیں کہ آج جب ترقی و پستی کی طاقتوں میں فیصلہ کن جنگ شروع ہوچکی ہے۔ ادیب اپنے آپ کو غیر جانبدار رکھ سکتا ہے؟ حسن اور آرٹ وغیرہ کی نقاب پہن کر وہ کارزارِ حیات سے راہ فرار اختیار کرسکتا ہے؟ کیا وہ واقع نگاری کی فصیل پر بیٹھ کر انقلاب و رجعت کی تصویر لے سکتا ہے —؟"

حالات اور واقعات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام جسے چند سیاسی طاقتوں اور صنعتی و معاشی ڈالروں کی پشت پناہی حاصل ہے زندگی کا مکمل اور صحیح ضابطہ نہیں۔ یہ نظام جو آج اپنی زندگی کے آخری ایام اکھڑی سانسوں سے پورے کررہا ہے ایک جامع حیثیت سے عوامی احساسات کا بدترین دشمن ثابت ہوچکا ہے آج راسخ العقیدہ ادیبوں اور مفکروں کی عالمگیر کوشش یہی ہے کہ کائنات، حیات اور تمدن کی شاہراہوں پہ جہاں جہاں سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام کی پھپھوند جمی ہوئی ہے اسے حتی الامکان صاف کیا جائے یہ کوئی سیاسی یا جماعتی پروپیگنڈہ نہیں بلکہ انسانیت کا احترام، زندگی کے لئے ایک اساسی و اجتماعی نظام کا قیام اور ارتقا کا سائنسی اور آزادی و جمہوریت کا ایک وسیع تر مفہوم ہے۔ وقت و زمانہ کی مسلسل و مستقل حرکت کے سبب کسی نظام کے درہم برہم ہونے سے اور معاشرے کی سالہا سال کی قائم شدہ بنیادوں کے اکھڑنے سے جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور حیات نے سکرات کی جو صورت اختیار کرلی ہے ظاہر ہے زندگی کے احساسات اس سے متاثر ہوں گے، اور یہی تاثرات تبادلۂ خیال کے ساتھ پروان چڑھ کر ادب میں ایک واضح شکل و ہیئت اختیار کرلیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ زندگی کے مخصوص و منتخب حقائق کو بیان کرکے صرف اپنے محدود نقطۂ نظر کو سراہنا ادبی دیانت داری کے اصول کے منافی ہے۔ یہ ترقی پسندوں کا شیوہ نہیں۔ ادب زندگی کی زیادہ جامع تصویر ہوتا ہے ایک ادیب کا فرض ہے کہ وہ زندگی کی مکمل طور سے آئینہ داری کرے چند گوشوں کو اجاگر کرنا اور چند پہلوؤں کو ترک کردینا فن کو ادھورا چھوڑ دینے کے برابر ہے۔ فیض احمد فیض نے کہا ہے۔

"ایک ترقی پسند ادیب سماجی حقیقت کو
بہ حیثیت مجموعی دیکھتا ہے، اور اس کے
کسی ایک پہلو میں الجھ کر نہیں رہ جاتا۔"

درباروں کے اختتام اور کارخانوں کے قائم ہونے نے انسان کی آمدنی اور ضروریات زندگی کو محنت و جفاکشی کا لازم قرار دیا۔ پرانی زندگی منوں مٹی کے نیچے دب گئی اور ایک نئی زندگی نے جنم لیا۔

ترقی پسند ادیبوں کی اس ذہنیت اور نظریہ نے قدامت پرست، استعماریت اور سرمایہ داروں و جاگیرداروں کی دنیا میں ایک ہلچل پیدا کردی۔ ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہوئی کچھ تو محض اعتراض تھے۔ مگر بعض ایسے بھی

تھے جن پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت تھی جن پر غور کرکے صحیح نتائج بھی اخذ کئے گئے ہیں یہاں ہر اعتراض کو گنوانا۔ یا اس کے جوابات دینا نہیں چاہتا، کیوں کہ یہ کوئی ترقی پسند طریقہ نہیں۔ جیساکہ لینن نے کہا ہے:۔

"ایک احمق آدمی بھی اتنے سوال کر سکتا ہے جن کا جواب دینا دس عاقلوں کیلئے مشکل ہو۔"

ہمارے سامنے تو ایک کارِ عظیم ہے جسے انجام تک پہونچانا ہے سرگرمی صداقت، تنظیم، عمل اور بے باکی کی ضرورت ہے قدامت پرستی اور استبداد کے خلاف جو محاذ قائم کیا گیا ہے ہر حال، میں برقرار رکھنا ہے۔ گورکی نے کہا ہے:۔

"تنقید انسان کا حق ہے۔"

سرمایہ دارانہ نظام نے انسان کو ایک جانور کی حیثیت دیدی ہے اس مفروضے کو طرح طرح سے حقیقت کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی۔ بڑے غور و فکر کے بعد یہ ثابت کیا گیا کہ انسان ایک سماجی جانور ہے اس پرانی بحث ہوئی کہ بالآخر اسے تسلیم کر لیا گیا۔ اس نظریہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے یہ سراسر بے بنیاد ہے شروع شروع جب سماج کی تنظیم ہوئی تو سماجی اقتدار ایک محدود طبقے میں سمٹ گیا۔ اس طبقے نے دوسروں کو غلام بنا کر اپنے مفاد اور اپنے خیال کے مطابق ان کے سماجی میلانات کو بدل دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثریت بھی اقلیت کے نقطۂ نظر سے سوچنے سمجھنے پر مجبور ہو گئی۔ تجرباتی طور پر اس اصلیت کو اجاگر کیا گیا کہ اگر ایک آدمی انسانوں کی بستی سے الگ تھلگ ابتدا ہی سے کسی ویرانے یا غار میں زندگی بسر کرے تو اسکی خصلتیں جانوروں جیسی ہو جائیں گی مطلب یہ کہ آدمی بنیادی طور سے تو جانور ہے۔ رہا یہ کہ اس میں جو کچھ انسانی خصلتیں نظر آتی ہیں یہ اس کی اپنی نہیں بلکہ سماج اور معاشرے کی ودیعت کردہ ہیں۔ ترقی پسند نقطۂ نگاہ سے یہ خیال بالکل باطل ہے حقیقت یہ ہے کہ آدمی باطنی طور سے نہایت نیک سیرت اور معصوم فطرت واقع ہوا ہے۔ وہ پیدائشی طور سے انسان ہے، اسکی جبلت، خصلت اور فطرت میں کوئی توحش نہیں۔ اس کی داخلیت نہایت ہی پاکیزہ اور صاف ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں چونکہ ایک انسان پر دوسرے انسان کو ظلم و ستم روا رکھنے کے مواقع زیادہ حاصل ہوتے ہیں۔ لہٰذا انسان کی خصلت میں ظلم و ستم اور کشت و خون، موجود ہے یہ کتنا بڑا دھوکا اور کتنا مہلک فریب ہے کہ انسان کو اس کے بنیادی حق یعنی انسانیت سے بے نیاز کر دیا گیا سالہا سال سے انسان انسانیت کے جس نظریہ سے محروم تھا آج ترقی پسند خیالات نے اس نظریہ کو علم و عمل اور فکر و حرکت کی شاہراہ پر گامزن کر دیا۔ ممکن ہے انسان اپنے ارتقاء کے دور میں حیوانیت کی کسی منزل سے گذرا ہو کیونکہ اصل الانواع کے نظریہ پر ابھی تک کوئی فیصلہ کن بات نہیں ہوئی، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ انسان میں توحش کے خصائل موجود ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کا انحصار محض حالات اور واقعات پر ہے جن سے آدمی کا سابقہ پڑتا ہے کہ وہ اسے توحش پر مجبور کریں یا اس کے ذوقِ طبع کو مدنیت کی جانب پھیر دیں ترقی پسند نظریہ انسان کے توحش کو خارجی حیثیت دیتا ہے، اور اس کا ذمہ دار ماحول اور زمانے کو قرار دیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ترقی پسندی کے علمبرداروں کو کسی آدمی میں حیوانیت نہیں دکھائی دیتی بلکہ ان کے نزدیک یہ سوال نہایت اہم ہے کہ آخر اسے انسانیت سے محروم کیوں تصور کیا جائے؟

اس اصول اور خیال کے تحت ترقی پسند نظریہ کا سب سے لازمی عنصر یہ قرار پایا کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو کبھی بھی کسی طریقے سے یہ موقع نہ دے جس سے اس کے جذبۂ انسانیت کو ٹھیس پہنچے!

پچھلے برسوں میں ہمارے ادب نے ترقی کی جو منزلیں طے کیں، اس سے زندگی کے نئے نظام کی آئینہ داری ہوتی ہے۔ آج کا ادب گذشتہ دور کے ادب سے بنیادی طور پر جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اس کی ترقی میں ماضی کے ادبی تجربوں سے بھرپور استفادہ کیا گیا۔ یہ استفادہ ہمارے تمدن اور سماجی اقدار کے لئے سب سے لازمی تھا۔ ہم نے۔ ابھی حال ہی میں آزادی حاصل کی ہے۔ آزادی کی جنگ جہاں سیاسی نوعیت رکھتی تھی وہاں وہ خالص تمدنی اور سماجی طریقوں پر لڑی گئی۔ جب سے انسان نے ذہنی شعور اختیار کیا ماضی سے استفادہ کرنا اس کا شیوہ رہا ہے۔ لہٰذا نئے ادب میں بھی جو تحریکیں پیدا ہوئیں خصوصیت سے ترقی پسندی کی وہ تمام ترقدیمی ادب کے ردعمل کا نتیجہ تھیں پرانی قدروں کو اچھا یا برا کہنا یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ لوگ پرانی قدروں کی اہمیت سے ناواقف نہیں لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ عصرِ قدیم کی اچھائیوں کو بیان کرنے سے زیادہ نئے نقطۂ نظر سے اپنانے کی کوشش کی جائے۔ موجودہ زندگی جن کٹھنائیوں سے گذر رہی ہے اس کا تقاضہ ہے کہ فکر و عمل میں نئے تجربات کئے جائیں اور ایک خوش گوار اور اقبال مند مستقبل کیلئے ماضی کی بنیادوں پر نئے قلعوں کی تعمیر کیلئے ہمارے ادیبوں نے زندگی کی ترجمانی میں معاشرے کے تقریباً ہر اچھے برے پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ادب کا کام صرف زندگی کی آئینہ داری کرنا نہیں بلکہ اسباب و علل کی روشنی میں اصلاح و ترمیم اور تغیر و ترقی کی راہیں دکھلانا ہے۔ اسے زندگی کے اجتہاد کا ترجمان ہونا چاہیئے زندگی ہر زمانے اور ہر دور میں اجتہاد کو اپنے دامن میں جگہ دیتی رہی ہے۔ اور آج بین الاقوامی دور میں اس انقلابی ضرورت نے اور شدت اختیار کر لی ہے لہٰذا اب صرف آئینہ داری سے کام نہیں چلے گا بلکہ مستقبل کے لئے تعمیری اعمال اور مقاصد کو اپنانا پڑے گا۔ ہماری آزاد قوم کا اپنے ادیبوں سے یہی مطالبہ ہے کہ وہ انھیں زندگی کی دوڑ میں قیادت کی شمع دکھائیں اور انھیں اپنے اس فرض سے عہدہ برآ ہونا ہی پڑے گا۔ ❖



واحد پریمی

غزل

آج پھر سرِ مقتل دیکے خود لہو ہم نے
تیغِ دستِ قاتل کی رکھ لی آبرو ہم نے

جانِ غنچہ و لالہ روحِ رنگ و بو ہم نے
آپکو بنایا ہے کتنا خوب رو ہم نے

جب بھی لطفِ ساقی میں فرق آتے دیکھا ہے
بڑھکے توڑ ڈالے ہیں ساغر و سبو ہم نے

بارہا زبانوں پر لگ گئی ہے پابندی
بارہا نگاہوں سے کی ہے گفتگو ہم نے

راہِ شوق میں اکثر وہ بھی وقت آیا ہے
جب کیا ہے ہاتھوں سے خونِ آرزو ہم نے

بزمِ غنچہ و گل میں قلبِ ماہ و انجم میں
کتنی مرتبہ کی ہے اُنکی جستجو ہم نے

شہر ہو بیاباں ہو دار ہو کہ زنداں ہو
نغمے زندگانی کے گائے چار سُو ہم نے

پھولوں کی طلب میں جو چاک چاک تھا دامن
واحدؔ اس کو کانٹوں سے کر لیا رفو ہم نے

دردانہ اختر





اجنبی شام

کبھی کبھی اس خاکستری بلڈنگ کی بالائی منزل سے اسکی آواز سنائی دیتی - کبھی کبھی اسکو جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی وہ بلڈنگ کے چوکیدار فضل بھائی کو آواز دیتا - زیادہ تر اسکے کمرہ میں خاموشی ہی رہتی - یہ انسانی فطرت ہے جہاں راز جیسی کوئی چیز نظر آئے - چاہے وہ انسان ہی کیوں نہ ہو تجسّس، اضطراب پیدا ہو جاتا ہے - میں بھی اکثر سوچا کرتی آخر یہ کونسی پر اسرار شے ہے جو خود کو سارے جہان سے چھپائے رہتی ہے - شاید کوئی آسمانی شے ہے جو بھیس بدل کر انسانوں کا جائزہ لینے اس خاکستری بلڈنگ میں آگئی ہے - دن بدن میرا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا - میں نے اس کو آتے جاتے بھی کم دیکھا تھا - اسکی آنکھوں سے لگتا وہ اپنے لئے کوئی جائے پناہ تلاش کر رہا ہے مگر کہاں؟ یہ تو شاید اسکو بھی نہیں معلوم تھا - اسکی عمر کوئی زیادہ نہ تھی - ناک نقشہ بھی اچھا ہی تھا - دیکھنے میں قطعی عام سا انسان لگتا - مگر خود سے حد درجہ بیگانگی کی وجہ سے اوروں سے مختلف ضرور تھا - پاجامے پر کوٹ پہن کر جب وہ گھر سے جاتا تو مجھے ہنسی آجاتی -

یا خدا اتنی لاپروائی بھی کس کام کی جو آدمی سے کارٹون معلوم ہونے لگے - مگر وہ پھر بھی مجھے اچھا لگتا - کالج میں پڑھاتے پڑھاتے میرا دھیان بار بار اسکی طرف منتقل ہو جاتا - اور جب مس مریم جو ہماری اسٹاف ممبر تھیں اس خاکستری بلڈنگ میں شفٹ ہو گئیں تو وہاں جانے کی آرزو بہت بڑھ گئی - اب مریم بھی اسکو جاننے کے لئے خاصی پریشان ہو گئی تھی - ہم دونوں کا کالج کے بعد کا وقت اکثر ساتھ گزرتا - موضوع بھی اکثر وہی ہوتا ادھر چند دنوں سے اسکی شخصیت کچھ زیادہ ہی پر اسرار ہو گئی تھی - وہ پو پھٹتے ہی کمرہ چھوڑ دیتا - رات گئے واپس آتا - مریم کہتی تھی - اکثر وہ بڑی بے ربط باتیں خود ہی کیا کرتا ہے -

اوہ خدا انسانوں کا یہ سمندر! میری حقیقت صرف ایک قطرہ ہی کی تو ہے - پھر مجھے خود پر مان ہو بھی تو کیسے - اگر میں اس کھڑکی میں سے کود جاؤں تو میرا وجود بظاہر ختم ہو جائے گا - مگر میں ہر انسان میں موجود رہوں گا - میں جو ایک روح ہوں ایک پیاسی روح -"

مریم سے اسکی یہ باتیں سن سن کر میں اس سے خوفزدہ سی رہنے لگی تھی -

"مریم تم چاہے کچھ کہو - دیکھ لینا ایک دن میں اس سے ضرور ملونگی -"

"کس سے؟ ...." مریم کتاب سے نظر اٹھائے بغیر پوچھتی -

"اس روح سے - جو تمہارے برابر رہتی ہے -"

"تمہیں عشق ہو گیا ہے کیا؟ ..." مریم ہنس پڑتی -

"عشق .... شاید نہیں - مگر اسکی شخصیت نے مجھے مسحور ضرور کر لیا ہے -"

اور ایک دن جب میں کالج جانے کے لئے جوڑا گوندھ رہی تھی میں نے دیکھا وہ میرے کمرے کی طرف دیکھ رہا ہے ہیئر پن میرے ہاتھ سے گر گئی - گو عمر میں شاید وہ مجھ سے چھوٹا ہی ہو - پر اس کے چہرہ کے جلال اسکی آنکھوں کی گہرائیوں نے اسکو خاصا معمر

بنا دیا تھا۔ اور میں اس معمر انسان کی آنکھوں کی تاب نہ لاسکی۔ میں نے فوراً ہی کھڑکی بند کردی۔

اس روز کالج میں میرا دل قطعی نہیں لگا۔ میں مریم کے ساتھ اسکے گھر جانے کا بہانہ تلاش کرنے لگی۔

"بھئی مریم آج میں کھانا تمہارے ساتھ کھاؤنگی۔"

"کیوں؟ .... خیریت ...."

"ہاں روز روز اکیلے کھانا کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"شادی کرلو...!"

"مذاق نہ کرو مریم ...."

"مذاق نہیں میری جان۔ شادی کرلو۔ سارا تجسس ساری پریشانی دور ہوجائے گی۔"

"اور ابا کے علاج۔ نفیسہ کی شادی کے لئے روپیہ کون دے گا۔؟"

"خدا ... کیا تم کو خدا پر اعتماد نہیں۔؟"

"خدا ... تو مریم یہ خدا اوپر سے۔ آسمانوں پر سے انسانوں کے لئے کوئی من کیوں نہیں برساتا۔ وہ خدا ہے۔ وہ نور ہے۔ اپنی جگہ قائم ہے۔ ہم انسان تگنی کا ناچ ناچتے پھرتے ہیں۔ اپنے اس خدا سے کہو مریم — انسانوں کا یہ ناچ ختم کردے۔ اب آبلہ پائی برداشت نہیں ہوتی۔"

"ارے تم آج کیا بہک رہی ہو۔ کسی عذاب میں مبتلا ہوجاؤگی۔ توبہ کرو ...."

مریم کی آواز سے جیسے میں خواب سے جاگ پڑی

"ہاں سب ٹھیک ہے مریم۔ مگر کھانا آج میں تمہارے ہی ساتھ کھاؤنگی۔"

"تو چلو۔ مگر وعدہ کرو میرے سامنے اب خدا کو کچھ نہ کہوگی۔"

مجھے مریم پر رحم آگیا۔ بحث فضول تھی۔ شاید پھر وہ مجھے اپنے ساتھ بھی نہ لے جاتی۔ جانے کیوں جی چاہ رہا تھا کسی طرح خاکستری بلڈنگ میں پہنچ جاؤں۔ دوپہر خاصی گرم تھی اس کے فلیٹ کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ جی چاہنے لگا دوڑ کر اندر چلی جاؤں۔ مگر کتنی بے غیرتی ہوگی۔ بنا تعارف کسی کے گھر گھس جائیں۔ مجھے اپنے خیال پر خود ہی ہنسی آنے لگی۔

"بھئی دیکھو۔ یوں بات بے بات ہنسنا خود سے باتیں کرنا تمہارے اس جبلی ہی کو مبارک ہو۔ مگر تم ایک کالج میں پڑھاتی ہو۔ تمہارے لئے یہ مناسب نہیں۔ عشق سے مجھے نفرت ہے۔ اس لئے مجھ سے سیدھی طرح بات کرو۔"

مریم بری طرح چڑ گئی تھی۔

"ارے نہیں تم خفا ہوگئیں۔ دیکھو وہ کیسے بچوں کی طرح فرش پر پڑا سو رہا ہے۔ جیسے ابھی ابھی اسکی ماں اسکو لوری سنا کر گئی ہو۔ بس مجھے یہی سوچ کر ہنسی آگئی۔"

"تم اسکی ہر بات پر ہنسو۔ ہر بات پر رو یا کرو بڑی فرصت معلوم ہوتی ہے تمہیں۔"

مریم کے غصہ سے مجھے ڈر لگنے لگا تھا۔ میں بغیر جواب دیئے اس کے کمرہ میں چلی گئی۔ مریم کھانا لینے چلی گئی۔ میں اس کے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

یہ دو پلنگ کس لئے جبکہ سونے والا ایک ہے مریم سے پوچھونگی۔ اللہ رے فضول خرچی۔ کتنے جوتے ہیں۔ ایک میں ہوں۔ دو سال سے یہ صرف دو جوڑے خرید سکی ہوں — سوچ کا سلسلہ اور آگے بڑھتا اگر مریم کھانا لے کر نہ آجاتی۔

"بھئی مریم! یہ کھانا کون پکاتا ہے؟"

"اپنا فضل بھائی بچارا نیک آدمی ہے۔ اس نے اپنی بیوی سے کہدیا ہے وہ میرا کھانا پکا دیا کرے۔ میں ہر ماہ اسکو کچھ دے دیتی ہوں۔ بس کھانا سکون سے مل جاتا ہے۔"

ہماری بلڈنگ میں تو کوئی ایسا فضل بھائی بھی نہیں کالج سے آکر خود روٹی تھاپنی پڑتی ہے۔ جب کہیں پیٹ کا دوزخ آتشی ہوں — کھانا مزے کا تھا۔ مگر جی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ مریم سے کیسے کہتی: "مجھے اس سے ملنا ہے۔" اور کہہ بھی دیتی تو مریم بے چاری کیا کرلیتی وہ تو خود اس سے اتنی ہی بے خبر تھی جتنی میں۔ پھر وہ سو رہا تھا۔ ملاقات ہو تو کیونکر۔ میں تو عورت ہوں۔ خود جاکر کیسے کہوں۔ "مجھے آپ سے ملنے کا ارمان ہے۔" کہیں وہ میرے اس قدم کو غلط معنی نہ پہنالے۔ عورت کے ساتھ ایک ہی تو مصیبت ہے۔ سارے کام مردوں کے سے کرے۔ کمائے۔ دوسروں کو کھلائے۔ پر کسی مرد سے ملنے میں پہل نہیں کرسکتی۔ اور اگر کردے تو سوسائٹی اسکو معاف نہیں کرتی، مگر مجھے یہ سب نہیں سوچنا چاہیئے۔ وہ تو مجھ سے چھوٹا ہوگا۔ اور مجھے کوئی اس سے محبت تو نہیں اسکی باتوں سے مجھے دلچسپی ہوگئی ہے۔ اسی لئے میں اسکو قریب سے دیکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن یہ دل کیوں چاہ رہا ہے۔ میں کیوں چاہتی ہوں وہ مجھ سے بڑا ہو اور یہ اضطرابی سی کیفیت۔ خیر یہ تو ہر انسان سے پہلی مرتبہ ملنے پر ہوتی ہے۔

"کہاں ہو؟ ...."

"کہیں نہیں کہیں نہیں۔ مریم میں سوچ رہی ہوں۔ میں کالج میں لڑکیوں کو اخلاق کا درس دیتی ہوں۔ خود گر کر نیچے ہوکر نہیں سوچ سکتی۔"

"یہ سب کہنے کا مقصد۔ کیا تم اپنے خیالات پر ایک خوبصورت نقاب ڈالنا چاہتی ہو۔"

"...... مریم نہیں۔ تم کتنی عجیب ہو۔"

"خیر جاؤ اس دفعہ معاف کیا۔ آئندہ یہ لاابالی انداز کی گفتگو برداشت نہیں کیجائے گی۔"

مجھے ہنسی آگئی۔ مریم برتن اٹھاکر چلی گئی میں عمداً اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔ وہ اپنے کمرے کے باہر کھڑا تھا۔ اس نے مریم کو آتے دیکھا پھر منہ پھیر کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ اسکی محویت دیکھ کر میرا دل جلنے لگا —

احتیاط سے آگے بڑھی۔ مگر دروازے سے باہر پڑے پتھر سے ٹکرا کر گرتے گرتے سنبھلی۔

"ارے ارے .... آپ گر رہی ہیں۔"

یہ بھی اچھی رہی گر رہی ہیں گویا گرنا بھی کوئی ایسا دلچسپ کھیل ہے جو میں مستقل جاری رکھوں گی۔ مگر اسکی آواز سے پوری طرح سنبھل گئی۔ ساری فوراً سر پر ڈھانپ لی۔ وہ ایک بزرگ جوشرا۔

"جی وہ۔ گر تو رہی تھی۔ مگر آپ کی آواز نے بروقت بچالیا۔"

وہ مسکرایا.... "مگر میں نے آپ جیسی صورت کہیں دیکھی ہے۔ یہ آواز کہیں سنی ہے ...."

"کہاں؟ ...."

"اپنے بنائے ہوئے کسی مجسمے سے۔ آپ کو شاید نہیں معلوم۔ میں نے اپنے تصورات میں کتنے اجسام تراش لئے ہیں۔ جنکی صورتیں کسی کسی سے مل جاتی ہیں جنکی آوازیں مجھے دھوکہ دیجاتی ہیں۔"

"تو وہ میں ہوں" .... میں ایک عالم بے خودی میں بول پڑی۔

"نہیں وہ کوئی بھی نہیں ہے۔"

"میں آپکا مطلب نہیں سمجھی۔"

"آیئے میرے کمرے میں چلی آیئے۔ یوں کھڑا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ لوگ غلط اندازے لگا لیتے ہیں۔"

اسکی دوراندیشی نے مجھے قائل کردیا۔ پھر پہل اسکی طرف سے ہوئی تھی۔ نسوانیت کا غرور ہر جگہ حفاظت کرلیتا ہے۔ چاہے ٹھوکر لگنے سے ہی کوئی متوجہ کیوں نہ ہو پر انا کو غذا تو مل جاتی ہے۔

"وہ .... میری ساتھی ...."

"میں سمجھ گیا آپ اپنی سہیلی کی مہمان ہیں۔ جایئے ان سے کہدیجئے۔ برابر والے کمرہ میں جو صاحب رہتے ہیں انھوں نے مدعو کیا ہے۔ آپ گھبرا رہی ہیں یہ کوئی زیادہ مشکل کام نہیں۔ جایئے۔"

"ارے معلوم ہوتا تھا وہ مجھ سے چھوٹا ہے قریب سے دیکھا تو کچھ زیادہ ہی بڑا نظر آیا۔ اس کے لہجے میں ایسا تحکم تھا میں فوراً ہی اندر آگئی۔"

"کیوں ہو کر آئیں ملاقات۔"

"نہیں مریم وہ بات یہ ہے۔ وہ مجھے خود ہی بلا رہے ہیں"

"اوہ ...! میں سمجھی۔ معاملات یہاں تک آگئے ہیں مجھے بے وقوف بنایا جا رہا تھا۔"

"غلط نہ سمجھو مریم۔ میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ میں نے تو اسکو آج ہی پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔"

"خیر .. مجھ سے اجازت کی کیا ضرورت ہے۔ جاؤ میں اتنی دیر آرام بھی کرلونگی۔ کھڑے کھڑے پریکٹیکل کرانے سے بہت تھک جاتی ہوں۔ خیر تم جاؤ۔ مگر جلد ہی آجانا۔"

میری پوزیشن کتنی عجیب ہوگئی تھی۔ اس نے کہا جاؤ۔ میں فوراً اندر آگئی۔ اب مریم کے سامنے کس سعادت

منڈی سے کھڑی ہوں۔ چلی تو میرے قدم کانپ رہے تھے۔ نفیسہ، اماں، ابا کی التجا سے بھرپور آنکھیں جیسے میرا راستہ روک رہی ہیں۔ پھر وہی بے تکے خیال مجھے اس سے محبت تو نہیں۔ میرا تجسس مجھے لے جا رہا ہے میں آہستہ سے مریم کے کواڑ بھیڑ کر واپس آ گئی۔

"کیوں اجازت نہیں مل رہی تھی کیا؟"

"وہ کون ہوتی ہے اجازت دینے والی۔" میرا موڈ ایکدم خراب ہو گیا۔" وہ میری کولیگ ہے میری گارجین تو نہیں۔"

"کولیگ؟ . . . ." وہ چونک سا پڑا۔

"جی ہاں۔ میں کالج میں لیکچرار ہوں۔"

میں پھر اس سے خوفزدہ ہو گئی۔

"میں سمجھا تھا آپ پڑھتی ہیں۔ خیر آیئے اندر آ کے بیٹھیں۔ بھئی دیکھئے جی چاہے تو بیٹھ جایئے اور میرا خیال ہے کھڑے ہونے کو کسی کا جی نہیں چاہتا۔" اللہ کیسا باولا لڑکا ہے۔ باؤلا پن تو کمرے سے ظاہر ہے۔ پلنگ پر کپڑوں کا ڈھیر پھٹے پرانے کپڑے جنھیں اٹھا کر بھی نہیں رکھ سکتا۔

"کمرہ کا جائزہ بیٹھ کر بھی لیا جا سکتا ہے۔"

"میں ہڑبڑا گئی۔ اف کتنا ذہین ہے۔ دل کی بات تک جان جاتا ہے۔ میں گھبرا کر بیٹھ ہی گئی۔

"آپ کا نام؟ . . . ."

"مجھے ایکدم ہنسی آ گئی۔

"کیوں اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"یہ کوئی انٹرویو ہو رہا ہے جو اس طرح نام پوچھا جا رہا ہے ——"

"میں بات کرنے کے انداز سے ناواقف ہوں محترمہ اسی لئے تو بند رہتا ہوں کمرہ میں۔"

"آپ برا مان گئے مگر خیر نام بتائے دیتی ہوں مجھے سلمہ کہتے ہیں۔"

"تو کیا میں تمہیں سلمہ کہنے لگوں۔"

میرا جی چاہا کہہ دوں۔ اسی لئے تو یہاں تک آئی ہوں کوئی اپنایت سے پکارے۔

"نہیں اگر آپ کو اعتراض ہے تو میں زبردستی نہیں کر سکتا۔ آج تک میں نے کسی پر حق نہیں جتایا۔ اپنی ماں پر بھی نہیں۔"

"نہیں آپ شوق سے میرا نام لے سکتے ہیں۔"

"تو میں سوچ رہا ہوں سلمہ میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔"

"کہاں۔ کب؟"

"کہاں — یہ تو یاد نہیں — کب — تو برسوں پہلے —— ڈریئے نہیں . . . . جو صورت مجھے مانوس لگے — جو آواز اسی لمحہ سنی ہو — مگر ایسے لمحات صدیاں بن جایا کرتے ہیں — اور یہی لمحات سرمایہ ہوتے ہیں زندگی کا۔"

"تو کتنے لمحات اب تک صدیاں بن گئے ہونگے۔"

"ہاں ان گنت۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بولونگا تم تو کانچ کی گڑیا ہو۔ جھوٹ کی سختی برداشت نہیں کر سکتیں۔"

"لیکن آدم . . . ."

"آدم! . . . ." وہ چونک پڑا۔ مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"میرا نام آدم تو نہیں ہے۔"

"لیکن میں اگر اسی نام سے پکاروں۔"

"ٹھیک —! تم مجھے آدم ہی کہا کرو۔ ماں نے جو نام رکھا تھا اس نام کو خود سے چپکا کر میں اپنی شخصیت کو محدود نہیں کر سکتا۔ میں انسان ہوں برائی اچھائی۔ نیکی بدی۔ تم جو چاہو سمجھو۔ جو چاہو کہو — جب اماں جوان تھیں تو مصیبتوں کا احساس زیادہ نہیں ہوا۔ ساری امیدیں مجھ سے وابستہ کر لیں۔ مگر اب جب میں جوان ہوں تو اتنا ناکارہ کہ ان کے خواب پورے نہ ہوئے۔ ابا کے مرنے پر کتنے دکھ اٹھائے تمہیں کیا بتاؤں بہت دن لوگوں کے یہاں سبزیاں لا لا کر روٹی کھائی۔ اماں میرے لئے رات دن کام کرتیں ان کے بالوں کی سیاہی بھک بھک اڑ رہی تھی۔ آنکھوں کا سونا پگھل پگھل کر ان کے سارے وجود کو زرد کئے دے رہا تھا۔ مگر میں — دیکھ رہا تھا۔ یہ زردی میرا وجود بھسم کئے دے رہی ہے۔ اسی لئے میں یہاں میلوں دور آ گیا ہوں۔ میرا کوئی عزیز ماں کے علاوہ ہے . . . بخدا مجھے معلوم نہیں — اب میں یہاں آ گیا تو اماں کو تنہائی کا عذاب ستانے لگا اسی لئے وہ کسی کے ساتھ رہنے لگیں۔ یہ تنہائی بھی کیا چیز ہے۔ آدمی کو چاٹ جاتی ہے۔ کیا تمہیں یہ سب محسوس نہیں ہوتا۔"

"مجھے . . . . . مجھ سے کہہ رہے ہو۔" میں جیسے سوتے سوتے جاگ پڑی۔

"کیوں کہیں چلی گئی تھیں۔"

"آپ کی باتیں سن رہی ہوں۔ سوچ رہی ہوں سارے انسان ایک جیسے درد میں مبتلا ہیں۔"

"میں تمہیں بتا دوں سلمہ خدا انسانوں کا امتحان اس لئے لیتا ہے کہ یہ دکھ کے مارے انسان زیادہ پرخلوص ہو کر خدا کی ذات کا پرچار کریں۔ اگر یہ مصائب نہ ہوں تو خدا کو کون یاد کرے۔ اور تم تو جانتی ہو پس پردہ ہونا کون چاہتا ہے۔"

"ہاں شاید یہ ایک حقیقت ہے آدم۔ مگر کیا ضروری ہے کہ ہر حقیقت صاف صاف بیان کر دی جائے۔"

"ہاں — ہر حقیقت صاف صاف بیان کر دینی چاہیئے۔ یوں دل کا بوجھ کچھ کم ہو جاتا ہے — تو سنو! راحیلہ کا مجھ سے جدا ہونا اور میرا زندہ رہنا بھی ایک حقیقت ہے۔ دیکھ لو میں آج بھی زندہ ہوں۔ اور راحیلہ دو بچوں کی ماں بن گئی ہے۔"

"راحیلہ؟ . . . . کون راحیلہ — کوئی ہستی اور بھی تھی۔"

"تھی نہیں سلمہ — راحیلہ آج بھی ہے"

"تو کیا آپ اس سے محبت کرتے ہیں۔"

وہ ہنس پڑا۔ "تمہارا لہجہ اتنا اداس کیوں ہو گیا۔"

میں بری طرح جھینپ گئی — وہ تو میرے لہجے کی ویرانی تک بھانپ گیا۔ کیا سوچا ہوگا — پر مجھے ڈرنا کیسا۔ مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔ وقت گزارنے کے لئے ساتھی مل گیا۔

"ڈرو نہیں سلمہ راحیلہ چلی گئی۔ اب اس کا ایک دھندلا سا تصور میرے پاس رہ گیا ہے۔ تم فکر نہ کرو آجکل تو میں صرف تم سے محبت کر رہا ہوں۔ تم تو جانتی ہو جو چیز قریب ہوتی ہے اپنی ہوتی ہے۔ جو دسترس سے باہر ہو اس کے لئے پچھتاوا بیکار ہے۔"

"لیکن آدم تم یہ کیا کہہ رہے ہو کہ آجکل تم مجھ سے محبت کر رہے ہو . . . . مجھ سے . . . ." میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔

"کیوں تمہیں حیرت ہوئی — بہت دن ہوئے ایک روز جب تم شاید کالج جانے کے لئے جوڑا گوندھ رہی تھیں میں نے تمہیں دیکھا۔ چہروں پر جو دکھوں کی چھاپ ہوتی ہے۔ وہ میں فوراً بھانپ لیتا ہوں۔ تمہیں دیکھتے ہی میں نے سوچا۔ یہ مضمحل سی افسردہ پریشان حال لڑکی شاید راحیلہ نہ ہو — میں سچ کہہ رہا ہوں۔ راحیلہ بھی یونہی تھی۔ تمہاری ہی طرح پریشان رہتی۔ دانۂ گندم کے حصول کے لئے سرگرداں پریشان سی لڑکی۔ پر کیا ہوا جب کوئی اور آدم اسکو ہاتھ پکڑ کر ویرانی و وحشت سے دور روشنیوں کے جزیرے کی طرف لے گیا تو اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ چلتی ہی چلی گئی۔ جیسے وہ اسی لئے پیدا ہوئی تھی کہ کوئی آئے اور اسے اٹھا کر لے جائے تو یقین جانو سلمہ میں بہت دن سوچتا رہا۔ اس شخص کو مجھ سے زیادہ اسکی ضرورت ہے اور جب کوئی چیز ضرورت بن جائے تو اس کو چھوڑا بھی تو نہیں جا سکتا میں نے چند لمحوں اس کو جاتے دیکھا پھر تیزی سے مڑ کر اپنے مقام کی طرف چلنے لگا۔ راحیلہ پھر ملی تو کہنے لگی۔

"یقین کرو تم سے الگ بہت دن اداس رہی — کھوئی کھوئی رہی۔ اور ایک مقام خود فراموشی کا بھی آیا۔ میں تمہیں کچھ کچھ بھولنے لگی اور جب زندگی کا یہ اٹل اصول سامنے آیا کہ دو سے تین ہو جاتے ہیں تو میں تمہیں بالکل بھول گئی۔ اب میں ماں ہوں سب کے لئے ماں قابل احترام ہوتی ہے۔"

"وہ سمجھتی تھی میں یہ سن کر اداس ہو جاؤنگا۔ مگر مجھے تو ہنسی آ گئی۔ کتنی احمق ہے راحیلہ اگر یہ سلسلہ یوں نہ چلے تو نئے نئے آدم نئی نئی راحیلیں کہاں سے آئیں۔ اگر یہ یوں نہ ہو تو یہ رومانس یہ ذرا ذرا سی مسرتیں تلاش سے

بھی نہ ملیں۔ اب تم ہو ہو سکتا ہے ہمارا مقدر یہ ہو کہ ہم دونوں ملکر کسی تیسرے کو تخلیق کریں۔ جس میں ہم دونوں اپنا سارا درد بھر دیں۔ اپنی ساری بیچارگیاں سمو دیں۔"

"آدم خدارا تم خاموش رہا کرو..... یہ نہیں ہو سکتا۔ میں ابا کے علاج کے لئے روپیہ کما رہی ہوں۔ ابا جی کو خون تھوکتے تھوکتے برسہا برس گزر گئے جنھوں نے ساری پونجی میری تعلیم پر صرف اس لئے اٹھا دی کہ میں انکے بڑھاپے اور بیماری میں ڈھال بن جاؤں گی اماں نے راتوں کو جاگ کر میری کامیابی کے لئے اس لئے دعائیں کی تھیں کہ ان کو دو وقت کی روٹی سکون سے مل جائے اور نفیسہ اس نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔ وہ گھر سے کبھی باہر نہیں نکلی۔ وہ کہتی ہے۔

"بجیا اب گھر میں مقید نہیں رہا جاتا۔ میرے لئے تو یہ وسیع دنیا قید خانہ بن گئی ہے۔"

"آدم میں نے اس سے وعدہ کیا ہے۔ تو غریب کی اولاد سہی یہ تیری بجیا تجھے سونے چاندی میں لاد کر کسی حسین دنیا میں چھوڑ آئے گی جہاں تو دنیا کو قید خانہ نہیں لالہ زار سمجھا کرے گی۔ مگر یہ کب ہوگا۔ ایک ایک پائی جوڑ رہی ہوں پھر بھی وہ لوگ ابھی تیار نہیں جنکو نہ جانے کیا کیا سبز باغ دکھا کر نفیسہ کے لئے آمادہ کیا تھا۔ جانے کتنے دن لگیں۔ شاید کبھی وہ اپنے نئے گھر نہ جا سکے۔ میری بھی خواہشات ہیں آدم۔"

"تمہاری..... کہہ تو رہا ہوں...."

"اوہ معاف کرنا میں غلط کہہ گئی۔ زبان بہکنے لگی ہے۔ میں تو ابا جی کا لڑکا ہوں اماں جی کے بڑھاپے کا سہارا ہوں۔ میں اتنے جلدی دل نہیں چھوڑ سکتی۔"

میں بولتی رہی وہ سر جھکائے سگریٹ پیتا رہا اور میں تو جیسے اس کے لئے وقف ہو گئی تھی۔ ابا جی کا خط آیا۔

"خط بھیجنے میں دیر ہونے لگی ہے۔ کیا بات ہے؟ گر سلمہ تم میری لڑکی نہیں لڑکا ہو۔ خبردار احتیاط لازمی ہے"

خط پڑھ کر میں نے طے کر لیا ہے اب آدم سے نہیں ملونگی۔ رات کو میں نے خواب دیکھا ابا جی نے سیروں خون ڈالا ہے۔ اماں کے بال سفید چاندی سے ہو رہے ہیں نفیسہ موتیا کے پودے کے پاس بیٹھی رو رہی ہے اور میں آدم کے ساتھ بھاگی جا رہی ہوں۔

"آج کالج نہیں جاؤ گی یہ لو میری درخواست۔" مریم مجھے جھنجوڑ رہی تھی۔

"کیوں اب تک سو رہی ہو۔ اور یہ تمہارا چہرہ پیلا پیلا کیوں ہو رہا ہے۔ کیا اس دیوانے کے ساتھ رتجگے ہو رہے ہیں۔"

"خدارا مریم اب اس کا نام نہ لو۔ تم کہو سویرے ہی۔ کیسے آئی ہو۔"

"یہ بتانے آئی ہوں کہ میرے کمرے میں جو دو پلنگ تھے ان میں سے ایک اب خالی نہیں رہے گا۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لیکن نیند کا خمار ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ "لیکن کیسے؟"

"سنو سلمہ۔ میں نے شادی کر لی۔ بجیا اگر بجاؤ کے ڈر سے اماں ابا کی کفالت نہیں کر سکتے تو میرے اوپر کیا ذمہ داری ہے۔ میں اسی لئے سدا کنواری تو نہیں رہ سکتی۔ اب دیکھو نا جب اس کی نوازشیں حد سے بڑھ گئیں تحائف میں اضافہ ہو گیا تو میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ "آخر تم کیا چاہتے ہو"

"شادی!"......

"کچھ دیر تو مجھے یقین نہیں آیا مگر جب اس نے کہا۔

"دیکھو مریم میں بہت اچھا لڑکا ہوں۔ تم اس وقت سے ڈرو جب کوئی اور لڑکی مجھے تم سے چھین لے۔ یہ چھینا جھپٹی کا دور ہے پھر میں بھی چاہتا ہوں۔ میری بے ترتیب زندگی کوئی سنوار دے۔"

میں نے سوچا۔ تھوڑی دیر غور کیا وہ واقعی اچھا لڑکا ہے اور میں نے حامی بھر لی۔ رات اس کے چند دوستوں کی موجودگی میں میرا نکاح ہو گیا۔ مجھے کسی نے رخصت نہیں کیا۔ کسی نے بابل نہیں گائے۔ مگر کسی نے مہندی نہیں لگائی اور میں نے جان بوجھ کر تمہیں بھی نہیں بلایا۔ کیونکہ آجکل تم بھی رومانس لڑا رہی ہو تم یہ سب دیکھو گی تو میری طرح کسی رات تم بھی نکاح کر لو گی۔ تمہاری اماں، ابا، نفیسہ ہوا میں معلق رہ جائینگے سلمہ چند سیکنڈ میں اماں ابا کی تصویروں کے سامنے سر جھکائے کھڑی روتی رہی۔ پھر میں نے اپنا کنوارپن رخصت کر دیا۔ یہی انتہا ہے۔ باقی کچھ بھی نہیں۔ ساری جدوجہد یہیں آکر ختم ہو جاتی ہے اور میں تو اس جدوجہد کی زندگی سے گھبرا بھی گئی تھی۔ یہ میری درخواست ہے دو چار دن میں کالج نہیں جاؤنگی۔ اب شاید نئے مکان میں شفٹ ہونے کے بعد میں کالج جا سکوں گی۔ اچھا تو اب میں چلی وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ اسکو ناشتہ بھی کرانا ہے۔"

"ٹھہرو..... ٹھہرو..... آواز تو جیسے میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ میں اسکو باوجود کوشش کے نہ روک سکی۔ اسکو تو جانا ہی تھا۔ وہ میری طرح نہیں میری کوئی منزل نہیں میں تو صبح ہی صبح کسی کے لئے ناشتہ نہ بنا سکوں گی۔ میرا کوئی انتظار نہیں کرتا۔ رات کے خواب نے صبح کے اس واقعہ نے مجھے بڑا اداس کر دیا۔ میرے سارے اعضاء دکھنے لگے۔ افسردہ دل لئے کالج جانے کو اٹھی جو آدم آگیا۔

"کالج نہیں جاؤ گی۔

"جاؤنگی مگر آدم للہ تم نہ آیا کرو۔"

"میں تو صرف یہ کہنے آیا ہوں آج سے میں ۱۱۵ روپے کا ملازم ہو گیا ہوں۔ اماں کا خط آیا ہے وہ بیمار ہیں۔ وہ جہاں رہتی ہیں وہ لوگ رہنے کا کرایہ مانگ رہے ہیں۔ اب ۱۱۵ روپے پا کر اماں کے غم کچھ کم ضرور ہو جائیں گے۔ اچھا تو میں چلا۔ تم اگر آنے سے منع نہ کریں تو بھی اب میں نہ آتا مصروفیات بڑھ رہی ہیں۔"

جی چاہا آدم کو روک لوں بڑھ کے اس کا ہاتھ تھام لوں اب پے در پے واقعات نے مجھے بیمار سا بنا دیا۔ اماں ابا نفیسہ بے قراری سے یاد آرہے ہیں۔ اللہ میں بھی بیوی ہوتی۔ بیٹی ہوتی۔ میری منزل بھی باورچی خانے تک ہوتی آدم سے نہ ملنے کا عہد کر کے میں کافی حد تک پرسکون ہو گئی کئی دن میں نے کمرے سے ادھر ادھر گزار دیئے۔ کہیں آدم سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔ لفافے کارڈ خریدنے ڈاکخانے جا رہی تھی۔ کوالٹی کیفے کی طرف جاتا ہوا آدم مل گیا۔

"ارے بھئی کہاں ہو کمرہ مقفل کر رکھا ہے یوں تالا بندی سے اگر خود کو چھپا سکتی ہو تو شوق سے۔"

"دیکھتے نہیں بیمار ہوں۔"

"دیکھ رہا ہوں۔ اچھا تو چائے ہی پی جائے۔"

"نہیں... کارڈ خریدنے ہیں۔"

"آو" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

اس کے لہجے کی سختی سے سہم کر میں اسکے پیچھے پیچھے کوالٹی میں داخل ہو گئی۔

"روز کئی کئی چکر لگاتا ہوں۔ بیزار ہو گئی ہو۔"

"ٹیوشن پڑھانے چلی جاتی ہوں۔ روپے کی زیادہ ضرورت ہو گئی ہے۔ چاہتی ہوں نفیسہ جلدی بیاہی جائے"

"اور تم....؟"

"پھر وہی بکواس۔ کہہ دیا یہ تو مقدر میں ہی نہیں۔"

"ارے تم تو خفا ہونے لگیں۔ ڈر رہی ہو میں زبردستی نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا تھا میں کسی پر زبردستی نہیں کر سکتا۔ وہ جو مجھے اس ساری کائنات میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ جو میری ماں ہے۔ میں اس پر بھی زبردستی نہیں کر سکتا پھر تم تو تم ہی ہو مجھ میں رکھا بھی کیا ہے تمہارا حسن۔ تمہاری معصومیت مجھ جیسے انسان کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ تمہارے لئے تو کوئی اور چاہیئے جیسے۔"

"ہاں کہدو۔ جیسے مریم کا شوہر۔ تم تو پاجامے پر کوٹ پہن لیتے ہو۔ بے ڈھنگے باورے پھوہڑ۔"

وہ دھیرے سے مسکرایا۔

"اچھا! تو مریم نے شادی کر لی۔ جب ہی تو تم اتنی اداس ہو۔ خیر کوشش کرو۔ خدا بڑا رحیم ہے اور یہ تم نے کیا کہا پاجامے پر کوٹ پہن لیتا ہوں تو کیا ساری دنیا کو دکھا دوں میری قمیض تار تار ہو رہی ہے۔ دو قمیض بنا لیتا ہوں جو دفتر پہن کر جاتا ہوں۔ پر اماں کے لئے تو روپیہ چاہیئے۔ جو کماتا ہوں سب انکو بھیج دیتا ہوں۔ مگر خدا را تم راحیلہ نہ بن جانا۔ لو میں چلا۔"

"جاؤ..... آدم کیا تم سمجھتے ہو میں تم سے محبت کرتی ہوں تم تو چھوٹے سے بچے ہو میں تم سے محبت نہیں کر سکتی۔"

وہ ہنس پڑا۔ "ایسی خوش فہمیاں تمہیں شاید کسی بڑے عذاب میں مبتلا کر دیں گی۔

وہ واقعی چلا گیا۔ مریم بھی اپنے شوہر کے ساتھ ہنی مون منانے کہیں چلی گئی۔ میرا فلیٹ میرے لئے قید خانہ بن گیا۔ تنہائیاں بری طرح ڈسنے لگیں۔ آدم کہیں نظر نہ آتا۔ کریم سے سنا وہ اپنے دفتر کے کسی ساتھی کے ساتھ رہنے چلا گیا۔ شب و روز بری طرح گذر رہے تھے نفیسہ کا خط آیا۔

"بجیا۔! پرسوں ابا مر گئے۔ اب تم چلی آؤ۔ اماں کہتی ہیں ہمیں روپیہ نہیں چاہیئے۔ اب ہم تین رہ گئے ہیں تو ساتھ رہیں گے۔ یہاں ایک گرلز اسکول میں میٹرس کی جگہ خالی ہو رہی ہے۔ اب تمہاری ضرورت مجھے ہے بجیا تم چلی آؤ۔"

رو کر کیا کرتی۔ کون تسلی دیتا۔ میرا کمرہ تھا اور ہولناک تنہائی۔ میں سیدھی کوالٹی میں گئی شاید آدم مل جائے آج اس کے سامنے دل کھول کر رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس کے ساتھ رہ کر اس المیہ کو بھولنے کی کوشش کرونگی۔ آج میں آدم کو وہ سب کچھ دے دونگی جو وہ لینا نہیں چاہتا۔ تاکہ زندگی کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے مگر کوالٹی میں اس سرے سے اس سرے تک آدم نظر نہ آیا یوں تو کتنے ہی تھے مگر وہ نہ تھا جسکی مجھے تلاش تھی وہ نہ ملا تو میں نے اس سے بے ملے ہی روانگی کا فیصلہ کر لیا اسباب باندھ لیا کالج میں استعفا دے دیا جانے سے پہلے شام کو سارا صدر چھان مارا۔ میں آدم کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بے چین تھی۔ وہ نہ ملا تو فضل بھائی سے اس کے بارے میں گفتگو کی۔ اس نے بتایا۔

"بی بی جی صاحب بڑے ہی نیک تھے۔ ہر ماہ مجھے ۱۰ روپے دیتے تھے۔ میں چاہتا نہ لوں۔ اس لئے کہ میں دیکھتا تھا انکی قمیض تار تار رہے۔ مگر وہ ہنس کر روپیہ واپس لینے سے انکار کر دیتے۔ کہہ دیتے۔"

"بھئی تم بھی عجیب ہو۔ ان دس روپوں میں سے میں نئی قمیض بنا لوں۔ مگر یار میری ذہنی مفلسی کون دور کرے گا۔ ان دس روپوں سے

مسرتیں تو نہیں خریدی جا سکتیں تم اگر ان دس دیوں سے ایک بار بچے دیکھ آتے ہو۔ مہینے میں ایک بار چوکیدار اور اسکی بیوی کی جگہ صرف عورت مرد بن جاتے ہو۔ تو بس سمجھو اسی میں میری مسرت ہے۔ مجھ سے اتنی ذرا سی خوشی تو نہ چھینو میرے یار۔"

"اللہ تم کتنے عظیم ہو اپنی مسرتیں دوسروں کو دے دیتے ہو میں دوسروں کی خوشیاں چھیننے کی کوشش کرتی ہوں۔ یہی فرق تو مجھے تم سے دور لئے جا رہا ہے کئی بار میں نے اسکے کمرہ کو بند کھڑکی طرف سے دیکھا۔ کئی بار حتی کہ ٹرین کا وقت آ گیا۔ اسٹیشن پر گاڑی چھوٹنے سے تھوڑی دیر پہلے آدم آ گیا۔

"تم!..... یہاں؟ کہاں چلدیں۔"

"ابا مر گئے آدم... میں استعفا دیکر جا رہی ہوں"

ان تین دنوں میں پہلی بار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے

"رو نہیں۔ میں نے کہا تھا حقائق بڑے تلخ ہوتے ہیں۔ اور ہر جاندار کا یہی انجام ہے۔ فنا ہر سے کیلئے ضروری ہے ورنہ تلخیاں اور بھیانک ہو جاتیں۔ خیر آؤ ذرا دیر ہوٹل میں بیٹھیں۔"

گوشہ عافیت پا کر میرے آنسو نکل پڑے

"نہیں رویا نہیں کرتے جاؤ جا کر اماں کو دلاسہ دو نفیسہ کی شادی کے لئے اور تیزی سے کوشش کرو آنسو کسی پریشانی کا علاج نہیں۔"

"آدم کبھی ملو گے؟" وہ چپ ہو گیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آیا اور اسی لمحے میں اس سے لپٹ کر بری طرح رونے لگی۔

"میں جانتا ہوں تم ابا کے مرنے پر نہیں مجھ سے بچھڑنے پر رو رہی ہو۔ اس لئے کہ تمہیں ابا کی نہیں میری ضرورت ہے جو پوری نہیں ہو سکی۔"

"ہاں۔" میں الفاظ بمشکل ادا کر رہی تھی۔

"مگر مت رو سلمہ یہ آنسو ہی تمہارا آخری سرمایہ ہیں انکی حفاظت کرو۔ اگر یہ سرمایہ بھی ختم ہو گیا تو تمہارے پاس کیا رہ جائے گا۔ انھیں اسی وقت کے لئے اٹھا رکھو جب تمہارے پاس یادوں کے انبار ہوں گے اور المناک تنہائیاں۔ دیکھو میں تم سے چھوٹا نہیں تم سے کتنا بڑا ہوں۔ میں کبھی نہیں روتا۔ راحیلہ کے جانے پر بھی نہیں رویا۔ تمہارے چھٹنے پر بھی نہیں رویا۔"

"واقعی وہ بہت بڑا تھا۔ بڑا بزرگ جسکے سینے میں ہزاروں طوفان مچل رہے ہیں۔ مگر وہ، خاموش کھڑا ہے۔ گاڑی آ گئی۔ میں اس سے کس طرح رخصت ہوئی یاد نہیں رہا۔ مگر میں نے دیکھا ضرور تھا وہ ریلوے لائن پار کر کے اس طرف بھاگتا ہوا چلا گیا ——— گھر آن کر ماں کو بہت بوڑھا پایا۔ ابا کی طرح وہ بھی کبھی کبھی خون تھوکنے لگی تھیں۔ نفیسہ بالکل سیاہ ہو گئی تھی۔ میں کسی سے ملکر نہیں روئی۔ اماں سے ابا کی تعزیت بھی نہیں کی۔ آدم نے کہا تھا نا آنسو میرا آخری سرمایہ ہیں اور میں اس سرمایہ کو اور سب چیزوں کی طرح لٹانا نہیں چاہتی تھی۔ مگر جب اماں مریں تو میرا رنگ بھی کالا ہو گیا۔ نفیسہ چمپا اور موتیا کی کیاریوں کے قریب بیٹھے بیٹھے کھانستی رہی اسکی آنکھوں میں جو موتی کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے وہ پانی بن بن کر بہتے رہے۔ میں خاموشی سے دیکھتی رہی مگر جب ہم دونوں بہنوں کا کنوارپن بدنامی بن بن کر پھیلنے لگا تو میں نفیسہ کو لے کر پھر اپنے پرانے فلیٹ میں آ گئی۔ یہاں نہ مریم تھی نہ آدم مگر یہاں آن کر میں نے اپنا سارا حسن پا لیا۔ سارا ماضی مجھے مل گیا جو یہاں چھوڑ گئی تھی۔ ایک دن یونہی ٹہلتی ہوئی کوالٹی کی طرف گئی تو دیکھا آدم ایک بک اسٹال کے قریب کھڑا ہے اسکی آنکھوں کی معصومیت کئی گناہ بڑھ گئی تھی اور وہ چھوٹا سا ہو گیا تھا۔ اس کا کوٹ بھی اب تار تار

ہو رہا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان برسوں کی مدت بھی تو حائل ہو گئی تھی۔ میں اس سے چھپ کر نکلنے لگی۔

"سلمہ!" وہی مانوس لہجہ وہی آواز کی مٹھاس

"جی!" میں اس کے سامنے پھوہڑ سی بن گئی۔

"کیا پھر آ گئیں۔ ملی بھی نہیں۔"

"تم کیسے ہو آدم تم تو کچھ اور ہی ہو گئے۔" میری آواز بھرانے لگی۔

"تم چلی گئیں کتنے دن بھٹکتا پھرا۔ چلتے چلتے اماں مر گئیں میں جا بھی نہ سکا نوکری بھی نہ رہی اسی تمام مرحلے میں تم بہت یاد آئیں۔"

"لیکن آدم میں تم سے اس لئے ملنا چاہتی تھی تمہیں بتا دوں کہ ابا اماں کے بعد میں نے نفیسہ کو ماں کی طرح چاہنے کی کوشش کی ہے اور کر رہی ہوں۔ اب میں تم سے نہیں مل سکتی۔ وہاں رہے تو بے بات کی باتیں پھیلیں۔ مجرد زندگی وہ بھی ہماری تم تو جانتے ہو کیسی کٹھن ہوتی ہے۔"

"جانتا ہوں۔ ہاں تم مجھ سے نہ ملنا ورنہ نفیسہ سدا کنواری رہے گی نفیسہ کے بیاہے جانے کیلئے تمہارا محتاط رہنا بڑا ضروری ہے۔ مگر تم یہ بتاؤ میں تمہیں خدا حافظ کہنے کیلئے الفاظ کہاں سے لاؤں۔ تم اجازت دو آج میں بھی رو دوں اب ضبط نہیں ہوتا۔ سلمہ! آنکھوں میں ہمہ وقت ایک سمندر نکلنے کے لئے طوفان مچاتا رہتا تھا۔ بولو میں کیا کروں۔"

مجھے لگ رہا تھا میں کھڑے کھڑے گر جاؤنگی میری آنکھوں کے سامنے دور تک چلچلاتی ہوئی دھوپ پھیل گئی۔ مجھے پتہ تھا مجھے انہی دھوپوں میں چلنا ہے۔ چلتے جانا ہے۔ جانے کہاں وہ کہاں تک میرے ساتھ چلے گا میں راحیلہ نہیں جو میرا ہاتھ تھام کر روشنیوں کے جگمگاتے جزیروں کی طرف لے جائیگا۔

"آدم تم میرے ساتھ نہیں گھسٹ سکتے۔ تم لوٹ جاؤ"

وہ آہستہ سے مڑا پھر رک گیا۔

"مگر ایک بار مجھے سینے سے لگا لو تو میں بے دھڑک جیتا چلا جاؤں گا۔"

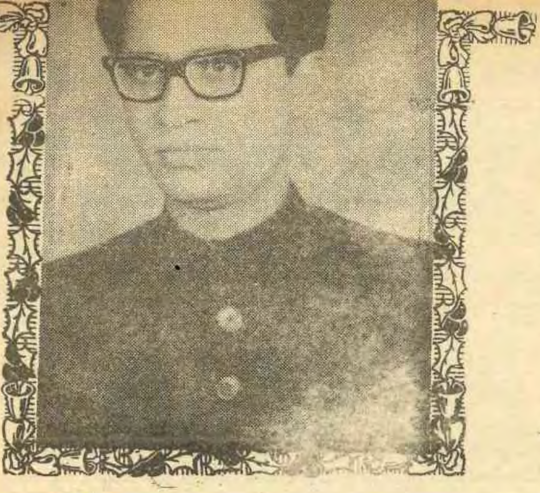
میں کانپنے لگی۔

"نہیں..... نہیں تم جاؤ۔"

اس نے کچھ نہ کہا۔ ذرا سی دیر کو آنکھیں جھکا کر آنسو پینے کی کوشش کی اور دھیرے دھیرے جانے لگا۔ میں نے اسکو جاتے دیکھا۔ آنسوؤں کی دھندلاہٹ میں میں نے دور تک اس کو دیکھا۔ جہاں تک میں دیکھ سکتی تھی پھر انہی آنسوؤں میں ایک آدم ایک انسان کا وجود گم ہو گیا اور میں کوالٹی کے باہر کھڑی حیرت سے تک رہی ہوں کوالٹی کے اندر رنگ و نور کا سیلاب امنڈ رہا ہے۔ اسی لئے کہ کتنی زلیخائیں اپنے گم گشتہ یوسفوں کو تلاش کرنے گھروں سے نکل کھڑی ہوئی ہیں۔ ان سب کی ایک منزل ہے ایک راہ متعین ہے پر یہ میری روح کیوں چیخ رہی ہے میں خود سے بے تکے سوالات کر رہی ہوں۔ اس شام سے جو میرے لئے اجنبی ہو گئی ہے۔

پوچھ رہی ہوں

میں کہاں جاؤں؟ کہاں؟





شگفتہ اجمیری



بادۂ تبریز

عدم کی سمت گامِ زندگانی تیز ہے ساقی
فضائے میکدہ کتنی شرر انگیز ہے ساقی

غنیمت ہیں یہ لمحے ہمنوائے سازِ دل ہو جا
کہ ہر تارِ رگِ جاں اب ترنّم ریز ہے ساقی

یہ کیا موقع ہے کیوں لب بند ہیں نظریں نہیں ملتیں
کسی میکش کا جامِ زندگی لبریز ہے ساقی!

جوانی ہی جوانی ہے فضائے مستِ میخانہ
خدا رکھے نظر مخمور ہے مے تیز ہے ساقی

فضائے میکدہ ہی کچھ شرر انگیز ہے ورنہ
زمینِ شورِ دل اب بھی بہت زرخیز ہے ساقی

بہک اٹھوں تو میخانہ کی دنیا ہی بدل جائے
میرے ساغر میں روحِ بادۂ تبریز ہے ساقی

مثالِ گل شگفتہ ہو کے رسوا ہوں زمانے میں
مرا چپ کر بہک اٹھنا قیامت خیز ہے ساقی

نئے اہرام

تنگ و تاریک مکانوں کے مکینو آؤ!
تم کو اک شاعرِ آوارہ صدا دیتا ہے
کہنہ عظمت کے جنازے کو سہارا دیدیں
اگلے وقتوں میں جو فرعون ہوا کرتے تھے
ان کی سطوت کا حکومت کا نشاں بھی نہ رہا
نوچ لی وقت کے پنجے نے جلالت کی نقاب
کھل گیا سارے زمانہ پہ خدائی کا بھرم
ہاں مگر ان کے بنائے ہوئے اہراموں پر
خون کے دھبے نمایاں ہیں نظر آتے ہیں
ان کا خوں ہے کہ جو سب کچھ تھے مگر کچھ بھی نہ تھے
دھوپ میں تپ کے ہواؤں کے تھپیڑے کھا کے

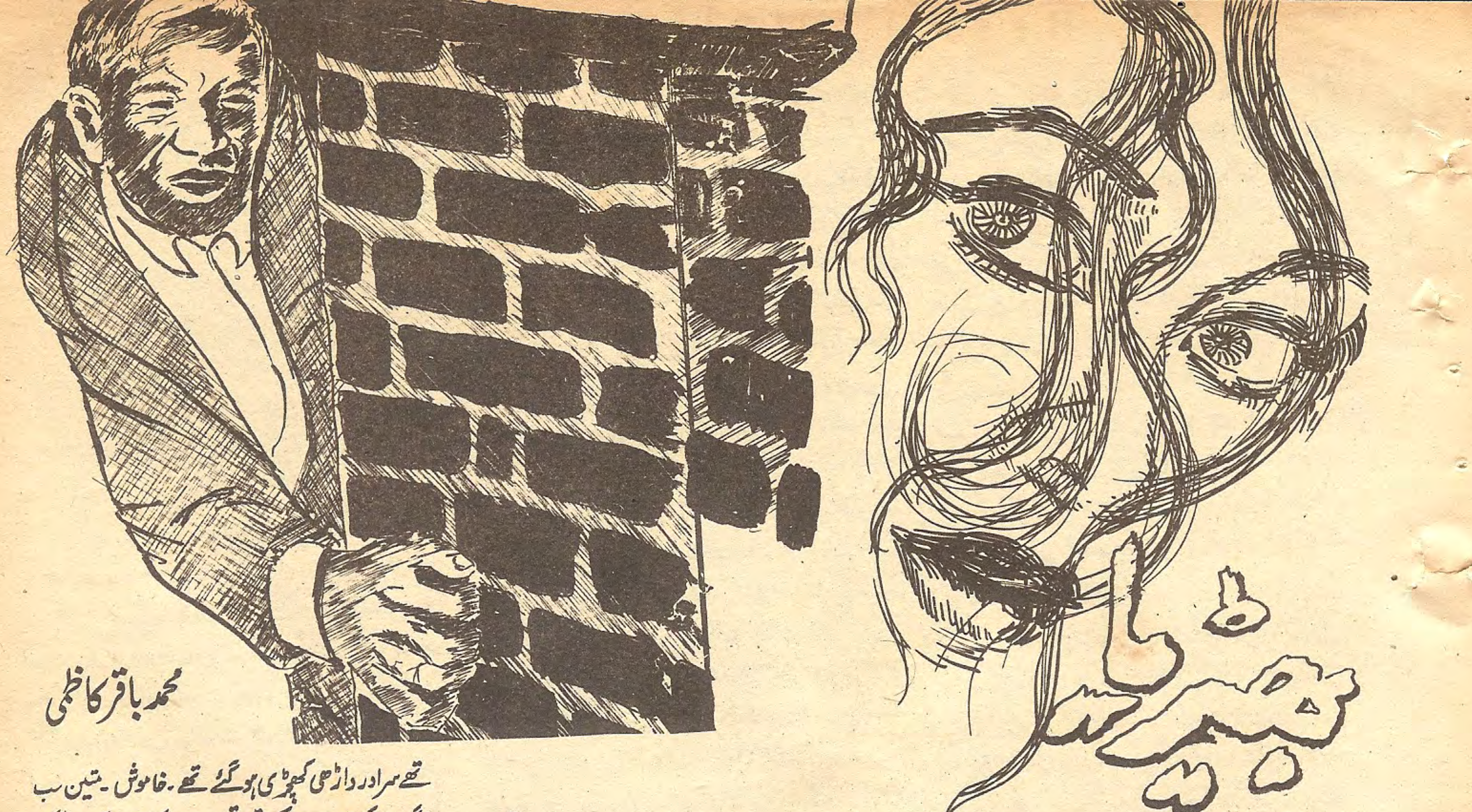
بھوکے رہ رہ کے بھی اہرام بنا جاتے تھے
جو سکندر کو سکندر تو بنا جاتے تھے
خود غلامی ہی میں گھٹ جاتے تھے مر جاتے تھے

جم کے رہ جاتا یہ اس خون کی تاثیر
جو بنے ہی نہ وہ بگڑی ہوئی تقدیر نہ تھی
زنگ آلود ہی رہتی یہ وہ شمشیر نہ تھی
کھوئی جاتی ہے جو مہتاب کی تنویر نہ تھی

ہم نے ہر گام پہ یہ خون ابلتے دیکھا
ہم نے خورشید شہنشاہی کو ڈھلتے دیکھا

ہمکو کہنا ہے کچھ اس دور کے فرعونوں سے
زندگی کتنے مراحل سے گذر آئی ہے
علم و دانش فن و حکمت کا تقاضہ ہے یہی
تم کو اس دور کی اقدار سمجھنا ہو
اپنے ناپاک عزائم سے خبردار رہو
ورنہ عیاری کا خمیازہ بھگتنا ہوگا
اور اس دور کے انسان سے پٹنا ہوگا

درس گاہیں تو نہ تم لوگوں سے بنوائی گئیں
قتل گاہوں کے مناروں کو نمایاں کر کے
تم نے اس دورِ ترقی میں ملوں کے بدلے
ہم سے دولت کے چھپانے کو محل بنوائے



بھیڑیا

محمد باقر کاظمی

گھر کی صفائی ستھرائی اور کھانا پکانے کے شغل سے فرصت ہوتی تو باجی انو اپنے لیپے پتے صاف دالان کے فرش پر پیڑھی ڈال کر نواڑ بننے کے اڈے پر آبیٹھتیں اور چپ چاپ تانا بانا کرنے لگتیں۔ گھر میں کسی ساس نند کا قصہ نہ تھا۔ کبھی کبھار کوئی عزیز آجایا کرتا یا محلہ پڑوس کی عورتیں آنکلتیں تو تو خیر ورنہ وہ گھر میں اکیلی ہی رہتیں۔ منے بھائی تو صبح ہی صبح گھی چپڑی موٹی موٹی دو روٹیاں رات کے بچے ہوئے دال سالن سے کھاتے بڑے پیالے میں چائے یا دودھ پیتے مراد آبادی تمباکو کی پتی والا پان کلے میں دبا۔ بچوں کو پیار کر باجی انو کو خدا حافظ کہہ کر ریاست میں اپنی ملازمت پر چلے جاتے۔ باجی انو دونوں بچوں کو نہلا دھلا۔ کھلا پلا کر چھوٹے چھوٹے بستے گلے میں لٹکا دیتیں ہاتھوں میں تختی تھما دیتیں بچے کھٹر پٹر کرتے گاؤں کے مدرسے چلے جاتے گھر میں کام ہی کیا تھا باجی انو ذرا دیر میں نمٹا کر رکھ دیتیں اور نواڑ بننے کے اڈے پر آبیٹھتیں۔ ہاتھ ادھر ادھر چلتے رہتے اکثر ایسا بھی ہوتا کہ کسی چیز پر نگاہیں جم گئی ہیں اب نہ ہاتھ میں حرکت ہے نہ جسم میں بس لگاتار اسی طرف دیکھے جاتیں بڑی سی خوبصورت آنکھوں میں نہ معلوم کیا تیر تا رہتا۔ ان کا حسین چہرہ کبھی پیلا پڑ جاتا۔ منہ پر مردنی سی چھا جاتی کبھی ایکدم لال بھبھوکا ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ ندی کے اتار کی طرح وہ اصلی حالت پر آجاتیں۔ کبھی کسی کو پتہ نہ چل سکا جب وہ اس حالت میں ہوتی ہیں تو انکی آنکھوں سے کیا ظاہر ہوتا ہے مایوسی غصہ۔ نفرت۔ حسرت سب گڈمڈ ہو جاتا۔ دل کا دھواں ایک دبی چھپی سی آہ کے ذریعہ باہر نکل جاتا۔ وہ گھبرا کر چاروں طرف نظر ڈالتیں۔ سر کو جھٹکا دیتیں ہاتھوں اور جسم میں دوبارہ حرکت شروع ہو جاتی۔ تانا۔ بانا۔ تانا۔ بانا . . . . . .

باجی انو کے باپ کا گاؤں کے امیر اور بڑے لوگوں میں تو شمار نہ تھا مگر ان کے یہاں اللہ کا دیا ہوا سب کچھ تھا ماشاء اللہ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن پیار میں انوری بیگم سے باجی انو بنکر رہ گئی تھیں۔ جب باجی انو نے ہوش سنبھالا تو گھر کا نقشہ کچھ اس قسم کا تھا۔ پختہ بنا ہوا کھلے دروں کا پھاڑ رکھا دالان۔ بغل میں کوٹھریاں۔ سامنے بڑا سا چھپر۔ چھپر ہی میں ایک طرف باورچی خانہ تھا جہاں ایک طرف آرہے میں دودھ اونٹتا رہتا۔ دوسری طرف دہی کی بلونی لگی ہوئی تھی جہاں روز صبح کو اماں دودھ بلویا کرتیں گھمر۔ گھمر کی آواز آتی رہتی ہر جمعرات کو مکا تا کر گھی نکالا جاتا۔ بچوں کی شادیوں کے لئے جمع کر دیا جاتا کوٹھری میں ایک کے اوپر دوسرا نہ معلوم کتنے کنستر رکھے رہتے۔ کہتے ہیں یہ باجی انو کے ابا کا جدی مکان نہ تھا۔ انھوں نے مالک مکان کی غربت پر ترس کھا کر جو وقتاً فوقتاً ان کو ادھار قرض دیا تھا اسی کے بدلے یہ مکان ان کو مل گیا تھا دوہری ڈیوڑھی کے سامنے بڑا سا چوک تھا جس میں ابا نے ایک نیم لگا دیا تھا۔ کبھی اور اب اسی نیم کے سائے میں کئی پلنگ پڑے رہتے۔ ایک طرف اپلوں کی پور سے دھواں نکلتا رہتا محلہ کے کھیت کسان اور رشتہ دار لوگ اپنی فرصت کے وقت نیم کے نیچے حقہ پینے اور باتیں کرنے میں کاٹا کرتے دراصل یہ نیم محلہ کی چوپال تھا اور اس بڈھے نیم کے پیٹ میں ہزاروں داستانیں جمع تھیں۔

باجی انو کے ابا ادھیڑ عمر کے تندرست و توانا آدمی تھے سر اور داڑھی کھچڑی ہو گئے تھے۔ خاموش۔ متین سب لوگ ابا کی بیحد عزت کرتے تھے۔ اماں بھی ان کے جوڑ کی تھیں۔ بھاری بھرکم نک چڑھی۔ بدمزاج اور کم سخن مشہور تھیں۔ کنجوس ایسی کہ اپنے ہاتھ سے فقیر کو باسی روٹی کا ٹکڑا بھی نہ دیں۔ ویسے اگر بچے کچھ ہی نکال کر کھالیں۔ کسی کو دیدیں تو بس سوائے منہ پھیر لینے کے ایک لفظ زبان سے نہ نکلے دل چاہے ڈھیروں نمکین روٹیاں تھوپ کر رکھ دیں۔ دل نہ چاہے تو چاہے بھوکے رہو چنے چباؤ یا بڑے لڑکے خود روٹیاں تھوپیں تو فاقہ توڑے اماں کو کوئی غرض نہ تھی کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے بس وہ تو اپنی خاموشی میں مست رہتیں۔ اور تو اور ابا بھی دو بات ان کے منہ سے سننے کو ترستے۔

صبح سویرے۔ بلکہ کبھی کبھی تو تارو ں کی چھاؤں میں تینو مردات کی باسی روٹی لہسن مرچ کی چٹنی۔ آم کے اچار سے کھا کر لال شکر پڑا دودھ کا ایک ایک پیالہ پی کر اپنے ہل بیل سنبھالتے اور کھیتوں کو چلے جاتے باجی انو محلہ کی استانی سے بغدادی قاعدہ اور اردو کی پہلی کتاب پڑھنے چلی جاتیں۔ دونوں چھوٹے لڑکے بستہ بغل میں دبائے جیب میں گڑ چنے بھرتے۔ پھنکیں مارتے مدرسے چلے جاتے۔ اماں کا دل چاہتا چولہے پر دال کی ہنڈیا چڑھا روٹی ڈالنے بیٹھ جاتیں یا انو کے جہیز کے کپڑے سینے لگتیں یا پھر کچھ بھی نہ کر کے پلنگ پر لوٹ لگایا کریں۔ سارا گھر بھائیں بھائیں کرتا۔ دوپہر کو چھوٹے بڑے سب لوٹ آتے اور گھر میں ایک دم رونق بڑھ جاتی۔ روٹی کھا کر ابا تو کوٹھری میں لیٹ جاتے۔ لڑکے اپنے اپنے حقے لے کر نیم کے نیچے چلے جاتے۔ بچے کھیلنے نکل جاتے۔ باجی

[illegible]

رچانے لگتیں۔ اور جب یہ سہیلیاں شادی کرنے کرتے آپس میں لڑتیں تو ایک دوسرے کے بال تک کھسوٹ ڈالتیں۔ اماں نے آج تک کسی عزیز رشتہ دار اور محلے والیوں کو کبھی منہ نہ لگایا تھا۔ اس لئے آمد و رفت بالکل ہی بند تھی۔ ساری عورتیں اماں کے پیچھے ہونٹ بچکایا کرتیں اے گئی نہ وہ کمبخت کنجوس مکھی چوس جیسے بولتے ہوئے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دو بول منہ سے کہہ دینے پر بیچاری کا کوئی خزانہ لٹ جائے گا۔

دراصل اماں کی زندگی میں ایک واقعہ ایسا ہو گیا تھا کہ جس نے انکی زندگی کے دھارے کو بالکل موڑ کر رکھ دیا تھا۔ ہوا یوں کہ اماں کے ابا جب بیمار ہوئے اور اماں انکی تیمارداری اور آخری خدمت کے لئے اپنے میکے گئیں۔ اور جب ایک دن ان پر مرض کا بہت زور ہوا تو انھوں نے تنہائی میں اماں کے کان میں کہا۔ . . . وہ گھڑا . . پلنگ کے . . . . پائے کے نیچے . . بات پوری کیے بغیر وہ اللہ کو پیارے ہو گئے اور اماں نے موقعہ دیکھ کر پلنگ کے پائے کے نیچے دبا ہوا گھڑا نکال کر ابا کو دیدیا تھوڑے ہی دنوں کے بعد گھر میں چہل پہل ہی اور ہو گئی۔ آج کچھ کل کچھ۔ اور میاں جو رامیاں ظہورا بن گئے۔ پھر نئی نئی اور بڑھیا بڑھیا زمینیں لگان پر لے لی گئیں۔ دو سے چار اور چار سے چھ بیل ہو گئے۔ دو بھینسیں اور گائیں کھونٹوں پر جھولنے لگیں۔ کھیتاں لہلہانے لگیں۔ ہالی بلدیئے لگ گئے تو میاں ظہورا سید ظہور الحسن کہلانے لگے۔ مکان کے برابر کی زمین لے کر گھیر اور بیٹھک بن گئی۔ نیم بیچارا اب سارے دن اکیلا کھڑا آتے جاتوں کا منہ تکا کرتا۔ اس کے نیچے خاک اڑا کرتی اور پھر جیسے کسی نے اماں کے جسم پر گوشت اور چربی کی تہہ در تہہ چپکا دی ہوں۔ جسم کے ساتھ بدمزاجی اور نک چڑھا پن بھی بڑھ گیا۔ بچوں وغیرہ کی پیدائش سے تو اماں جب ہی سے فراغت حاصل کر چکی تھیں جب چوتھے لڑکے کی پیدائش پر دائی کی غلطی سے کچھ بگاڑ ہو گیا تھا جو نہ تعویز گنڈوں سے دور ہوا نہ حکیم کے کئی روپے کے نسخے پینے سے۔ مزید بچوں کی پیدائش سے اماں نے یہ کہکر صبر کر لیا تھا۔ فضول خواہ مخواہ کا جھگڑا — جننا۔ بیاہنا۔ کوئی بات ہے بھلا . . . . بڑے لڑکے سے اماں کا قطع تعلق تھا۔ اس نے کہیں ایک روز اماں سے سوال جواب کئے تھے اور اماں کو ایسا غصہ آیا کہ جب عرصہ کے بعد بڑے لڑکے کی شادی ہوئی۔ چاندسی دلہن خوب لے دے کر آئی تو اماں تیہرا بندھے ہوئے لال کی نہ بلائیں لیں نہ دو بول دعا کے منہ سے کہے۔ نئی بیاہی بہو نے جو یہ طور اطوار ساس کے دیکھے اس نے چار دن بعد میاں کو بہکا سکھا کر چولہا الگ کروالیا۔ ڈیوڑھی کے برابر میں سہ دری بنگئی بہو کو سواجیہ مل گیا پھر پہلے پوتے کی پیدائش پر بھی اماں بیٹے میں علیک سلیک شروع نہ ہوئی تو گویا دونوں کے درمیان پکی دیوار کھڑی ہو گئی۔

باجی انو نے بڑے ہوتے ہی گھر سنبھال لیا۔ ... وقت پر اماں روشن ہونے لگا باجی انو کو اب سوائے چولہے کے

تھا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد محلہ میں ایک مولوی صاحب اپنی نئی نویلی مولون کو لے کر آباد ہو گئے۔ یہ مولون لکھنو کی رہنے والی بھلا اس گور دیہہ میں کیا دل لگتا انھوں نے لڑکیاں گھیر قرآن شریف پڑھانا شروع کر دیا۔ دل کا دل لگ گیا — روٹی ہانڈی سے چھوٹیں۔ لڑکیاں ذرا دیر میں سب کام کر دیتیں تحفوں اور سوغاتوں سے گھر بھر جاتا۔ تنخواہ تو بیچاری لیتی ہی نہ تھیں سوغاتیں البتہ قبول کر لیتیں۔ انو بھی مولون کے پاس جانے لگیں۔ قرآن تو پڑھ ہی چکی تھیں۔ انھوں نے کئی اردو کی کتابیں اور ختم کیں پرونا، کاڑھنا اور بننا سیکھ لیا جب ذرا سیانی ہونے لگی اور چادر میں لپ جھپ کرتی ہوئی انو پر آتے جاتے کی نظریں پڑنے لگیں تو یہ سلسلہ بھی بند کر دیا گیا۔ ویسے سلیقہ تو سب آ ہی چکا تھا اب ضرورت بھی کیا تھی۔

باجی انو اب خیر سے چودھویں برس میں قدم رکھ رہی تھیں . دیکھتے ہی دیکھتے وہ کینچلی بدلی کہ سب کو تعجب ہوتا۔ کہاں تو کل کی سر جھاڑ منہ پھاڑ انو اور کہاں آج کی انو۔ زمین آسمان کا فرق تھا۔ گلابی گلابی رنگت بڑی بڑی آنکھیں — پتلے پتلے ہونٹ۔ ستواں ناک۔ چوڑی پیشانی۔ بھرا بھرا جسم موزوں قد و قامت۔ ہنستے وقت گالوں میں چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ جاتے۔ ہاتھوں میں کانچ کی بھری بھری چوڑیاں — چاندی کے بندے ناک میں پتلی سی سونے کی ننھی جسم پر ڈھیلی ڈھالی قمیض تنگ موہری کا آڑا پاجامہ۔ موٹی [illegible] اوڑھنی۔ انو سچ مچ ایسی لگتی جیسے انار کی کلی۔ سرخ سرخ نازک نازک دیہاتی لہجہ پر لکھنوا زبان کی چاشنی۔ بات چیت میں ادب آداب میں مولون کا پرتو۔ کھلی ہوا اور سادی غذا سے پلی ہوئی انو بہت سی متضاد خصلتوں کی مالک بن گئی جو بھی دیکھتا فریفتہ ہو جاتا جو بھی ملتا پسند کرنے لگتا۔ گھر کا نقشہ بدل گیا ہر چیز سے صفائی اور سلیقہ ٹپکتا۔ یا تو اس گھر میں اماں کے مزاج کی بدولت کوئی آکر جھانکتا بھی نہ تھا یا اب آنے جانے والیوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ کوئی آکر کہتی انو ذرا قمیض کا گلا تو کاٹ دے۔ انو ہماری بٹیا کو کرتے کا تعویز بنانا تو سکھا دے۔ انو تکیہ کے غلاف پر پھول بنا دے۔ کب سے تیری بہن ضد کر رہی تھی اماں پھول بنوا دو۔ ڈی ایم سی بھی پڑے پڑے نگوڑی میلی ہو گئی۔ آج فرصت ملی ہے تو میں نے کہا لاؤ پھول ہی بنوا لاؤں۔ محلہ کی ساری عورتوں اور لڑکیوں کی ضرورتیں انو کے دم سے پوری ہوتیں جس کو ذرا فرصت ہوتی انو کے پاس آ بیٹھتی اور کچھ نہیں تو میلاد اکبری ہی سنا جار ہا ہے گاؤں کی عورتیں اپنی لڑکیوں کو انو کی مثال دے کر سلیقہ سیکھنے کی ہدایت کرتیں دیکھتے ہی دیکھتے انو ایک ایسی مثالی لڑکی بن کر رہ گئی جو صورت شکل۔ عادات مزاج اور کام کاج میں سارے گاؤں کی ناک سمجھی جاتی۔ جہاں بری ہوتی ہے۔ وہاں بھلے تو آتے ہی ہیں۔ طرح طرح کے ہلانے پس گاؤں کی عورتیں آیا کرتیں اور جب انو ڈیوڑھی پر کسی کا تانگہ لگنے کی کھن کھن پاتی جھٹ پلنگوں پر گھر سوت کی بنی ہوئی موٹی موٹی دریاں بچھا ان پر اپنے ہاتھ سے کڑھی ہوئی چادریں لگا کر پھولوں والے جھالر تکیے رکھ دیتی۔ کھانا پکانے اور صفائی ستھرائی سے فارغ ہوتی تو منہ ہاتھ دھو کر سلیقہ

کے خلاف انکو عورتوں کے سامنے آنے دیتیں۔ مہمان بیبیاں کے یہاں ہمیں رشتہ نہیں کرنا ان سے چھپائیں بھی کیوں۔ انو نیچی نظریں کئے شرم کے ساتھ بات کا جواب دیتی۔ گفتگو میں تو مٹھاس تھا ہی باتوں ہی باتوں میں آنے والیوں کا دل موہ لیتی اور پھر جب مہمان بی بی اسکے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاتی تو رہی سہی کسر پوری ہو جاتی۔ انو کی تعریفیں ہونے لگتیں۔ اماں پھولے نہ سماتیں۔ سچ مچ باجی تمہاری یہ انو تو اندھیرے گھر کا چراغ ہے۔ اللہ خوش رکھے رسانے بسانے جس گھر جائیگی سسرال میں روشنی کر دے گی۔ سب پیر دھو دھو کے پیا کریں گے۔ باجی ہے تو چھوٹا منہ بڑی بات مگر دل کی بات جب زباں پر آ ہی گئی تو کہنے میں کیا حرج ہے۔ اللہ رکھو تمہارا بھانجہ بھی خیر سے جوان ہے۔ دیکھنے قابل اگر پرانی رشتہ داری نئی ہو جائے تو کیسا ہے اور ہمیشہ اماں ہوں ہاں کر کے ٹال دیتیں۔ جب مہمان بی بی رخصت ہونے لگتیں تو اماں کے بڑبڑانے کی آواز اس قسم کی آیا کرتیں —

ے حرام زادی کٹنی کی بات تو دیکھو۔ چھچوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل۔ اللہ کی شان آئیں بڑی پیغام دینے والی ایڑیوں میں رگڑ کر پھینک دوں۔ خیر سے جوان ہے . . . آئی جوان والی۔ لوڈلا کی باتیں تو دیکھو۔ وہ ٹیڑھا منہ کر کے کہتیں۔ اے باجی انو نے کونسی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ اے لو اب کوکھیں بھی الگ ہونے لگیں نگوڑی۔ ہاں تو آئی کہیں کی۔ خیر تی۔ بتت بنی۔

وقت کے ساتھ ساتھ انو کی خوبصورتی۔ سلیقہ اور دان دہیز کی شہرت بڑھتی گئی اور جب ایک روز چچا زاد بھائی کی منت کی مجلس میں نیچی نظروں کے ساتھ نوحہ پڑھا اور ساتھ کی لڑکیوں نے وہ چھکے کا ماتم کیا کہ دیواریں ہلا دیں۔ تو انو کی شہرت پر لگا کر اڑ گئی۔ جلنے والیوں نے بہتیرے اعتراض بھی چپکے چپکے کئے۔ لو جی کنواری لڑکیوں کی ذرہ کھلوانے کی نئی ترکیب نکالی ہے۔ مگر بہر حال ایک نئی بات کی بنیاد پڑ گئی۔ اور چار دن کے بعد لڑکیوں نے مجلسوں کو سنبھال لیا۔ اعتراض کرنے والیاں اب خود اپنی لڑکیوں کو نوحے مرثیہ پڑھنا سیکھنے کی شہ دینے لگیں۔ بیبیوں سے کنواریوں کے پردے کی رسم ٹوٹ گئی۔ انو کے دھڑا دھڑ پیغام آتے اور اماں سب کو ٹھکرا دیتیں اور عورتیں کہا کرتیں۔ ہاں جی انکی انو کے لئے تو عرش سے فرشتہ اترے گا۔

دوسرے لڑکے کی شادی پر گھی کے کئی کنستر خرچ ہو گئے۔ اس گھر میں پہلی مرتبہ ساری برادری اور عزیزوں کا کھانا ہوا۔ مراثنوں نے ڈھولک پر بے سرے گیت گا گا کر محلے کی ہفتوں نیند خراب کی۔ اور آخر ایک دن جب دوپہر کو چیل انڈا چھوڑ رہی تھی تو چلچلاتی دھوپ میں بہو کا ڈولا دروازے پر آ لگا۔ چھوٹی بہو کے اندر انو کو ایک بہت عمدہ سہیلی اور رازدار مل گئی۔ بہو کی عمر انو کے لگ بھگ ہی تھی آتے ہی نند سے وہ دل ملا کر ایک روح دو قالب بن کر رہ گئیں۔ گرمیوں میں جب دوپہر

کو بھی بھاوج کی سہ دری کے کواڑ بند ہونے لگے تو انو بے چاری اماں کا سہارا پکڑے کواڑ کھلنے کی منتظر رہا کرتی کہ بھیا چوروں کی طرح چپکے سے نکل کر باہر کی راہ لیں اور کب انکی رسائی بھابی کے پاس ہو اور پھر ایک دن گھر میں ہنگامہ ہو گیا ہوا یوں کہ بھائی بشیر حسین عرف بھائی بوچھے۔ آڑا پاجامہ۔ مخمل کی ٹوپی اور دھلی ہوئی قمیض پہن کر منے بھائی کا پیغام لے کر پہنچ گئے اور میاں ظہور الحسن کے منہ سے حقہ کی نے چھوٹ گئی۔ ماتھے میں سلوٹیں پڑ گئیں غصہ کو دبا کر بولے۔ بھائی بوچھے تمہیں ایسی بات کہتے شرم بھی نہ آئی بھلا منے سے انو کا کیا جوڑ۔ اگر منے کی شادی اپنی عمر پر ہوئی ہوتی تو آج کو انو سے بڑی اولاد ہوتی۔ ابلے زیادہ بھائیوں کو غصہ آیا اگر پرانی رشتہ داریوں کا پاس نہ ہوتا تو جانے کیا سے کیا ہو جاتا۔ اور اماں نے جو سنا تو ان کے منہ میں ایکھو دم گز بھر کی زبان لگ گئی۔ بولیں۔ اے پڑھے منہ مہاسے۔ نگوڑے کو لاج بھی نہیں آئی ایسی بات منہ سے نکالتے ہوئے اور پھر جو اماں کی مشین چلی تو منے بھائی کے رہو سہو کی سات پشتیں دھلک کر رکھ دیں۔ بھاوجوں نے بھی اماں کی آواز میں آواز ملائی اور انو نے یہ ہنگامہ دیکھ کر چھوٹی بھاوج کی سہ دری میں جا کر کواڑ بند کر لئے پہلے تو خوب ہنسی۔ پھر رونے لگی۔ آنکھیں سوج گئیں۔ چھوٹی بھاوج نے آ کر ڈانٹا۔ باوَلی ہوئی ہے کیا۔ تجھے کیا۔ تو کیوں روتی ہے۔ اے کتے بھونکتے ہیں تو بھونکنے دے۔ ہاں تو آئی بڑی رونے والی چل اٹھ چولہے پر بڑی کھیر خراب ہو رہی ہے گولا کاتوں تو کھیر گھونٹ۔ بات ختم ہو گئی۔

بھائی منے کی ذات وات میں تو خیر فرق نہ تھا۔ مگر ظاہر بظاہر انو سے آس پاس کا بھی جوڑ نہ تھا۔ ۳۵۔۴۰ برس کے لگ بھگ عمر بال پکنے لگے تھے کبھی پہلوانی کی تھی اس لئے کسرتی جسم تھا ورنہ کبھی کے جسم کا گوشت لٹکا بزرگوں کی صف میں جا بیٹھتے دس پندرہ بیگھ جدی زمین۔ دس بیس بیگھ موروثی۔ آدھا کچا آدھا پکا۔ ایک دالان ایک کوٹھری ٹوٹی ڈیوڑھی بس یہی اثاثہ تھا ان کے گھر میں کوئی دور پار کی ایک بیوہ بہن اپنے بچوں سمیت رہا کرتی تھیں ———— ایک بہن تھی جو کبھی کی بیاہی بری تھی بارہ برس میں کبھی مہمان داخل آتی اور بھیا کے بیرن کے بیاہ کی دوڑ دھوپ کرتی مایوس اور ناکام ہو کر روتی آنسو بہاتی پردیس چلی جاتی منے بھائی کی شادی کے تذکرے ٹھنڈے پڑ جاتے اب اس عمر میں تو رئیسوں ہی کو چودہ برس کی لڑکیاں مل جاتی ہیں منے بھائی کو کون دیتا منے بھائی کو دو ہی شوق تھے۔ پہلوانی اور کھیتی۔ مگر ایک دفعہ جب رات کو چوروں نے شہر کے راستے میں انکی گڑ کی گاڑیاں لوٹ لیں اور منے بھائی کو وہ مار لگائی کہ مدتوں پٹیاں باندھے ہسپتال میں پڑے رہے تو پھر انھوں نے پہلوانی اور کھیتی دونوں ہی کو خیرباد کہہ دیا اور ریاست میں [illegible] ملازمت کر لی سچ ہے آدمی کا شیطان آدمی منے بھائی کے لنگوٹیا یار نورو قصائی نے ان کے کان میں ایک [illegible] پھونک ماری کہ ایک مرتبہ تو منے بھائی بھی [illegible] پٹا کر رہ گئے۔ بولا آخر تم اپنا پیغام انو سے کیوں نہیں بھجواتے

منے بھائی نے کہا کیوں باولے ہو۔ کہاں وہ کہاں میں مگر جب نورو نے اونچ نیچ دکھا کے امیدوں کے سبز باغ دکھائے تو منے بھائی بیٹھے بٹھائے باولے بن گئے۔ اور لگے دم بھرنے انو کی عاشقی کا۔ اپنی تدبیر کو عملی جامہ پہنانے کے لئے منے بھائی نے پٹواری کے پوتے ڈپٹی کلکٹر صاحب کی ڈیوڑھی اور جو خاص انو کے گھر کے سامنے تھی آباد کی۔ انو نے بیسیوں مرتبہ منے بھائی کو اپنی ڈیوڑھی سے جھانک کر دیکھا ویسے بھی پردہ کئے دن کے ہوئے تھے۔ اس نے دیکھا تھا کہ کبوتروں کو دانہ ڈالا جا رہا ہے۔ کبھی مرغیوں کو آ۔ آ۔ کر کے روٹیوں کا ملیدہ کھلایا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی انو کی ڈیوڑھی پر بھی چھپی چھپی نظریں ڈالی جا رہی ہیں۔ تاش کی پارٹیاں جل رہی ہیں۔ ہو حق ہو رہی ہے۔ داستان یوسف گا گا کر سنائی جا رہی ہے۔ مجمع اکھٹا ہو رہا ہے۔ بچوں کی دوڑیں کرائی جا رہی ہیں۔ نیم کے نیچے کی چوپال کی جگہ منے بھائی کی بیٹھک نے لے لی تھی جہاں مفت میں حقہ پینے کو ملے دل لگانے کے لئے کوئی نہ کوئی مشغلہ ہوتا رہے وہاں مجمع کیوں نہ لگتا اور بھائی منے نے رفتہ رفتہ اپنا چولا بدل ڈالا۔ سر پر سفید جھاگ سی پگڑی بیلی لگا کرتہ۔ علی گڑھ کاٹ پاجامہ۔ داڑھی روزانہ گھٹتی۔ باریک باریک مونچھیں۔ چھوٹے چھوٹے بالوں میں تیل لگایا جانے لگا آنکھوں میں سرمہ۔ اور انو کو بھلا کیا خبر ہو سکتی تھی کہ یہ سارے لچھن اسے ہی دکھائے جا رہے ہیں وہ تو ان کو چچا منے کہا کرتی تھی۔ اور جب بوچھے بھائی نے جوتے کھا کر لوٹنے کی داستان سنائی تو ایک مرتبہ تو منے میاں کو تارے نظر آ گئے اور پھر شیطان جو آدمی کے دل میں سویا رہتا ہے جاگ اٹھا۔ توہین کا بدلہ لینے کی قسم کھائی۔ نورو سے بولے میں بھی اگر ایک مرتبہ انو کی شہرت اور میاں ظہور الحسن کی عزت کو خاک میں نہ ملا دوں تو کسی سید کا تخم نہیں بھنگی چمار کی اولاد کہنا۔

تھوڑے عرصہ بعد جس مجمع میں منے بھائی کا گذر ہوتا وہ یہ جتانے سے نہ چوکتے کہ انھوں نے دراصل یہ پیغام انو کے ایما پر بھیجا تھا۔ اس نے خود بیس مرتبہ بلا کر تقاضہ کیا تھا۔ اور پھر رفتہ رفتہ جھوٹے سچے گواہ پیش ہونے لگے۔ کوئی کہتا ہاں جی ہم نے خود اشارہ کرتے دیکھا تھا۔ دوسرا بولا جی ہم تو جب بھی ادھر سے گذرے انو کو منے بھائی کی طرف تاک جھانک کرتے دیکھا اول اول تو کسی نے توجہ نہ دی اور پھر رفتہ رفتہ سب کو یقین آنے لگا کہ شاید ٹھیک ہی ہو۔ وہ تمام نکمے جوان جو اپنے پیغام کے رد ہونے پر جلے بیٹھے تھے منے بھائی کے کچوریوں کے گواہ بن گئے سب نے الگ مل کر چھیڑا اٹھا لیا جہاں دیکھو یہی قصہ بیان ہوتا۔ لوگوں کو تو دلچسپی کے لئے کچھ نہ کچھ عنوان چاہیئے۔ لیلیٰ مجنوں۔ شیریں فرہاد۔ طلسم ہوشربا کی داستانیں ہوں۔ کہ زہر عشق اور گل بکاؤلی کی مثنویاں۔ کونسی سچی تھیں۔ دنیا جھوٹ کو جھوٹ ہی سمجھ کر سنتی اور پھر اسی جھوٹ کو سچ سمجھ کر ان پر روتی بھی ہے۔ انو کی داستان بھی فرضی ہی سہی مگر دلچسپ تھی۔ جب گاؤں کے بڑے بوڑھوں کے سامنے یہ ذکر چلتا تو وہ اپنی لاٹھیاں اٹھا اٹھا کر دھمکاتے۔ کہتے شرم نہیں آتی بکواس کرتے ہو۔ جھوٹ بولتے ہو۔ شریف لڑکیوں کے یہ لچھن نہیں ہوا کرتے۔ اور جوان ظاہری طور پر ادب کے ساتھ کہتے دادے سنو تو سہی تمہیں کیا خبر سب کو اپنے زمانے کا سا جانتے ہو۔ دادے اب دنیا بدل چکی ہے ترقی کا زمانہ ہے دو چار آدمی بگڑتے دس بیس اچھلتے اور پھر عورتیں بھی میدان میں آ گئیں۔ اماں نے ایک مٹھی نمک ما دو مرچیں۔ پیر آئے کو انکار کر کر کے جو عداوت کے بیج بوئے تھے آخر کب تک فصل نہ دیتے انھوں نے اپنی لڑکیوں کو انو کی ہوا سے بچانے کی مہم شروع کر دی۔ وہی انو کل جسکی مثال دی جاتی تھی اور جسکی پیروی کی تلقین کی جاتی تھی آج راندۂ درگاہ سمجھی جانے لگی۔ ایک مرتبہ پھر انو کے گھر کا بائیکاٹ ہو گیا لڑکیوں کے آنے جانے پر پابندی لگی اور عورتوں نے بھی جانا بند کر دیا۔ کبھی کبھی کوئی آ نکلتی تو بھی خبریں نمک مرچ لگا کر انو کی ماں اور بھاوجوں سے بیان کر دیتی انو باجی کے کانوں میں بھی بھنک پڑ جاتی اور انکی حالت خراب ہو جاتی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد تو گویا ہر طرف سے کوئی نہ کوئی شگوفہ روز ہی کھلنے لگا۔ انو بے چاری منہ سے تو نہ بول سکتی مگر دل ہی دل میں کڑھتی رہتی طبیعت مضمحل رہنے لگی ہنسی اور شوخی رخصت، چستی چالاکی کافور۔ طبیعت گری گری رہنے لگی رضائی اوڑھ کر لیٹ جاتی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماں اور بھاوجوں کا منہ تکتی آخر جب کسی طرح صدمہ برداشت نہ ہو سکا تو بیماری نے آ دبایا باہر چرچے ہوتے رہے۔ اندر انو کی طبیعت بگڑی رہی اور جب انو کی بیماری کی خبر باہر پہنچی تو منے بھائی اور ان کے دوستوں نے ترکش کا آخری تیر بھی چھوڑ دیا مشہور کر دیا گیا کہ انو کا پیر بھاری ہے دراصل اور اسی کو پوشیدہ رکھنے کے لئے بیماری کا سوانگ رچایا گیا ہے۔ انو کے گھر والے سارے جہان کا تو آخر مقابلہ نہ کر سکتے تھے غصہ کے مارے پیچ و تاب کھاتے اور سر پیٹ کر رہ جاتے۔ مارتے کا کوئی ہاتھ پکڑے کہتے کی کو زبان تو نہیں پکڑی جا سکتی آخر کس کس سے لڑتے اور پھر لڑتے تو جب کوئی منہ در منہ بات ہوتی وہاں تو ہتھیلی مل کر چھٹہ اٹھایا جاتا اور خوب مزے لے لے کر فرضی داستانیں بیان کی جاتیں انو کے گھر والوں میں سے کسی کا گذر ہوتا۔ زبان کو تالے لگ جاتے۔

اور پھر ایک دن انو باجی کے بھی دن پھر گئے۔ چپکے چپکے تلاش تو عرصہ سے جاری تھی۔ اور نوبت یہ آ چکی تھی کہ خواہ کیسا بھی لڑکا ملے انو کے ہاتھ پیلے کر دیئے جائیں۔ مگر انو کی تقدیر سے اچھا ہی رشتہ مل گیا۔ مہدی پور کے زمیندار کے اکلوتے لڑکے رضا حسین سے رشتہ ہو گیا۔ ہڈی بوٹی سے درست کھاتے پیتے گھر کا لڑکا انو کے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ چپکے چپکے شکرانے کی نہ معلوم کتنی نمازیں پڑھ ڈالیں گئی ہوئی تندرستی بھی واپس آ گئی گاؤں والوں کو تو عین لال ڈوری کے خط کے روز علم ہوا کہ شادی کی بات پکی ہو گئی ہے۔ موسم تبدیل ہو گیا۔ رت بدل گئی نیک نامی بدنامی کے قصوں پر ایکدم خاک ڈال دی گئی روٹھے عزیز من گئے بچھڑے گلے مل گئے پرانے زخم بھر گئے امام ضامن

بندھا۔ پنجیریاں تقسیم کی گئیں مایوں بٹھانے کی رسم ادا کی گئی۔ گود بھری گئی۔ نکھار لگایا۔ مراثنوں نے ڈھولک بجائی گیت گائے۔ مہندی لگی۔ منڈھے کا دن آگیا۔ شامیانے تنا ئیں۔ تندور بھٹیاں۔ دیگیں سب سامان ٹھیک ہوگیا منتظمین اپنے اپنے دھندوں سے لگ گئے بارات کے دن مہمانوں کی آمد صبح سے ہی شروع ہوگئی سجے بنے ٹیپ ٹاپ کئے مردانے میں شیروانیاں اکڑفوں دکھانے لگیں زنانے میں ریشمی کپڑے سرسرانے اور زیورات چھنچھنانے لگے گود اور پیٹ میں بچے لئے عورتیں۔ اماں نے جہیز میں دل کھول کر کام لیا تھا۔ ریشمیں جوڑے، سوتی کپڑے زیورات برتن صندوق مسہری کسی چیز کی کمی نہ تھی تعریفیں سن سن کر گھر والے پھولے نہ سما رہے مردانے میں دیگیں کھڑکنے لگیں۔ تھپا تھپ تنوری روٹیاں تیار ہونے لگیں۔ زردے کے چاول۔ بریانی کا گوشت۔ حقوں کی گڑگڑ منتظمین کی بھاگ دوڑ۔ منے بھائی بھی انتظام کے سلسلے میں بھاگے بھاگے پھر رہے تھے گاؤں کی برادری کی لڑکی کا معاملہ تھا ایک کی عزت سب کی عزت ہوتی ہے ایسے موقعوں پر اختلاف تھوڑی دیکھے جاتے ہیں

مغرب کا وقت آگیا۔ بارات نہیں آئی ایک نے دوسرے سے کہا آتی ہوگی اور پھر کام دھندے میں لگ گئے عشاء کا وقت گزر گیا۔ اور بارات نہ آئی تو گھر کے مہمانوں کا کھانا شروع ہوگیا عورت بچے اور مرد سب کھانے سے نبٹ گئے اور بارات نہیں آئی مہدی پور قریب ہی تو تھا اور رات کے اتنے وقت گزر جانے کے بعد بارات کا نہ آنا تعجب خیز تھا پیٹ بھرے پر تو دور کی سوجھتی ہے۔ زنانے اور مردانے میں ایک دم چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں ایک کا منہ دوسرے کا کان سر ہلنے لگے اشارے ہونے لگے ناک پر انگلی رکھ کر ایک بولی اے خالہ ہے کچھ دال میں کالا۔ اور خالہ دری کے کونے کو الٹ کر پیک تھوکتے ہوئے بولیں۔ ہاں ہے تو سہی ضرور کچھ نہ کچھ میری تو تیسرے پہر سے آنکھ پھڑک رہی ہے۔ دوسری بولی کمبخت مداری کی بہو نے عین مایوں بٹھاتے وقت چھینکا تھا۔ اللہ خیر کرے گھوڑا سوار بارات کی خبر لینے دوڑ گئے سب کی نظریں راستے پر لگی ہوئی تھیں زنانخانہ میں منتیں مرادیں مانگی جانے لگیں کوئی سجدے میں گری کسی نے تسبیح شروع کی کسی نے مناجات پڑھی کوئی قرآن سر پر کھول کر کھڑی ہوگئی دوسری طرف مخالف قسم کی عورتوں نے بے پر کی چڑیاں اڑانا شروع کردیں منہ پچکائے آنکھیں مٹکائیں اور اماں کو دست لگ گئے ہر بار پیٹ میں مروڑ ہوتی لوٹا لے کر پاخانے کو بھاگتیں بھاوجوں کے منہ اتر گئے کنبہ والیوں کے چہرے لٹک گئے جب شدہ شدہ یہ خبریں پہنچیں تو وہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں لیٹے لیٹے ایکدم اٹھ کر بیٹھ گئی دل دھک دھک کرنے لگا پسینے پسینے ہوگئی سر چکرانے لگا گٹاگٹ بھرا کٹورا پانی کا پی گئی دل دل میں کہنے لگی اللہ پہلے ہی کونسی کسر رہ گئی تھی جواب پوری ہورہی ہے۔

رات کو دو بجتے بجتے گھوڑا سوار یہ خبر لے کر واپس آگئے کہ بارات اب نہیں آئے گی دولہا کی والدہ کی طبیعت ایکدم سخت خراب ہوگئی ہے۔ لینے کے دینے پڑ گئے ہیں اگر وہ بچ گئیں تو دوسری تاریخ کو بارات آئے گی زنانخانے میں کہرام مچ گیا مردانے میں سب کو سانپ سونگھ گیا ہنڈے بجھ گئے صبح کو زنانا اور مردانہ گھر بھائیں بھائیں

کر رہے تھے مٹی کے لوٹے ہوئے سکورے الٹے ہوئے گھڑے سنی ہوئی دیگیں پڑی تھیں۔ دیواروں پر چیل کوے بوٹیوں اور ہڈیوں کی تلاش میں بیٹھے کائیں کائیں کر رہے تھے انو کے مقدر پر بدقسمتی کی آخری مہر ثبت ہوچکی تھی۔

انو کی بیماری نے بہت طول پکڑا۔ پلنگ سے لگ کر رہ گئی۔ بیہوشی کے دورے مستقل پڑنے لگے حکیم۔ ڈاکٹر۔ تعویذ گنڈے۔ منتیں اور مرادیں ہوتی رہیں اور ساتھ کے ساتھ کوئی نہ کوئی یہ بھی کہہ گذرتا۔ توبہ توبہ کیسی صورت اور کیسے نصیب اس سے تو پیدا ہوتے ہی مرجاتی ماں باپ کی یوں ناک تو نہ کٹتی اللہ بری صورت بنادے پر نصیب برے نہ بنائے اور پھر تھوڑے دنوں کے بعد لوگ باگ انو کی شادی بیاہ کو ہی نہیں خود انو کو ہی بھول گئے۔ زندگی کے دوسرے دلچسپ اور نئے ہنگاموں کے سامنے انو کی پرانی داستان میں کہاں تک جاذبیت رہتی۔

پورے ایک سال کے بعد آج پھر ہر زبان پر انو کا تذکرہ تھا طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہورہی تھیں جنگل کی آگ کی طرح ہر گھر میں یہ خبر پھیل چکی تھی نائی ولیمہ کی دعوت کی، فہرست گھماتا پھر رہا تھا۔ انو کا نکاح تاروں کی چھاؤں میں شرعی حق مہر پر پانچ معزز حضرات کی موجودگی میں منے بھائی سے ہوگیا تھا۔ اور صبح کو بھائی منے کے دالان میں مسہری پر بیٹھی گھونگھٹ کاڑھے دلہن آنسو بہا رہی تھی عورتیں منہ دکھائی دے رہی تھیں باہر دیگیں کنکھنا رہی تھیں جب ولیمہ کا کھانا کھایا جارہا تھا تو یہ افواہ بھی گشت کر رہی تھی کہ انو کی بارات کے روز کوئی گھوڑے سوار مہدی پور کے باغوں میں رضا سے ملا تھا۔ تھوڑی دیر باتیں کیں اور جس سمت سے آیا اسی سمت چلا گیا دولہا جو وہاں سے لوٹا تو کنگنا سہرا نوچ کر پھینک دیا اور شادی سے انکار کردیا نہ اس نے ماں بہنوں کے رونے کی پرواہ کی اور نہ باپ کی آن بان اور ناک کی اور لوگ کہہ رہے تھے میاں لڑکی کی عزت تو کمہار کی کچی ہنڈیا کی طرح ہوتی ہے جو ایک مرتبہ چاک پر سے اتر کر دوبارہ نہیں چڑھ سکتی۔ لوگوں کا خیال ہے وہ گھوڑے سوار سوائے نورو قصائی کے اور کوئی نہیں تھا۔

سب کے دل منے بھائی کی طرف سے پاک ہوگئے مگر اماں نے منے بھائی سے نہ کبھی کلام سلام کیا اور نہ پردا توڑا۔ وہ جب بھی سسرال جاتے اماں جھٹ گھونگھٹ نکال کر کمرے کا رخ کرتیں کچھ اس قسم کی آواز سنائی پڑتی، جیسے اماں کہہ رہی ہوں۔ موا مکار۔ بھیڑیا۔ بڈھے منہ مہاسے۔ ٭



نقاش کاظمی

غزل

صلیب و دار سجانے کا اہتمام کرو
جنوں کا جشن مناؤ خرد کا نام کرو

نکل کے گردشِ دوراں سے لو وہ انگڑائی
فلک اسیر کرو وقت کو غلام کرو

اندھیری رات کے سائے سے تم نہ گھبراؤ
دلوں کے داغ جلاؤ اجالا عام کرو

پیو کہ نشۂ جشنِ بہار طاری ہے
خود اپنا خونِ جگر بھی شریکِ جام کرو

زمین مانگ رہی ہے شرابِ لالہ و گل
چمن میں رنگ بچھاؤ خزاں تمام کرو

اٹھو کہ رات چلی صبح ہونے والی ہے
نظامِ نو کے ترانوں کا احترام کرو

الف - میم

پاکستانی کسانوں کے مسائل

۱۴راگست ۱۹۴۷ء کی صبح ایک نئی صبح تھی۔ اس دن عوام نے ایک طویل اور صبر آزما جد وجہد کے بعد آزادی کی صبح دیکھی تھی۔ غلامی کی آہنی زنجیریں گر گئی تھیں یونین جیک سرنگوں ہو گیا تھا اور پاکستان کی سرزمین پر سبز ہلالی پرچم لہرا رہا تھا۔

مسلمانوں نے ایک آواز ہو کر پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔ ایک آزاد اور خود مختار مملکت کا مطالبہ جہاں مسلمان اپنے عقائد اور تہذیب کے مطابق اپنی زندگی گزار سکیں۔ اس آزادی کی جد وجہد میں اہم کردار اس ملک کے ۸۵ فی صد عوام نے ادا کیا تھا۔ وہ عوام جن کے پاس کچھ بھی نہیں تھا، ان کے پاس یا تو بیچنے کیلئے اپنی قوت محنت تھی یا پھر کسی زمیندار جاگیردار یا نواب کی زمینوں پر کاشت کرنے والے معصوم اور بھولے بھالے دیہاتی جنہوں نے اسلام کے نام پر اپنا سب کچھ لٹا دینے کی ٹھان لی تھی ان سے کہا گیا تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہوگا اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پریشانیوں کے دن ختم ہو جائیں گے اسلام تو مساوات کی تعلیم دیتا ہے اور اسلامی ریاست میں مساوات قائم کی جائے گی۔ یہ تھے وہ وعدے جن کی بنیادوں پر ایک ہمہ گیر تحریک چلی اور آخر کار دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک نمودار ہو گیا جس کا نام "پاکستان" تھا۔ پاک مقام۔ پاک لوگ۔ پاک نظام۔

آزادی کی صبح نمودار ہوئی اور ایک ایک گھر میں اس کی خوشیاں منائی گئی ہیں۔ سب آزاد ہو گئے تھے۔ ان کی اپنی حکومت قائم ہو گئی تھی — اور اس ملک کے کسان اور مزدور اپنے دکھ درد ختم ہونے کے دن قریب سمجھ رہے تھے۔ وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ اب ان کی محنت کا معقول معاوضہ ملے گا۔ جن زمینوں پر ہل چلائے جاتے ہیں ان کی اپنی ہو جائینگی ان کی محنت سے پیدا ہونے والا غلہ کوئی زمیندار اپنے گھر اٹھا کر نہیں لے جائے گا۔ اب ان سے کوئی بیگار نہیں لے گا۔ اب انہیں کوئی نیچ اور کم حیثیت تصور نہیں کرے گا۔ ان کے بچے بھی اسکول جائیں گے اور معاشرہ میں انہیں "مساوی" حقوق ملیں گے۔ لیکن جلد یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ انہوں نے بدیسی آقا کی غلامی سے تو نجات حاصل کر لی ہے لیکن وہی کرسیاں جو بدیسی آقا خالی کر کے گیا تھا۔ ان پر قبضہ کر لیا ہے اور وہ اسی جگہ پر کھڑے ہیں جہاں پہلے کھڑے تھے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام میں بھی۔ تبدیلی نہیں ہوئی اور وہ صبح جسکے لئے وہ منتظر تھے ابھی نہیں آئی تھی — کیونکہ تحریک آزادی کی قیادت جاگیردار زمیندار (اور سرمایہ دار) طبقہ کے ہاتھ میں تھی — یہ وہی طبقہ تھا جس نے ۱۸۵۷ء کی جد وجہد آزادی میں وطن دوست اور جانباز سرفروشوں کے مقابلہ میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اور اسی موقع پرست طبقہ کی غداری کی وجہ سے تحریک آزادی ناکام ہو گئی تھی اور اسی کے صلہ میں ان کو وہ جاگیریں عطا ہوئی تھیں جنہوں نے مادر وطن کو غلام بنانے میں انگریزوں سے تعاون کیا تھا۔

اس طبقہ کے تعلیم یافتہ افراد نے ساری دنیا میں اٹھتی ہوئی قوم پرستی کی لہر کو دیکھ لیا تھا اور اس طبقہ نے دوسری جنگ عظیم کے بعد استعماریوں کی گھٹتی ہوئی طاقت کو محسوس کر کے یہ جان لیا تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنا ہوگا اسی لئے یہ طبقہ آگے بڑھا اور اس ملک کے ان پڑھ اور بھولے عوام ان کی قیادت پر یقین کر بیٹھے۔ مذہب کے نام پر انہوں نے یقین کیا۔ انہوں نے سادگی سے ان پر بھروسہ کر لیا۔ لیکن یہ پردہ زیادہ دنوں تک پڑا نہ رہ سکا اور ان کے حقیقی چہرے سامنے آ گئے۔ ان جاگیرداروں، سرمایہ داروں کا ملک کے تمام وسائل پر تو قبضہ تھا ہی اسی طبقہ نے مقننہ پر بھی قبضہ کر لیا اور اس سے ایسے قوانین بنائے جو ان کے مفاد کی حفاظت کر سکیں اور حکومت کی پوری مشینری کو اس "طبقہ" کا دم چھلا بنا دیا۔

اس پس منظر میں جب ہم اپنے ملک عزیز کے کسانوں کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو انتہائی تکلیف دہ حقائق سامنے آتے ہیں — ملک کے ۸۰ فی صد سے زیادہ انسانوں پر مشتمل طبقہ کس مپرسی کے عالم میں زندگی گزار رہا ہے۔ وہ جاگیرداروں اور زمینداروں کے رحم و کرم پر ہے۔

تقسیم سے پہلے پاکستان کے علاقے زرعی پیداوار کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں مشہور تھا اور یہاں سے بڑی مقدار میں غلہ برآمد ہوتا تھا لیکن چند سالوں سے صورت حال یکایک بدل گئی ہے ۱۹۵۲ء میں غلہ کی قلت کے آثار ظاہر ہونے لگے جو بہت جلد انتہائی تشویشناک صورت اختیار کر گئے اور ملک میں قحط کے سے حالات پیدا

ہو گئے جس سے نہ صرف عوام کو بے شمار پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بلکہ ملک کے ترقیاتی منصوبوں پر بھی ان کا بہت برا اثر پڑا۔ ملک میں غلہ کی کمیابی دور کرنے کیلئے بھاری مقدار میں غلہ باہر سے منگوانا پڑا۔ پڑا۔ جس پر کثیر زرمبادلہ خرچ ہوا۔ اور ملک میں اقتصادی ترقی کے منصوبوں کی تکمیل کی راہ میں سخت رکاوٹیں پیدا ہو گئیں۔

اس کے علاوہ غلے کی قلت سے نہ صرف غلہ کی چوربازاری اور ناجائز منافع خوری کے رجحانات کو تقویت ملی اور غلہ کی قیمتوں میں بہت اضافہ ہو گیا بلکہ استعمال کی دوسری چیزوں کی قیمتیں بھی بہت بڑھ گئیں۔

پاکستان کاشت کاروں کا ملک ہے

اسی فیصد سے زیادہ آبادی کا تعلق زراعت سے ہے لیکن کتنی افسوسناک بات ہے کہ لوگوں کو معمولی خوراک بہم پہنچانے کیلئے بھی کل ضروریات کا دس فیصد غلہ باہر سے منگوانا پڑ رہا ہے۔ ۱۹۴۹ء سے لے کر ۱۹۵۹ء تک کے دس سالوں میں مغربی پاکستان میں اوسطاً صرف اتنی خوراک پیدا ہوتی کہ جس سے یہاں کے باشندوں کو ۲۰۰۰ کیلوری فی کس روزانہ کے حساب سے خوراک مہیا کی جا سکے۔

(کیلوری غذائی حرارت ناپنے کا پیمانہ یا اکائی ہے) حالانکہ بین الاقوامی خوراک و زراعت کی تنظیم کی تحقیقات کے مطابق پاکستان میں اوسطاً فی کس کم از کم ۲۳۰۰ کیلوری روزانہ کی خوراک ملنی چاہیئے۔ اسی طرح اچھی صحت کیلئے فی کس ۱۵ گرام لحمیاتی اجزاء ـــ PROTEINS کی روزانہ ضرورت ہے لیکن پاکستان میں ۷ گرام فی کس سے بھی کم میسر ہے اس اوسط میں امیر لوگوں کی بسیار خوری شامل ہے چنانچہ عام لوگوں کی خوراک نیم فاقہ کشی کے لگ بھگ ہے۔ خوراک کی کمی پوری کرنے کیلئے ۱۹۶۰ء میں ملک کی کل درآمدات کی قیمت کا ۲۵ فیصد خوراک پر خرچ ہوا ان درآمدات کے باوجود ۱۹۶۰ء میں لوگوں کو جو خوراک میسر آئی وہ دس سال پہلے یعنی ـــ ۵۰-۱۹۴۹ء کے مقابلے میں کم تھی اس بحران کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ مغربی پاکستان کی موجودہ آبادی کیلئے مناسب مقدار میں خوراک مہیا کرنے کیلئے غلہ کی پیداوار میں کم از کم ۳۰ فیصدی اضافہ کی فوری ضرورت لیکن غلے کی پیداوار میں سالانہ صرف دو فی صدی کا اضافہ ہو رہا ہے۔

آج سے کچھ سال پیشتر کال کو خدائی قہر تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن آج قحط کو کال سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا چیچک یا ہیضہ یا تپ دق سے۔ ان بیماریوں کی طرح قحط کی تشخیص ہو چکی ہے اور اس کا علاج انسانوں کے بس میں ہے۔ قدرتی حادثے ہو رہے ہیں۔ زلزلوں، طوفانوں، سیلابوں، اور اسی طرح کے دوسرے قدرتی مظاہر پر ابھی تک انسان کا اقتدار قائم نہیں ہوا۔ اور ان کی وجہ سے فصلیں تباہ ہو رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ لیکن ان آفتوں کو بھی انسانی ایجادات و صناعی نے بہت حد تک بے اثر کر دیا ہے اور آج دنیا میں انسانوں کے احاطۂ قدرت میں ہے کہ انسان کو بھوک سے نہ مرنے دیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ انسانی برادری ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائے آج دنیا کے ایک بہت بڑے حصہ میں وہاں کے مقامی باشندوں کی ضرورتوں سے کہیں زیادہ غلہ پیدا ہو رہا ہے۔ اور انسان کے پاس ایسے ذرائع آمد و رفت موجود ہیں جن کی مدد سے اس غلے کو قحط کے علاقوں میں آناً فاناً پہنچایا جا سکتا ہے۔

لیکن ابھی تک یہ دنیا انسانوں کی دنیا نہیں بنی۔ یہ منافع خوروں، بے درد لالچیوں کی دنیا ہے۔ چنانچہ انسانوں کی بھوک کو ان پر غلبہ پانے کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے خود ہمارے اپنے ملک میں یہ ہو چکا ہے غلے کی کمی کو بہانہ بنا کر سامراج کے پرانے چاکروں نے ملک کو پھر سامراجیوں کی جھولی میں ڈال دیا۔ کہ اپنے بین الاقوامی منصوبوں کی خاطر جس طور پر چاہیں استعمال کریں۔ آج قوم نے پھر آزادی کی طرف کروٹ لی ہے اور سامراجی چنگل سے آزاد ہونا چاہتی ہے لیکن غلے کی کمی اپنی جگہ موجود ہے اور ہمیں مجبور کر رہی ہے کہ ہم کسی نہ کسی کے ممنون ہوں۔ اس کے علاوہ ملک کے اندر صنعت کیلئے روئی، کپاس، گنا، تیلوں کے بیج اور دوسری اشیا کی ضرورت ہے جس کی وجہ سے غلے کیلئے زمین میں کمی آنے سے پیداوار میں کمی ہو گی۔ اس لئے قوم کے سامنے یہ سوال بھی اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ غلے میں خودکفیل ہوں یا صنعت کو کچا مال بہم پہنچائیں۔ اس کے علاوہ اگر ہنگامی حالات میں باہر سے درآمد بند ہو گئی تو قوم ان حالات کا کیسے مقابلہ کر سکے گی میدان جنگ کی بجائے ہمیں اپنے ہی کھیتوں میں شکست ہو گی اس لئے زرعی پیداوار میں اضافے کا مسئلہ قوم کیلئے بقا کا مسئلہ بن گیا ہے اور اس کا حل قومی خودداری، استقلال اور صحت و توانائی کیلئے نہایت ضروری ہے۔ سوال اٹھتا ہے کہ کیا پاکستان کے اس مسئلے کا حل ہے یا ہماری قوم پیدا ہوتے ہی بوسیدہ ہو گئی ہے۔

زرعی پیداوار کا انحصار زمین کی زرخیزی اور اس کے استعمال پر ہوتا ہے اگر زمین زرخیز ہے لیکن اس کا استعمال صحیح نہیں ہے ـــ تو پیداوار تسلی بخش نہیں ہوگی اور اگر زمین بیکار ہے تو اس پر کتنی بھی محنت کی جائے خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلے گا۔ زمین کی زرخیزی کا انحصار اس کی قدرتی صلاحیتوں کے علاوہ موسم کی مناسبت اور پانی اور کھاد کی سپلائی پر ہوتا ہے اور اس کے اچھے استعمال کا دارومدار محنت کاشت کاری کے مناسب طریقے اچھے بیج۔ مفید فصلوں پر ہوتا ہے سائنس کے موجودہ دور میں زرعی سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ کمزور سے کمزور زمین سے بھی نہایت عمدہ فصلیں لی جا رہی ہیں۔

محکمہ خوراک و زراعت کے ۵۷-۱۹۵۶ء میں حاصل کئے گئے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کا کل رقبہ ۲۳ کروڑ ۳۸ لاکھ ایکڑ کے لگ بھگ ہے۔ اس میں سے تین کروڑ چون لاکھ ایکڑ مشرقی پاکستان میں اور انیس کروڑ چوراسی لاکھ ایکڑ مغربی پاکستان میں ہے۔ مغربی پاکستان کے اس رقبہ میں سے آٹھ کروڑ ۲۶ لاکھ یعنی کوئی ۳۶ فی صدی قبائلی علاقہ میں ہے جس کے بارے میں ریکارڈ نہ ہونے کی وجہ سے اعداد و شمار موجود نہیں ہیں اس کے علاوہ مغربی پاکستان میں پانچ کروڑ ایکڑ ایسے ہیں جو صرف چراگاہ کے طور پر استعمال ہو سکتے ہیں دونوں صوبوں میں ۳۱ لاکھ ایکڑ فی صوبہ کے حساب سے رقبہ جنگلات کے تحت ہے کچھ اور رقبہ جات بھی ایسے ہیں جہاں کاشت نہیں ہو سکتی چنانچہ ان اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں کل رقبہ زیر کاشت ۶ کروڑ ۱۳ لاکھ ایکڑ ہے جس میں سے ۲ کروڑ ۲۳ لاکھ مشرقی پاکستان میں اور ۳ کروڑ ۹۰ لاکھ مغربی پاکستان میں ہے۔ مشرقی پاکستان میں ایسا رقبہ جہاں ایک سے زیادہ فصلیں سالانہ ہوتی ہیں۔ ۶۹ لاکھ ایکڑ ہے اور مغربی پاکستان میں ... ۳۹ لاکھ ایکڑ اس طرح سے مشرقی پاکستان میں کل رقبہ کا ۶۳ فیصد زیر کاشت ہے اور مغربی پاکستان میں کل رقبہ کا صرف بیس فیصد، اس بیس فیصد میں نصف کا انحصار مصنوعی آبپاشی پر ہے۔

۱۹۶۰ء میں حاصل کئے گئے اعداد و شمار کے مطابق مغربی پاکستان میں شخصی ملکیت میں کل زرعی رقبہ ۴ کروڑ ۸۹ لاکھ ایکڑ ہے جس میں سے زیر کاشت رقبہ تین کروڑ ۷۲ لاکھ ایکڑ ہے اس زمین پر کوئی ۴۸ لاکھ کاشتکار گھرانے آباد ہیں اس طرح سے فی گھر کل ۱۰ ایکڑ ہے اور باقی خالی ہے ۸ لاکھ سے کچھ اوپر گھر ایسے ہیں جو بھینس گائے بکری بھیڑیں یا مرغیاں پال کر گزارہ کرتے ہیں۔ لیکن کاشت کاری میں حصہ نہیں لیتے۔

- ان ۴۸ لاکھ زرعی گھرانوں میں سے ۲۰ لاکھ ایسے ہیں جو اپنی ہی ملکیتی اراضی پر کاشت کرتے ہیں۔ ۸ لاکھ ایسے ہیں جن کے پاس تھوڑی سی بہت اراضی ہے ـــ اور باقی دوسروں سے بٹائی یا پٹہ ـــ پر لیکر کاشت کرتے ہیں ۷ لاکھ افراد کھیت مزدور ہیں۔
- مغربی پاکستان میں کھیتوں میں ہل وغیرہ چلانے کیلئے کل ۹۴ لاکھ بیل بھینسے وغیرہ

استعمال میں لائے جاتے ہیں اس طرح سے گویا ۲ کام کرنے والے جانور فی زرعی کنبہ موجود ہیں۔

● مغربی پاکستان میں ۱۶ لاکھ زرعی خاندان مقروض ہیں۔ کل قرضہ ۲۹ کروڑ ہے اور جس میں سے کوئی بارہ کروڑ سرکاری ذرائع سے اور ۱۷ کروڑ نجی طور پر حاصل کیا گیا ہے۔

● مغربی پاکستان میں، ۲۹ لاکھ کاشتکاریاں ٹکڑوں میں تقسیم ہیں۔ ایسا انتشار زدہ رقبہ ۳ کروڑ ۴ لاکھ ایکڑ ہے۔

● مغربی پاکستان میں ساڑھے سات لاکھ سے کچھ کم کاشتکاریاں ایسی ہیں جن کا رقبہ ایک ایکڑ سے کم ہے۔ یہ کل کاشتکاریوں کا ۱۵ فیصد ہیں۔ لیکن کل رقبہ کا ایک فیصد ان کے تحت ہے۔

● ساڑھے آٹھ لاکھ کاشت کاروں کا رقبہ ایک ایکڑ اور اڑھائی ایکڑ کے درمیان ہے یہ کل کاشت کاریوں کا ۱۸ فی صد ہیں اور ان کے نیچے رقبہ کل کا ۳ فی صد ہے۔

● آٹھ لاکھ کاشت کاروں کا رقبہ اڑھائی اور پانچ ایکڑ کے درمیان ہے یہ کل کاشت کاریوں کا ۱۶ فیصد ہیں اور ان کے نیچے رقبہ کل کا ۶ فیصد ہے۔

● پونے چھ لاکھ کاشتکاریاں پانچ اور ساڑھے سات ایکڑ کے درمیان رقبہ والی ہیں۔ ان کی تعداد کل کی ۱۲ فیصد اور رقبہ کل کا ۷ فیصد ہے

● ساڑھے سات لاکھ سے کچھ اوپر کاشت کاریاں ساڑھے سات اور ساڑھے بارہ ایکڑ کے درمیان رقبہ والی ہیں ان کی تعداد کل کی ۱۶ فیصد اور رقبہ ۱۵ فیصد ہے۔

● سوا سات لاکھ سے کچھ اوپر کاشت کاریاں رقبہ میں ساڑھے بارہ اور ۲۵ ایکڑ کے درمیان ہیں۔ ان کی تعداد کل کی ۱۵ فیصد اور رقبہ ۲۶ فیصد ہے۔

● پونے تین لاکھ سے کچھ اوپر کاشت کاریاں رقبہ میں ۲۵ اور ۵۰ ایکڑ کے درمیان ہیں ان کی تعداد کل کاشتکاریوں کا ۶ فیصد اور رقبہ ۱۹ فیصد ہے۔

● ستاسی ہزار کاشتکاریاں رقبہ میں ۵۰ اور ۱۵۰ ایکڑ کے درمیان ہیں یہ کل کا ۲ فیصد تعداد میں اور ۱۳ فیصد رقبہ میں ہیں۔

● چودہ ہزار کے لگ بھگ کاشت کاریاں رقبہ میں ۱۵۰ ایکڑ سے اوپر ہیں یہ کل کا نصف فیصدی سے کم تعداد میں ہیں لیکن رقبہ میں کل کا ۱۰ فیصد ہیں۔

●●● کاشتکاریوں کے رقبہ اور تعداد کے بارے میں ظاہر ہوا کہ ۵ ایکڑ سے کم والیوں کی تعداد کل کا ۴۹ فیصد ہے لیکن ان کا رقبہ کل زیر کاشت رقبہ کا ۱۰ فیصد ہے اڑھائی ایکڑ سے کم والی کاشتکاریوں کی تعداد کل کا ۳۳ فیصد ہی لیکن رقبہ کل رقبہ کا صرف ۴ فیصد ہے۔

ساڑھے بارہ ایکڑ سے کم والی کاشت کاریوں کی تعداد کل کا ۶۱ فیصدی ہے اور ان کا رقبہ کل کا ۳۲ فیصدی ہے۔

اس کے برعکس پچیس ایکڑ سے اوپر رقبہ والی کاشتکاریوں کی تعداد کل کا صرف ۸ فیصدی ہے لیکن ان کے رقبہ کا تناسب کل کا ۴۲ فیصدی ہے۔

مارشل لاء کی زرعی اصلاحات میں ملک کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد معاشی قطعہ کی حد مغربی پاکستان کے کراچی حیدرآباد اور خیرپور ڈویژنوں میں ۶۴ ایکڑ اور باقی مغربی پاکستان میں ۵۰ ایکڑ مقرر کی گئی ہے۔ کوئٹہ اور قلات ڈویژنوں کو مخصوص حالات پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور گزاری قطعہ کی حد معاشی قطعہ سے ایک چوتھائی مقرر کی گئی ہے۔

معاشی قطعے سے مراد وہ قطعہ زمین ہے جسے اچھے اور سود مند طریقے سے کاشت کیا جا سکے۔ اور جس سے کاشت کار کو اتنی پیداوار حاصل ہو سکے کہ وہ اپنے افراد کنبہ کا معیار زندگی معقول حد تک برقرار رکھ سکے جس میں تعلیم، خوراک، لباس، علاج شامل ہیں۔ گزاری قطعہ سے مراد قطعہ اراضی ہے جس سے کم زمین پر کاشت نہ مفید ہے اور نہ ہی اس سے کاشت کار کی کم سے کم ضروریات پوری ہو سکتی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ معاشی اور گزاری قطعات کا رقبہ نہری زمین کے حساب سے مقرر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ بارانی زمینوں میں یہ رقبہ دگنا ہو جائے گا۔

مغربی پاکستان میں کل زیر کاشت زمین ۲۷۰۳ لاکھ ایکڑ ہے جس میں نصف چاہی — یعنی مصنوعی آبپاشی کے تحت ہے۔ اور نصف بارانی — اس حساب سے اس کی کوئی ۵½ لاکھ معاشی قطعوں میں تقسیم ہو گی یعنی ۵½ لاکھ زرعی خاندان مغربی پاکستان کی تمام زمین آباد کر سکتے ہیں۔ گویا اس حساب سے ۴۸ لاکھ زرعی خاندان میں سے ۲۵½ لاکھ خاندان زمین پر فالتو ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر اس اراضی کو ۲۲ لاکھ گزاری قطعوں میں بھی تقسیم کر دیا جائے تو بھی ۲۶ لاکھ خاندان فالتو رہیں گے۔ بالفرض اگر تمام کی تمام کو سیراب بھی مان لیا جائے تو بھی معاشی اور گزاری قطعات کی تعداد بالترتیب ۷½ لاکھ اور ۳۰ لاکھ میں کسی صورت میں بھی زیادہ نہیں ہوتی اس لحاظ سے بھی بالترتیب ۴۰½ لاکھ یا ۱۸ لاکھ خاندان قابل کاشت اراضی پر فالتو رہیں گے۔ اگر ان خاندانوں کو بھی زمین پر رکھنا ہو تو گزاری قطعہ کے حساب سے دو کروڑ پچیس لاکھ ایکڑ مزید اراضی کی ضرورت پڑے گی۔ ایک اندازے کے مطابق مغربی پاکستان میں ۲ کروڑ ۷۰ لاکھ ایکڑ کے قریب زمین ایسی ہے جو قابل کاشت ہے لیکن ابھی تک اسے کاشت نہیں کیا گیا موجودہ حالات میں ان زرعی خاندانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے جن کے پاس گزاری قطعہ زمین بھی نہیں ہے ان کی تعداد کل زرعی خاندانوں کا ۶۱ فیصد ہے۔ پانچ ایکڑ سے کم کاشت کرنے والوں کی تعداد کل کا ۴۹ فیصد ہے ۳۳ فیصد ایسے ہیں جن کے پاس اڑھائی ایکڑ سے کم زمین ہے ان اعداد و شمار سے کسانوں کی غربت کے علاوہ ان کی بیکاری کا پتہ بھی چلتا ہے کہ کس طرح زمین نہ ہونے کی وجہ سے ان کے پاس کرنے کو کام نہیں ہے۔

ملک میں پیداوار کی کمی کا ایک سبب بلکہ سب سے بڑا سبب زمین کی غلط تقسیم ہے جس کی وجہ سے دیہات کی آٹھ فیصدی آبادی کے پاس ۴۲ فیصد زمین ہے اور ۹۲ فیصد کے پاس صرف ۵۸ فیصدی۔ اس کے علاوہ بیشتر لوگوں کے پاس زمین کے اتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں کہ وہ ان پر پوری محنت نہیں کر سکتے۔ جس کی وجہ سے دیہات میں نیم بیکاری انتہا کو پہنچ گئی ہے۔

یہ بیکاری کاشت کاروں تک محدود نہیں ہے۔ ان کے بیل بھی اس میں شامل ہیں ایک بیلوں کی جوڑی ساڑھے بارہ ایکڑ نہری زمین یعنی گزارہ یونٹ کیلئے کافی ہے۔ مغربی پاکستان میں کل ۳۰ لاکھ گزارہ یونٹ بھی مان لئے جائیں — تو ساٹھ لاکھ بیلوں کی ضرورت ہو گی۔

اس وقت کھیتی باڑی کے کام کیلئے ۹۴ لاکھ سے اوپر مویشی ہیں یعنی ۳۴ لاکھ مویشی بے کار پڑے ہیں اور زراعت پر بوجھ بنے ہوئے ہیں۔

زراعت سے بیکاری دور کرنے کیلئے اور زمین سے دباؤ دور کرنے اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کیلئے بہت سے اقدامات کرنے پڑیں گے جن میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں۔

۱:- زمین کی از سر نو تقسیم تاکہ ہر کاشت کار کو کم از کم گزارے کیلئے زمین مل جائے تاکہ وہ اپنی اور زمین کی صلاحیتوں کو پورا پورا اجاگر کر سکے۔ یہ نئی تقسیم دو طریقوں سے ہو سکتی ہے ایک تو زرعی اصلاحات کے ذریعے موجودہ بے ڈھب تقسیم کو درست کیا جائے اور جن لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ زمین ہے ان سے لیکر ضرورت مندوں کو دی جائے اور دوسرے آبپاشی کے نئے منصوبوں کے ذریعے جو نئی زمینیں آباد ہو رہی ہیں ان کو صرف کم زمین والے اور بے زمین کاشت کاروں میں تقسیم کیا جائے۔

۲:۔ ملک میں صنعت کو ترقی دی جائے تاکہ زراعت پر سے فالتو کارکن اٹھا کر کارخانوں میں لگائے جائیں۔

۳:۔ گھریلو صنعت، شہد، مرغیاں اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی پیداوار کو ترقی دی جائے۔

۴:۔ قومی ترقی کے منصوبے بنائے جائیں جن میں دیہاتیوں کی بڑی تعداد میں شمولیت کو ملحوظ رکھا جائے۔ تاکہ بے کاری کو مفید کام میں تبدیل کیا جا سکے۔

۵:۔ وسیع کاشت کی جگہ عمیق کاشت کی طرف توجہ کی جائے۔

ایک عرصے سے ملک میں زرعی اصلاحات کے لئے آواز اٹھائی جا رہی ہے زرعی اصلاحات سے عموماً مراد یہ لی جاتی ہے کہ بڑی زمینداریوں کو توڑ کر زمین کو کاشتکاروں میں بانٹ دیا جائے۔ زرعی اصلاحات ایک عالمی تحریک کی شکل اختیار کر رہی ہے اشتراکی ملکوں کے علاوہ دنیا کے تمام پسماندہ ملکوں میں قوم پرست طبقہ ان کے حق میں آواز اٹھا رہا ہے۔ زرعی اصلاحات کے مطالبے کے جواز میں بہت سی وجوہات پیش کی جا رہی ہے۔ مثلاً یہ کہ بڑی زمینداریوں میں کاشت کار کو محنت کا پورا پورا معاوضہ نہیں ملتا۔ بلکہ زمیندار اس کی پیداوار کا بیشتر حصہ جائز، یا ناجائز طور پر خود غصب کر لیتا۔ کاشت کار معاشی معاشرتی اور سیاسی لحاظ سے زمیندار کا ادنی غلام بن کر رہ جاتا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ موجودہ زمینداریوں کو بغیر معاوضہ دیئے ختم کر دینا چاہیئے کیونکہ زمین داروں نے یہ زمین محنت اور قابلیت سے حاصل نہیں کیں۔ بلکہ قوم اور وطن سے غداری کے صلے میں برطانوی حکومت کی طرف سے انہیں یہ زمینیں عنایت کی گئی تھیں وہ ان سے کافی فائدہ اٹھا چکے ہیں اس لئے اب جب کہ ملک آزاد ہو چکا ہے ان کو ان زمینوں پر حق حاصل نہیں۔ یہ پوری قوم کی ملکیت ہیں بڑی زمینداریوں پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی وجہ سے ملک کی زرعی پیداوار میں خطرناک حد تک کمی آ رہی ہے۔ زرعی اصلاحات کا ایک اور پہلو زمیندار کے مقابلے میں کاشتکار کے حقوق کی محافظت ہے مثلاً کاشت کار کے حصے میں اضافہ نقد لگانداری، بے دخلی کی روک تھام، تمام ناجائز وصولیوں اور بے گاریوں کا امتناع، حکومت کے واجبات میں زمیندار اور کاشت کار کی حصہ بندی مزارع تابع مرضی TENANT—AT—WILL کے حقوق کی حفاظت وغیرہ۔ زرعی اصلاحات کا ایک مزید پہلو کاشت کاری نظام کی عام اصلاح ہے مثلاً، اشتمال اراضی، چھوٹے چھوٹے غیر معاشی قطعات کو معاشی بنانا، انتشار اراضی روکنے کیلئے قانون وراثت میں تبدیلی، بندوبست مالیہ زمین میں تبدیلی۔ تعاونی کاشت کار رواج وغیرہ۔

پاکستان بننے کے بعد سب سے پہلے ۱۴ اپریل ۱۹۴۸ء کو پنجاب میں زرعی اصلاحات کمیٹی بنائی گئی جس نے ۲۹ اگست ۱۹۴۹ء کو زرعی اصلاحات کے بارے میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس میں ایک سفارش کی تھی کہ بڑی بڑی زمینداریوں کا خاتمہ کر کے زمین کو مزارعین میں تقسیم کر دیا جائے کسی شخص کے پاس نہری زمین کے ۱۵۰ اور بارانی کے ۴۵۰ ایکڑ سے زیادہ نہ ہوں۔ زمیندار کیلئے ۲۵ ایکڑ سے زائد خود کاشت رقبہ ممنوع قرار دیا جائے زرعی پیداوار میں مزارع کا حصہ بڑھا کر ۶۶ فیصد کر دیا جائے لیکن جلد ہی بڑے زمینداروں کی حکومت پر گرفت مضبوط ہو گئی اور ان اصلاحات پر عملدرآمد نہ ہوا۔ بہر حال ان میں معاوضہ کی شرح اتنی زیادہ تھی کہ کل معاوضہ تقریباً ۴۰۰ کروڑ روپے بنتا تھا جس میں سے ۳۰۰ کروڑ نقد اور یکمشت ادا کرنے پڑتے۔

پہلے پانچ سالہ منصوبے میں زرعی اصلاحات کے نفاذ پر زور ہی نہیں دیا گیا بلکہ زراعت کی ترقی کے لئے ریڑھ کی ہڈی قرار دیا گیا۔ ان میں بھی۔ ذاتی ملکیت فی کس کی حد ۱۵۰ ایکڑ نہری نیم نہری (چاہی) ۳۰۰ ایکڑ اور بارانی ۴۵۰ ایکڑ مقرر کی گئی ہے۔ حاکم طبقے نے ان کو بھی ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ بلکہ ان کے محرک کو ملازمت سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ ان کے علاوہ پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد میں چھوٹے موٹے قوانین پاس ہوتے رہے ہیں جن کا مقصد مزارعوں کا تحفظ رہا ہے لیکن مزارعوں کی تنظیمی کمزوری اور زمینداروں کی طاقت کی وجہ سے یہ قوانین محض قانون کی کتابوں کی زینت بنے رہے ہیں۔

۱۹۵۰ء میں مشرقی پاکستان میں قانون کے ذریعہ بندوبست دوامی کی لعنت کو ختم کر دیا گیا اور کاشت کار اور حکومت کے درمیان لگان وصول کرنے والے تمام واسطوں کو منسوخ کر دیا گیا۔ حد ملکیت ۱۰۰ بیگھے یعنی ۱۳۲ ایکڑ مقرر کی گئی یا کنبے کے ہر فرد کیلئے ۱۰ بیگھے جو بھی زیادہ ہو۔

مارچ ۱۹۵۹ء میں حکومت نے مارشل لاء ریگولیشن ۶۴ کے ذریعے اپنی زرعی اصلاحات کی پالیسی کا اعلان کر دیا جس میں تمام جاگیریں۔ بحق سرکار بلا معاوضہ ضبط کر لی گئیں شخصی ملکیت کی حد نہری ۵۰۰ ایکڑ اور بارانی کے ۱۰۰۰ ایکڑ مقرر کر دیے گئے، یا ۳۶۰۰۰ پیداواری یونٹوں کے برابر زمین رکھنے کی اجازت دیدی گئی۔ اس کے علاوہ ۱۵۰ ایکڑ زمین باغات و چراگاہ کیلئے اجازت دیدی گئی اور بڑے زمینداروں کو یہ بھی اجازت دی گئی کہ ۱۸۰۰۰ پیداوار یونٹوں کے برابر رقبہ اپنے لواحقین میں ہبہ کر سکیں۔ گھوڑی اور گائے پال فارموں کے رقبے کو گورنمنٹ کی مرضی کے تابع کر دیا گیا۔

ایک اندازے کے مطابق ان اصلاحات کے ذریعے بڑے زمینداروں سے کل ساڑھے اکیس لاکھ ایکڑ رقبہ لیا گیا ہے اس رقبہ میں سے ۴۰۷ ہزار ایکڑ جنگلات کے تحت ہے۔ ساڑھے گیارہ لاکھ ایکڑ قابل کاشت ہے لیکن زیر کاشت نہیں۔ ۸۴ ہزار ایکڑ دریا برد ہے ۵۹ ہزار پتھریلے اور دو لاکھ ایکڑ کے قریب غیر ممکن یعنی ناقابل کاشت ہے۔ بعض زمینداروں کی معاوضہ کے سود کی آمدنی زمین کی سابقہ آمدنی بڑھ گئی ہے وہ اس طرح کہ جو رقبہ پہلے بیکار پڑا تھا۔ اب اس کی مجوزہ قیمت یعنی ۵ روپے فی یونٹ پر سود آنے لگا ہے ان زرعی اصلاحات کے نتیجے میں جو اراضی اب تک مزارعوں تک پہنچی ہے وہ صرف چھ لاکھ ایکڑ سے کچھ اوپر ہے۔

مغربی پاکستان میں بے شمار قابل کاشت زمین پانی نہ ہونے کی وجہ سے بنجر پڑی ہے جوں جوں پانی کی بہم رسانی کے انتظامات ہو رہے ہیں یہ زمین آباد ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں حکومت نے مندرجہ ذیل بڑے منصوبوں پر عملدرآمد شروع کر دیا ہے گئی اور چھوٹی چھوٹی سکیمیں بھی پانی کی فراہمی اور تقسیم کے بارے میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہیں۔ یا مکمل ہو رہی ہیں۔

نام سکیم	زیر کاشت آنیوالا رقبہ (ایکڑوں میں)	
۱:۔ کرم گڑھی سکیم	ایک لاکھ	۵۰ ہزار
۲:۔ تھل پراجیکٹ	۱۱ لاکھ	۷۶ ہزار
۳:۔ تونسہ بیراج پراجیکٹ	×	۴۳ ہزار
۴:۔ مرالہ راوی لنک	۱ لاکھ	×
۵:۔ رسول ٹیوب ویل پراجیکٹ	۵ لاکھ	۷۸ ہزار
۶:۔ مرکزی " " "	۸ "	۷۰ "
۷:۔ غلام محمد بیراج	۱۳ "	۶۹ "
۸:۔ گدو بیراج پراجیکٹ	۹ "	۷ "
۹:۔ سناری بولان آبپاشی سکیم	×	۲۴ "
۱۰:۔ عباسیہ نہر کی توسیع کی سکیم	۲ لاکھ	۷۴ "
۱۱:۔ وارسک پراجیکٹ	×	۷۵ "
مشرقی پاکستان		
۱۲:۔ گنگا کوباڈک پراجیکٹ	×	۹۵ ہزار
۱۳:۔ تیستہ بیراج پراجیکٹ	۵ لاکھ	۱۰ ہزار
۱۴:۔ دولت خان بند	×	۱۶ "
کل میزان	۱۶۱ لاکھ	۷۸ ہزار ایکڑ

ضرورت اس امر کی ہے کہ اس زمین کو غیر حاضر مالکان کی بجائے حقیقی کاشتکاروں کو دیا جائے لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو رہا ہے

اور اس سرکاری زمین پر سرکاری افسروں ۔ اور دوسرے صاحبِ اثر لوگوں پر مشتمل غیر حاضر زمین داروں کا ایک نیا طبقہ پیدا کیا جا رہا ہے اور یہ نئے زمیندار خاندان زمینداروں سے کہیں زیادہ سخت گیر ہیں کیونکہ ان کو زمین کے علاوہ سرکاری عملے کی ہر طرح کی حمایت اور معاونت حاصل ہے سرکاری زمین کی اس غلط تقسیم سے کاشتکاروں کی حق شکنی ہی نہیں ہو رہی ہے بلکہ زرعی پیداوار میں بہت کمی آ رہی ہے۔ سندھ کے کئی گاؤں میں ایسا ہوا ہے کہ ہاری پشتوں سے سرکاری زمینوں پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے جنگلات صاف کئے تھے زمینوں کے بڑے بڑے ٹیلے ہموار کئے گئے تھے۔ بعض نے کنوئیں بھی کھود لئے تھے۔ کہیں کہیں ٹیوب ویل بھی لگ گئے۔ نہر کا پانی آنے سے یہ زمین کئی گنا پیداوار دے سکتی تھی لیکن پانی کا آنا ہاریوں کیلئے رحمت کی جگہ زحمت بن گیا اور پشتوں سے وہ جس گھڑی کے انتظار میں تھے وہ اپنے ساتھ بے دخلی لے کر آئی اور زمین کاشتکاری سے غیر متعلق لوگوں میں تقسیم کر دی گئی۔

یہ ہیں وہ حالات جن سے پاکستان کے کسانوں کا سامنا ہے اور ان حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے خود کسانوں کو متحد ہو کر جد و جہد کرنا ہو گی اس میں کوئی شک نہیں کہ وطن کی خدمت کے جذبہ سے سرشار کارکن ان حالات کے خاتمہ کے لئے کام کر رہے ہیں کسان ایک ایسی پسی ہوئی مخلوق ہے جو ہزاروں سالوں سے زبردستوں کا مرغوب شکار رہی ہے چنانچہ کئی نسلوں کے استحصال نے اسے بے جان کر دیا ہے اور طرح طرح کے بوجھوں کو سر جھکا کر بغیر احتجاج کے برداشت کرنے کی اس کی عادت پختہ کر دی ہے۔ مایوسی نے اسے قسمت کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ تعلیم کی کمی، سورج، ہوا، بارش، سردی، گرمی کے آگے بےبسی طاقتوروں کے ڈر نے کسانوں کو توہم پرست بنا دیا ہے۔ مفلسی نے رہی سہی کسر پوری کر دی ہے اور اس محنت کش طبقے کا شیرازہ بُری طرح بکھرا ہوا ہے۔ آپس کی کشمکش جھگڑے چھوٹے چھوٹے لالچ فساد اور رقابتیں، مذہبی تفرقے، ذات پات اور برادری کی عصبیتیں سب مل کر کسانوں کے اتفاق کو برباد کرتی رہتی ہیں۔

یہ تو کسان کی اپنی کمزوریاں ہوئیں جو ان کو ایک تنظیم میں منسلک ہونے سے روکتی ہیں اس کے علاوہ وہ لوگ بھی تنظیم کی راہ میں روڑا اٹکاتے رہتے ہیں جن کے مفاد کو اس تنظیم سے خطرہ ہے یہ لوگ زیادہ تر استحصالی طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور چونکہ حکومتیں اکثر ان کی تابع فرمان ہوتی ہیں اس لئے وہ ایسے قوانین پاس کرا لیتے ہیں جن کی وجہ سے محنت کشوں کی تنظیم کی راہ میں دشواریاں کھڑی کر دی جاتی ہیں اور جو سرکار سے بن نہیں پڑتا وہ اپنے رعب و داب اور دبدبے طاقت اور دولت کے بل بوتے پر حاصل کر لیتے ہیں۔

ان حالات میں کسانوں کو اکٹھا کرنا بہت مشکل کام ہے مزدوروں کے برعکس جو اکثر بڑی تعداد میں ایک ہی جگہ مل کر کام کرتے ہیں کسان اپنے اپنے کھیتوں میں علیحدہ علیحدہ کام کرتے ہیں اس کے علاوہ مزدور کا ذرائع پیداوار میں اپنا کوئی حصّہ نہیں ہوتا اس لئے ہڑتال اس کا ایک مؤثر حربہ ہوتا ہے کسان کا فصل میں اپنا حصّہ بھی ہوتا ہے اس لئے نہ وہ ہڑتال کر سکتا ہے اور نہ ہی کام سے غیر حاضر رہ سکتا ہے۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ کسی ملک کی معیشت کی نجات صرف زرعی پیداوار میں نہیں ہے ترقی یافتہ ملکوں میں آبادی کا صرف بارہ سے بیس فیصدی تک حصہ کاشت کاری کے ذریعہ روزی کما رہا ہے اس لحاظ سے ہماری دیہی آبادی کا نصف حصہ زمین سے ہٹ کر صنعت میں کام کرنے لگے گا۔ تو جب کہیں پاکستان کچھ حد تک ترقی پذیر ملک کہلائے گا۔ خود زراعت کی ترقی کیلئے ملکی صنعت کا ہونا بہت ضروری ہے ملک میں صنعت کیلئے کسانوں کو مزدور، دانشوروں، طالب علموں ٹیچروں، پروفیسروں، دوکانداروں، پیشہ وروں اور دوسرے محب وطن عناصر کا تعاون حاصل کرنا ہو گا۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔

پاکستان کے کسانوں کا مسئلہ بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے۔ تمام ——— ملکوں میں سامراج کے بوجھ کا استحصال تمام تر کسانوں پر پڑتا ہے اس لئے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں جو جنگ سامراج کے خلاف لڑی جا رہی ہے اس کی کامیابی میں پاکستان کے کسان کی بھی کامیابی ہے۔ جنوبی ایشیا میں سامراجی طاقتیں جو جنگ کے شعلے بھڑکانے کی کوشش میں ہیں اس کا مقابلہ کرنا بھی کسانوں کے مفاد کے عین مطابق ہے ان کا مفاد اسی میں ہے کہ تمام ایشیائی قوموں میں صلح و آشتی پیدا ہو تاکہ یہ مل کر سامراج کو نکال باہر کریں اور اس طرح صدیوں کی لوٹ کھسوٹ بند ہو۔ امن قائم ہو۔ اسلحہ بندی پر خرچ کم ہو، اور لوگ چین کا سانس لے سکیں۔ دنیا کے ان پسماندہ ممالک میں اندرون ملک کی استحصالی قوتیں بھی اسی نوعیت کی ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں ہیں یعنی بڑی زمین داریاں اور اجارہ دار سرمایہ داری جس کا افسر شاہی کے ساتھ گٹھ جوڑ ہو گیا ہے۔ اس لئے وہاں کے کسانوں کا ملک کے کسان اندر اور باہر کی استحصالی قوتوں کے خلاف جد و جہد کا تجربہ ہمارے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اور ہم ایک دوسرے کو جانی اور مالی نہیں تو اخلاقی، علمی، اور تجرباتی امداد ضرور دے سکتے ہیں۔



غزل

آذر حفیظ احمد

اے دلِ زار نہ تڑپا ہم کو
کم نہیں ہے غمِ دنیا ہم کو

ڈوب جانے کیلئے کافی ہے
اپنے ہی اشک کا دریا ہم کو

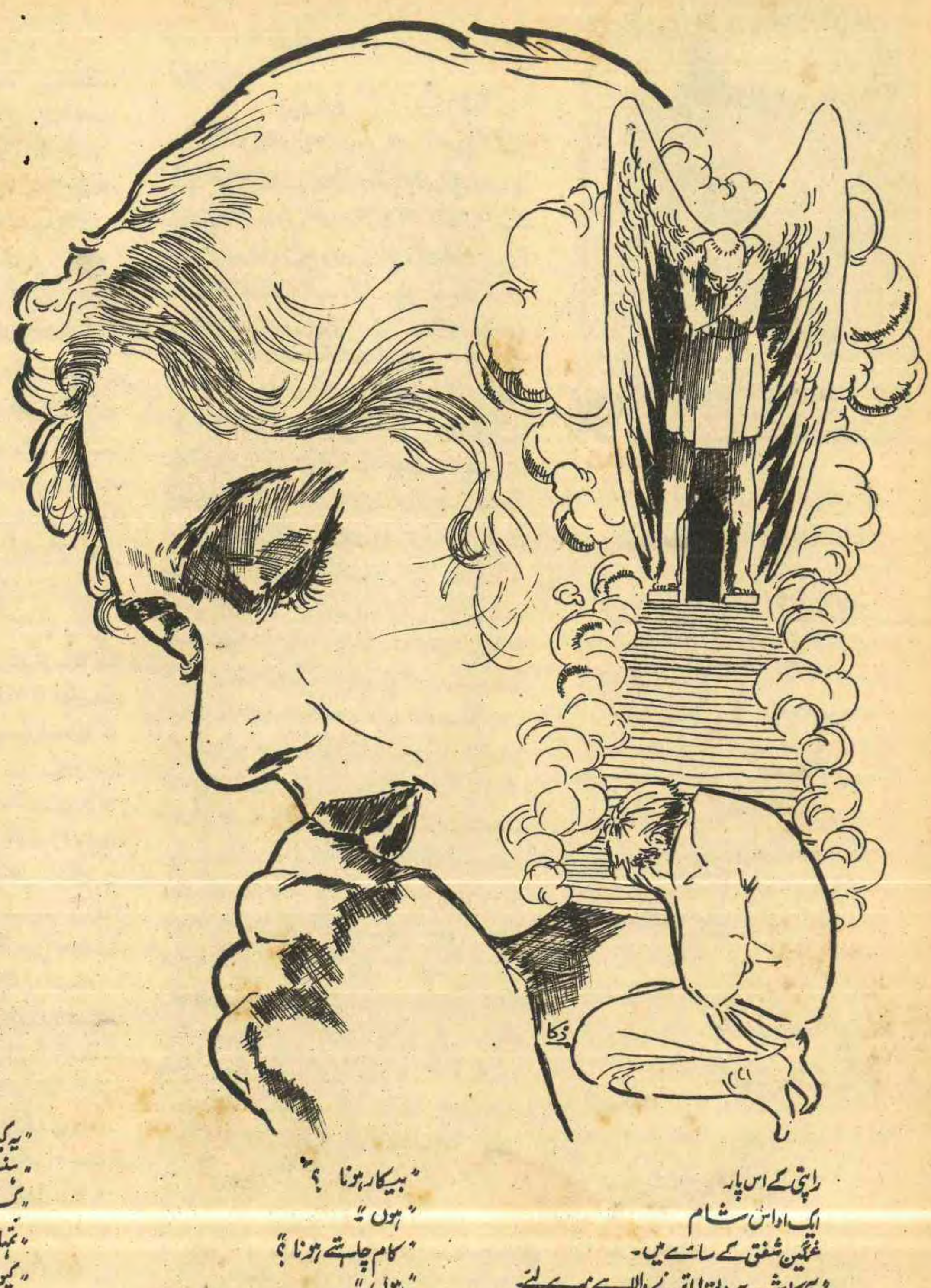
پھر کسی شہرِ تمنا میں گئی
زندگی چھوڑ کے تنہا ہم کو

جانے کیا بیت گئی فرقت میں
آئینہ دیکھ کے رویا ہم کو

پیار اس زہرہ جبیں کا آذر
سایۂ ابرِ رواں تھا ہم کو

ایم کوٹھیاوی راہی

شفق کے پھول



راپتی کے اس پار
ایک اداس شام
غمگین شفق کے سائے میں۔
"آکاش سے دیوتا اترنے والا ہے میرے لئے
تم جاؤ۔"
"میں اداس ہوں"
"اچھا مت جاؤ"
"میں مر جاؤں گی"
اور پاگل کو پگلی کی بات پر ہنسی آگئی۔
اور پاگل بادل تھا۔ پگلی تارا۔
جان پہچان کب ہوئی تھی، معلوم نہیں۔
نہ جانے کتنے دنوں سے ببول کا وہ پیڑ دیکھ رہا تھا اور
سن رہا تھا۔

"بیکار ہونا ؟"
"ہوں"
"کام چاہتے ہونا ؟"
"ہوں"
"تو آنا۔ پتاجی سے کہہ کر کام دلوا دونگی۔ پڑھایا کرنا"
"کس کو ؟"
"مجھے"!
"مگر تم مر کیوں جاؤ گی۔ ابھی ابھی یہ کہہ رہی تھیں"
"تمہاری اداسی پر"
"مجھے بھوک بڑے زور سے لگی ہے۔ آکاش سے
دیوتا اترنے والا ہے اچھے اچھے پکوان کا تھال لئے۔ تمہیں
بھی بھوک لگی ہو تو کھا لینا۔ ۔ ۔ ۔"
"وہ ہنسنے لگی۔"

"یہ کیا ؟"
"ہنسی آئی ہے"
"کس پر ؟"
"تمہاری بھوک اور دیوتا پر"
"کیوں ؟"
"دونوں کہانی" وہ بل کھا کر بولی "بھلا دیوتا بھی،
کوئی اترنے کی چیز ہے ۔ ۔ ۔ ۔"
"اور بھلا بھوک کوئی لگنے کی چیز ہے ؟!"
وہ کٹ سی گئی۔
اور پھر یہ شام بھی گذر گئی
دیوتا نہیں آیا
"دیکھنا ہے کب تک جل دیتے ہو ۔ ۔ ۔"
وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔
شام کے ساتھ تارا بھی جا چکی تھی۔

وہ اکیلا بیٹھا تھا۔

ٹوٹے ہوئے مندر میں اندھیرا پھیل گیا۔
سونی دہلیز پر بادل چپ بیٹھا کبیر داس کا کوئی دوہا گارہا تھا اور راستے میں دیوتا نے پانی برسانا شروع کر دیا وہ لپک کر چھت کے نیچے چلا گیا۔ جو بری طرح ٹپک رہی تھی۔ لیکن جاتا آخر کہاں جبکہ یہی گھر تھا اس کا جب سے اپنا گھر چھوڑ کے آیا تھا۔ صبح تک ٹپکتی چھت کے نیچے بھوکا پڑا رہا۔ اور دیوتا کی راہ تکتا رہا۔ شاید وہ بارش کی وجہ سے نہ آسکا۔ آج ضرور آئے گا اور یہ سوچ کے اسے نیند آگئی۔ شام تک سوتا رہا۔
"ارے تم سو رہے ہو اس سمے"!
آتے ہی تارا نے جھنجوڑا۔
وہ آنکھ ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔
"ایں . . . پھر تم آگئیں۔ دیکھ رہا ہوں۔ مجھے جینے نہیں دو گی۔ شام کو وہ تمہاری وجہ سے نہیں آیا۔ رات کو بارش نے نہیں آنے دیا۔ جاؤ جاؤ۔ چلی جاؤ۔ آج وہ ضرور آئے گا۔"
"وہ کیا آئے گا اب"
"کیوں"
"دوپہر میں اترا تھا۔ تمہیں سوتا پاکر لوٹ گیا۔"
"تم پاگل ہو گئی ہو"
"ٹھیک ہے۔ مگر یہ دیکھو اوپر لوٹنے سے پہلے میرے گھر گیا اور یہ دے گیا کہ تمہیں دیدوں . . . ."
یہ کہہ کر تارا نے ایک چھوٹا سا پیکٹ بادل کے طرف بڑھا دیا۔
غمگین شفق کے سائے سیب کے رنگ میں ڈھل گئے
فضاؤں سے رس ٹپکنے لگا۔
پیکٹ میں کھانے کا عمدہ عمدہ سامان تھا۔
کیک
پیسٹری
ٹوسٹ، مکھن اور ابلے ہوئے انڈے کئی ایک
"جیو، جیو میرے دیوتا" بادل جھوم اٹھا۔
"خوش ہو نا اب"؟
"ہاں بہت"
"کس سے"؟
"مہربان دیوتا سے"
"اور مجھ سے"؟
"تم سے کیوں؟"
"مجھے تمہارا نہ جانتا تو اور کسے دیتا یہ سب کچھ تمہیں دینے کو"
"چلو تم سے بھی خوش ہوا"
اور یہ کہہ کر بادل جلدی جلدی کھانے لگا — کئی وقت کا بھوکا پاگل اور جنم جنم کی پگلی تارا اسے محبت بھری نظروں سے گھورتی رہی۔

اور اب یہی ہوتا
روز ہی دیوتا کھانے کا سامان تارا کو دیدیتا کہ بادل کو دے آئے اور بادل کو براہ راست اس لئے نہ دیتا کہ وہ بادل سے محبت نہیں کرتا تھا۔ محبت تو اسے تارا سے تھی۔ یہ سوچ کر من ہی من میں بادل خوب خوب ہنستا اور کبھی کبھی اکیلے میں بڑبڑاتا۔ کئے جاؤ محبت دیوتا! — مگر ہاں میرا پیٹ چلتا رہے۔ مجھے نہیں چاہیئے محبت وحبت!

اور اسی طرح چلتے چلتے وقت کو ایک موڑ ملا۔
ببول کا پیڑ اداس تھا۔
شفق کے سائے ابھی ابھی پھیلے تھے۔
شام ابھی ابھی ابھری تھی کہ تارا بھاگی بھاگی آئی۔
اور آتے ہی بادل کے قدموں پر گر پڑی۔
"مجھے بچالو بادل"
"کس سے؟"
"ایک مصیبت سے"
"دیوتا سے کہو"
"مگر میری مصیبت تو سنو"
"سناؤ"
"پتا جی مجھے بیچ رہے ہیں"
"واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم بھی کوئی سودا ہو"
"ہاں بادل ہاں"
"یہ جھوٹ ہے تم تو لڑکی ہو۔ محبوبہ ہو۔ دیوتا کی محبوبہ"
وہ ٹھٹھہ مار کر ہنسنے لگا۔
تارا کی آنکھیں آب آب ہو گئیں۔
شفق بھی رو پڑی
ببول کا پیڑ بھی
لیکن بادل نہیں!
وہ اسے جھنجوڑ کر بولی
"اب میں ہوش میں آگئی بادل"
"کیا اب تک بے ہوش تھیں؟"
"ہاں"
"کب سے؟"
"جب سے تمہیں دیکھا۔"
"نہ جانے کیا کہتی ہو"
وہ پھر ہنسنے لگا زور زور سے۔
شفق بھی ہنس پڑی۔
ببول کا پیڑ بھی۔
لیکن تارا کو ہنسی نہیں آئی۔
"اب میں تمہارے لئے کھانے کا سامان نہ لاسکونگی"
"تو پھر دیوتا تم سے ناراض ہو جائے گا"
"اسکی ناراضگی بھی مجھے ایسا نہ کرنے دیگی"
"کیسا؟"
اور وہ بادل سے لپٹ کر رونے لگی۔
اور پہلی بار — زندگی میں پہلی بار — بادل کی دھڑکنوں سے ایک نئی آواز نکلی۔ ایک عجیب سی آواز شہنائیوں کی آواز سے ملتی جلتی۔
اور ببول کا پیڑ مہندی کا پیڑ بن گیا۔
اور شفق کا رنگ مہندی کا رنگ
بادل تارا کی بڑی بڑی جھیل سی آنکھوں میں ڈوبنے لگا۔
اور پھر جھجک سا گیا
"میں نہیں جانتا یہ سب کیا ہے مگر نہ جانے کیوں میرا جی بھی اب کچھ کچھ چاہنے لگا ہے۔"
"کیا؟"
"کرکچھ سمجھوں۔ کچھ جانوں۔ مگر مجھے تو بھوک لگی ہے بڑے زور کی۔"
"وہ رہا تمہارے دیوتا کا دیا ہوا کھانے کا پیکٹ۔"
"مگر جانے کیوں آج میری بھوک کا رنگ کچھ بدلا بدلا سا ہے . . . "یہ سب کیا ہے تارا۔ کیا ہے . . . رومت . . . رومت . . . وہی باتیں کرو پھر . . . کل پرسوں والی باتیں۔"
"کیا؟"
"کچھ یاد نہیں آتا۔"
"میں تمہیں بتاتی ہوں"
"بتاؤ"
"ہم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی ہے . ."
"میں نہیں جانتا محبت وحبت۔ یہ سب دیوتا کا کام ہے۔"
"دیوتا جس کو کہتے ہو وہ کوئی آدمی نہیں ہے پگلے۔"
"کچھ بھی ہو۔"
"وہ وہی ہے جو ہم محسوس کرتے ہیں۔"
"کیا؟"
"دھڑکنوں کی آواز۔"
اور پھر بادل کی نظریں آکاش میں گڑ گئیں۔
ببول کے پیڑ اور شفق سے پرے
اور تارا جانے کیا کیا کہتی رہی۔
اور پھر ایک اکیلی شام ببول کا پیڑ چپ تھا۔
اور مندر سونا۔
"بادل، بادل"!
تارا پکار رہی تھی
لیکن بادل کی آواز کسی گوشے سے نہیں آئی۔
تارا باہر نکل آئی۔
دور درختوں کے پرے ندی پر نیا پل بن رہا تھا۔
پیپوں کا پرانا پل ٹوٹنے والا تھا۔
تارا اسی طرف بڑھ گئی
بہت سارے مزدوروں میں ایک مزدور بادل بھی تھا۔
ہاتھ میں کدال سر پر پگڑ، ہونٹوں پر مسکان . . . تارا کو دیکھ کر یہ مسکان اور پھیل گئی۔ وہ پکارا۔

" تارا - او تارا "
وہ مڑی
" ارے تم . . . ؟ "
" ہوں "
" یہ کیا ؟ "
" بھوک ہے یہ بھوک " کدال کو فضا میں لہراتا بادل چہکا " اب میں دیوتا کی بھیک پر نہیں پلوں گا - آج اس لوہے نے منوں ریت نکالی ہے ندی سے . . . ادھر دیکھ پانی کا رخ موڑ دیا گیا "
" مگر تم پڑھے لکھے ہو بادل "
" تو کیا ہوا ؟ "
" یہ کام ان پڑھوں کا ہے "
" تو جان لو میں ان پڑھ ہوں "
" یہ تمہیں شوبھا نہیں دیتا "
" کیوں ؟ "
" تم مرے پیتم ہو "
" اسی لئے . . . ؟ "

" ہاں "
" تو جاؤ آج سے میں تمہارا نہیں ہوں " وہ مزدوروں کی طرف بڑھا -
تارا لپکی
" سنو بادل "
" کیا "
" برا مان گئے " !
" نہیں "
" تو چلو آج کی شام تم سے بہت کچھ کہنا ہے "
" میری چھٹی آٹھ بجے رات کو ہوتی ہے - پل کو جلد سے جلد تیار ہونا ہے - چوبیس گھنٹے کام ہوتا ہے "
یہ کہتا ہوا بادل مزدوروں کی بھیڑ میں گھس گیا -
تارا کی آنکھ نم ہو گئی -

شفق کو ڈوبے پانچ گھنٹے ہو رہے تھے -
چاند آسمان کے بیچوں بیچ چمک رہا تھا -
ببول کا پیڑ چپ چاپ سا کھڑا دیکھ رہا تھا -
بادل مندر کی سونی دہلیز پر اداس بیٹھا تھا -
وہ پرسوں بھی نہیں آئی -
کل بھی نہیں -
آج بھی نہیں -
اور اب شاید کبھی نہ آئے -
اس کے دل نے کہا - میرے اور اس کے بیچ بھوک کیوں آ گئی : . . . . اور بھوک کے خلاف اس کا دل چیخ اٹھا دیوتا - دیوتا - لو میں اس پاپن کو بھول رہا ہوں اب تو بھیجو گے نا اپنی دیوی کو ؟ میرے پاس میرے چرنوں میں وہ زیر لب بڑبڑانے لگا - اور پھر اسے ہنسی آ گئی اور اس ہنسی پر چاند بھی ہنس پڑا - ببول کا اداس پیڑ بھی اور مندر کی شکستہ دیواریں بھی -

اور پھر تارا مہینوں بعد ادھر سے گئی
کار میں بیٹھ کے دیوتا کے ساتھ
راپتی کے نئے پل کا نظارہ کرنے -

شام خوبصورت تھی
فضاؤں میں شفق کے پھول کھلے ہوئے تھے - لیکن وہ پرانا مندر اور وہ ببول کا پیڑ ویسے ہی اداس تھا - چند دیہاتی سر جھکائے کھڑے تھے -
تارا نے کار رکوائی
" کیا بات ہے ڈارلنگ " دیوتا نے پوچھا -
" ذرا بھگوان کے درشن کر لوں "
" پگلی " وہ بولا " یہ مندر تو ٹوٹا ہوا ہے - نہ جانے کب سے ویران پڑا ہے - یہاں کیا ؟ "
" اجڑے مندر کا بھگوان تم نے شاید نہیں دیکھا "
" ہاں "
" چلو آج دیکھ لو "
رندھے لہجے میں تارا بولی -
اس کا دیوتا پیچھے تھا
وہ آگے تھی
اور بادل کا خیال دونوں سے آگے
اور ببول کے پیڑ کے پاس شعلے اٹھتے دیکھ کر تارا کا دل لرز اٹھا - وہ گرنے سے بچی - دیوتا نے سنبھالا -
" کیا ہوا ڈارلنگ ؟ "
" کچھ نہیں - مگر یہ آگ . . . . ؟ "
" پگلی یہ تو کسی بھکاری کی چتا معلوم ہوتی ہے "
دیوتا نے ہنس کر کہا -
" ہاں سرکار " پاس ہی سے ایک دیہاتی بولا " مر گیا بے چارا "
" کون ؟ " تارا کے منہ سے نکلا
" نام کوئی نہیں جانتا سرکار "
" پھر بھی "
" اسی شوالے میں پڑا رہتا تھا "
" دیوانہ سا . . . . ؟ "
" ہاں "
" بہت دنوں سے "
" ہاں "
" کب مرا ؟ " تارا کی چیخ سی نکل گئی -
" صبح صبح " ایک پڑھا لکھا دیہاتی پاس آ کر کہنے لگا -
" بھگوان تھا - کسی کا دیا نہیں کھاتا تھا - پانی پیتا تھا - ہم لوگوں نے کچھ اور کھاتے پیتے نہیں پایا - کہتا تھا دیوتا کو مناتا ہوں وہ اپنی دیوی کو اب ادھر نہیں آنے دیتا - مگر دیکھیں کب تک نہیں آنے دیتا . . . . "
ایک مردہ پاگل کا حال وہ دیہاتی بتاتا رہا -

نکہت بریلوی

غزل

سخن کے پردے میں کیا نہ گل کھلا کے چلے
وہ دل کی بات جو ظاہر نہ تھی بتا کے چلے

ہر اک کے ساتھ قدم سے قدم ملا کے چلے
مگر ہم اپنا الگ راستہ بنا کے چلے

کہاں نہیں ہیں تری یادِ بے پناہ کے ہاتھ
کہاں تلک کوئی دامن بچا بچا کے چلے

جدھر نہ جانے کی تاکید اہلِ ہوش نے کی
ترے خراب اسی سمت آ دبدا کے چلے

رہِ وفا میں ہماری بساط ہی کیا تھی
ہم اپنی بے سر و سامانیاں لٹا کے چلے

ستم ظریف زمانہ سمجھ ہی لیتا ہے
کسی طرح کوئی اسباب غم چھپا کے چلے

فضائے درد سے معمور ہے چمن کا دل
نفس نفس تری خوشبو سی ہم بسا کے چلے

بھلا نہ دینا بزرگوں کے قول کو نکہتؔ
وہ سر بلند نہیں ہے جو سر اٹھا کے چلے

اور چتا کے شعلے آسمان میں کھلی شفق کے پھولوں کی طرف لپکتے رہے -
دیوتا اکتا کر بولا
" آؤ ڈارلنگ ابھی مندر میں بھی چلنا ہے "
یہ مندر تو ٹوٹا ہوا ہے ، نہ جانے کب سے ویران پڑا ہے - اس میں کیا بھگوان ملیں گے ! " یہ کہتی ہوئی تارا کار کی طرف بڑھ گئی - اس کا دیوتا زیر لب مسکرانے لگا -
اور پھر مندر چتا اور ببول کے پیڑ کو چھوڑتی ہوئی کار پل کی طرف بھاگی جا رہی تھی -

کھوٹا روپیہ سچا انسان



علی احمد شاہدی



فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے سگرٹ فروش کو پیسے دیکر جب میں آگے بڑھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے قریب کوئی رو رہا ہو۔ لمحہ بہ لمحہ یہ آواز تیز ہوتی گئی۔ میرے کانوں میں میرے اپنے وجود کے اندر اور پھر جیسے میری روح کی گہرائیوں میں گونجنے لگی اور دل و دماغ میں جذبے و احساس کا جو طوفان بپا تھا وہ اور بڑھ گیا۔

لوگ کہتے ہیں میں بڑا نیک آدمی ہوں میرے ایک دوست میری نام نہاد سادگی طبع کے بھی بہت مداح ہیں کیوں کہ ان کے خیال میں جب بھی کسی نے مجھ سے کسی قسم کی مدد طلب کی ہے میں بغیر کسی ردوکد کے حاضر ہو گیا ہوں۔ خواہ وہ سگرٹ آفر کرنے کا معاملہ ہو یا قرض دینے کا۔ میرے بعض دوست مجھے رحم دل بھی کہتے ہیں۔ مگر میں نہیں جانتا کہ یہ سب کس حد تک حق بجانب ہیں البتہ اپنی ایک کوتاہی کا مجھے احساس ہے۔

اور وہ یہ کہ میری طبیعت ضرورت سے زیادہ دردمند اور حساس ہے۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ میں بندر روڈ پر جا رہا ہوں قریب سے کوئی گداگر غمناک آواز لگاتا نکل گیا اور میرا دل رونے لگا اور آنکھیں نمناک ہو گئیں کسی اپاہج کو دیکھا اور دل نے کہا کاش ممکن ہوتا کہ میں اپنے سالم ہاتھ پیر اسے دے سکتا جس میں ابھی چلنے پھرنے کی طاقت ہے۔ کوئی ضعیف ڈگر ڈگر کرتا میرے سامنے سے گذرا اور انسان کے عبرتناک انجام کے خیال نے میری روح کو تڑپا دیا کسی نابینا پر نظر پڑی اور غم سے میرا رواں رواں کانپ اٹھا۔ اے خدا! انسانیت کی یہ توہین! دنیا جو روشنی کے سوا کچھ بھی نہیں تیرے اس بندے کے لئے اندھیری ہے اور میں روتا چلا گیا ہوں اور میرے آنسوؤں کو میری آنکھوں کے سوا کسی نے نہیں دیکھا ہے اور میرے دل کی غمناک پکار میرے ضمیر کے سوا کسی اور نے نہیں سنی ہے۔ اور میں سوچتا رہ گیا ہوں کہ کیا یہ میرے دل کی کوئی بیماری ہے۔

اور اس روز میں سارا دن کراچی کی سڑکوں پر گھومتا رہا۔ ماری پور واپس جانے کو جی ہی نہ چاہا۔ پھر ماری پور جیسی دور افتادہ بستی سے کراچی آنا بھی کبھی کبھار ہوتا ہے۔ صبح کے شو میں ایک انگریزی فلم دیکھا کچھ دیر کسی پرشور ہوٹل میں بیٹھا۔ کبھی کسی خاموش کیفے کی ویرانی کا لطف اٹھایا۔ چلتے پھرتے کسی جانے پہچانے سے ملاقات ہو گئی تو پھر چائے یا کافی کا ایک دور چل گیا۔ حتیٰ کہ دوپہر کا کھانا بھی بندر روڈ پر ایک ہوٹل میں کھایا ذرا گاندھی گارڈن کی سیر کی وہاں سے بندر روڈ واپس ہوا تو شام ہو چلی تھی اور مجھے یہ خیال ستانے لگا تھا کہ ماری پور کی بس اتوار کی شام کو جلد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مجھے شام کے کھانے کی بھی فکر ہوئی میں نے ایک سستے

ہوٹل پر بھوک بھری نگاہ ڈالی اور اس طرف بڑھ گیا پیالیوں کی کھنک، کھانوں کی مہک، اور تلے ہوئے کبابوں کی سوندھی خوشبو نے میری اشتہا اور بڑھادی میں ہوٹل کے کاؤنٹر تک گیا معاً خیال آیا کہ پیسے تو دیکھ لوں۔ پینٹ ٹٹولی ایک روپیہ پڑا تھا تھکن اور بڑھتی ہوئی بھوک نے کھانے کو اور بھی لذیذ بنادیا۔

کھانے سے فارغ ہوکر میں نے سگریٹ کے دو سرور انگیز کش لئے اور سرمست ہوکر اٹھا۔ کاؤنٹر پہ آتے ہی ویٹر نے آواز لگائی ــ باؤجی سے دس آنے ــ"

میں نے پینٹ کی جیب سے وہ ایک روپیہ نکال کر کاؤنٹر پہ بے نیازی سے پھینک دیا منیجر روپیہ لے کر کیش بکس میں رکھتے رکھتے رک گیا اور پھر مقناطیس سے پرکھ کر میری جانب رکھائی سے پھینک کر کہا۔

"یہ روپیہ کھوٹا ہے"

"کھوٹا ہے!" میں نے تعجب کا اظہار کیا۔

"آپ خود دیکھ لو" منیجر نے جواب دیا۔

میں نے روپے کو لوٹ پلٹ کر بغور دیکھا جیسے جعلی نوٹوں اور کھوٹے سکوں کا سراغ لگانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو۔

"مجھے تو کوئی خرابی معلوم نہیں ہوتی" میں نے روپیہ واپس کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی خرابی معلوم نہیں ہوتی؟ کیا کہتے ہو آپ یہ روپیہ کھوٹا نہیں ہے تو اور کیا ہے" منیجر نے روپیہ کاونٹر پر زور سے پٹکتے ہوئے کہا۔

ہوٹل کے اور لوگ بھی ہماری طرف دیکھنے لگے انکی آنکھوں میں تمسخر کی جھلک تھی میں خاموش ہوگیا میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں۔

روپیہ کاؤنٹر پر پڑا میرا منہ چڑا رہا تھا۔

"آپ اسے اٹھالو اور پیسے نکالو" منیجر گرم ہوگیا میں خاموش رہا۔ لوگوں کی نگاہیں مجھ پر لگی ہوئی تھیں،

"اپنے پاس وقت نہیں ہے جلدی کرو" وہ پھر درشت لہجے میں بولا۔

"مگر میرے پاس اور پیسے نہیں ہیں" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"تو ایسا بولو نا پیسے نہیں ہیں ــ پیسے نہیں ہیں۔ تو ہم کیا کرے؟" وہ جان بوجھ کر زور زور سے بول رہا تھا۔ اور میری پیشانی شرمندگی سے پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔ پھر بھی میں نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"میرا مطلب ہے یہ روپیہ رکھ لو۔ میں پیسے کل دے دونگا"

"کیا کہتے ہو۔ کل دے جاؤں گا" وہ اور بھی چلا کر بولا "ارے بابا یہ کلٹی نہیں چلے گا۔ ہمارے پاس تمہارے جیسا نوجوان بہت آتا ہے۔ پرس گم ہوگیا۔ پیسے بھول آیا۔ جیب کٹ گیا۔ ہم سب کی سنے گا تو ہمارا دیوالیہ پٹ جائے گا"

میں رسوائی کے احساس سے ڈوبا جارہا تھا۔ اب تقریباً سارا ہوٹل میری طرف متوجہ تھا۔ اور مجھ میں نگاہ اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔ میں نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا آپ مجھ پر بھروسہ کیجئے۔ میں کل پیسے لاکر دیدوں گا۔ اتفاق ہے جو یہ روپیہ کھوٹا نکل گیا"

چند آدمی اٹھ کر کاؤنٹر پر آگئے۔ منیجر نے ان کے سامنے اور بھی چیخنا چلانا شروع کردیا۔ میں کچھ نہ کہہ سکا تھا۔ دو تین آدمیوں نے بڑھ کر سمجھایا تب کہیں اس نے نہایت کرختگی سے کہا۔

"اچھا جاؤ بابا جاؤ۔ پر دیکھو کل کی بات کا ہم بھروسہ نہیں کرتا۔ پیسہ ابھی دو گھنٹے کے اندر پہنچادو۔ اگر سچا بابو ہے تو"

میں ہوٹل کے منیجر سے جان چھڑا کر فوراً سڑک پر آگیا اور مجھے سڑک پہ آکر ہوٹل کی گھٹی گھٹی فضا کا شدید احساس ہوا ایک لمحہ کے لئے ذہن میں ایک ٹھہراؤ، ایک جمود سا طاری رہا اور پھر بھیانک خیالات بھناتے شور مچاتے میرے ذہن میں درانے لگے۔ اب کیا ہوگا۔ مجھے اب کیا کرنا چاہیئے۔ ایک کھوٹا روپیہ ہے ماری پور کی آخری بس چھوٹنے کا وقت قریب ہے اور میں ہوٹل والے کو اپنی شرافت کی کسوٹی دے آیا ہوں اسے دو گھنٹے کے اندر پیسے پہنچانے ہیں۔

میں بغیر کچھ سوچے سمجھے چل پڑا۔ میرے پیر زمین پر پڑ رہے تھے لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں، کدھر جا رہا ہوں۔ بس یہی ایک تکلیف دہ خیال ذہن میں کروٹیں لے رہا تھا کہ پیسے کس طرح حاصل کروں۔ راہ چلتے لوگوں سے مانگنا کتنی بڑی رسوائی ہے۔ کوئی جان پہچان والا مل بھی جائے تو زبان نہ ہلے۔

میرا دماغ مصروف تھا اور میں چل رہا تھا۔ یوں جیسے میرا سارا جسم سوچ رہا ہو اور میرے قدم بھی متفکر ہو رہے ہوں۔ اچانک خیال کی ایک لہر نے امید کی ایک رمق ہرے سے پھینکی اور میں چلتے چلتے ٹھہر گیا۔ لیکن دوسرے لمحے امید اور خوشی کا یہ دیا بھی بجھ گیا۔ میرے دل نے کہا تمہارے ذہن میں جو تدبیر ابھری ہے۔ وہ دھوکا ہے۔ فریب ہے، بے ایمانی ہے لیکن دماغ نے سمجھایا، تم بے بس ہو، لاچار ہو، میرے دل ودماغ میں یہ پیکار جاری تھی اور میں چل رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہ واضح نہیں تھا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ سامنے ایک پھل والے کی دوکان تھی سوچا دو آنے کا ایک سنترہ لے لوں اور بس ــ لیکن نہیں وہاں تو بڑی تیز روشنی ہے روپیہ کا کھوٹ کھل جائے گا ــ آگے ایک ٹھیلہ والا کھڑا ہے ــ مونگ پھلی لے لے ــ صرف ایک آنے کا صرفہ ہے اور ــ مگر اس کے پاس گیس کی روشنی نہ سہی، وہ خود بہت چالاک معلوم ہوتا ہے کہیں یہاں بھی وہ رسوائی نہ ہو ــ میں اپنے خیال میں گم سڑک پر چل رہا تھا ــ یہ اب پان کی دوکان ــ سامنے ہے۔ اور یہاں کام بن جانا مشکل نہیں ــ لیکن اس دوکان پر وہ جو چار آدمی کھڑے ٹھٹے لگا رہے ہیں بڑے کائیاں معلوم ہوتے ہیں۔ وہاں سے سرکنے کا نام نہیں لیتے اور مجھے یوں گھور رہے ہیں جیسے میرے دل کا راز جانتے ہوں۔ اور میں آگے بڑھ گیا ــ سڑک کے اس حصہ پر دونوں طرف بڑی بڑی عمارتیں سر اٹھائے کھڑی تھیں اور دائیں طرف ان عمارتوں کے قدموں میں ایک بوڑھا سگریٹ کی چند ڈبیاں لئے بیٹھا تھا۔ میری نظر اس پر جا پڑی اور مجھے اسے دیکھ کر ایسی مسرت کا احساس ہوا جیسے شاید شکاری کو شکار جال میں پھنسا ہوا دیکھ کر ہوتا ہوگا دوسرے لمحے میں بوڑھے کے پاس کھڑا تھا۔

"کیپٹن کے دو سگریٹ دیدو بڑے میاں"

اس نے ڈبی کو ٹٹول کر دو سگریٹ نکالے اور مجھے معلوم ہوا کہ، بینائی بھی کمزور ہے۔ روپیہ میں نے اس کے ہاتھ میں رکھ دیا جسے اسے دیکھنے سے زیادہ محسوس کرنے کی کوشش کی اور اسکی جھریوں بھرے چہرے سے ایسی خوشی کا اظہار ہونے لگا جیسے کسی بچے کی ہتھیلی پر جگنو رکھ دیا جائے اور وہ مسرت سے کھل اٹھے جیسے جیسے کسی بھکارن کے ہاتھ میں چاندی کی انگوٹھی

"روپیہ ہے میاں؟" اس نے پوچھا

میں نے کہا۔ "ہاں"

اس نے روپیہ تہمد میں اڑس لیا اور آنے آنے ۲ دو دو آنے آنے کی ریزگاری نکال کر مجھے واپس کردی

روپے کی ریزگاری ہاتھ میں آتے ہی میں ہوٹل کی طرف بھاگا۔ جہاں میں اپنی شرافت اور دیانت کا سرمایہ رہن رکھ آیا تھا۔ ہوٹل والے کو پیسے دیکر میں نے سوچا کہ اب شاید میرا ضمیر ہلکا ہوجائے گا اور ذہن و دل جس کرب انگیز کیفیت میں مبتلا رہے ہیں اس سے نجات نصیب ہوگی میں نے ان سب واقعات کو دل سے بھلانے کی کوشش کی لیکن، مجھے محسوس ہوا کہ کوئی خیال آسیب کی طرح میرا پیچھا کر رہا ہے جسے میرا دماغ قبول کرنے سے گریزاں ہے لیکن دل نے اپنے دامن میں اسے پناہ دی ہے جہاں ایک کسک، ایسا درد جنم لے رہا ہے جو گناہ کی لذت کے بعد روح کو مسوستا ہے۔ اور میرے دل میں یہ درد یوں پھیلنے بڑھنے لگا جیسے کسی بیوہ کے دل میں شوہر کی موت کا خیال، میں نے چاہا کہ یہ کسک، یہ درد، یہ خیال میرے دل سے چند لمحوں، چند ساعتوں کے لئے محو ہوجائے مجھے ایک لحظہ سکون میسر آجائے۔ لیکن یہ درد تھما نہیں، بڑھتا رہا جیسے کوئی المیہ کہانی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ رہی ہو جیسے کوئی غم نصیب ماں اپنے اکلوتے ننھے کی موت پر بین کر رہی ہو

میں دیوانہ وار بس اسٹاپ کی طرف بڑھا اور خود کو بس کے انتظار و تجسس میں یوں غرق کر دینا چاہا کہ میرا سارا وجود نگاہیں بن کر رہ جائے۔ لیکن میرا دل ایک ایسا پھوڑا سا بنتا چلا جارہا تھا جس میں ٹیس اٹھتی ہے درد کی لہریں جنم لیتی ہیں اور جی چاہتا ہے کہ نشتر لگاکے درد کو نکال پھینکو لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پھوڑا ابھی کچا ہے۔

بس آئی اور میں اس میں لپک کر بیٹھ گیا لیکن درد کا وہ آسیب بھی میرے ساتھ تھا میں نے بس کے اندر بس کے باہر گھبرا گھبرا کے دیکھا کہیں سے کسی خیال یا جذبہ کی تحریک نہ ہوئی جو مجھے اپنی پناہ میں لے سکے جو مجھے اس

کرب سے فرار کی راہ بتلائے بس چل پڑی ایک ہیولا سا میری نگاہوں میں ابھرنے لگا — جیسے بس میں میرا ساتھی ہو — میں ڈر گیا — یہ بوڑھا ہے — وہی سگرٹ والا بوڑھا مسکرا رہا ہے — میرا خوف، میرا درد بس کی رفتار کے ساتھ شدید تر ہوتا گیا۔

بس راؤنڈ اباؤٹ کے پاس رک گئی میں اتر گیا وہ ہیولا، وہ بوڑھا، وہ درد سب میرے پاس تھے میں نے گھر پہنچ کر سونے کی کوشش کی لیکن دل کے پھوڑے میں جیسے درد کا مواد پھوٹ کر بہنے کی راہ ڈھونڈ رہا تھا۔ میں رات گئے تک سویا نہیں جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ اور خواب میں بھی وہ بوڑھا دبے پاؤں چلا آیا۔ میری آنکھ کھل گئی اُف میرے خدا —— یہ سب مجھے کیا ہو رہا ہے یہ درد کب مٹے گا — میری روح میں یہ شور کیسا ہے۔ یہ سب کیسا ماتم ہے —

دوسرے دن میں نے جیسے تیسے دفتر میں گذارا۔ اور مجھے میرا دل آواز دیتا رہا۔ اس بوڑھے کے پاس چلو اس لاچار نابینا بوڑھے کے پاس اور میں اس قاتل کی طرح جس کا ضمیر بار بار اسے مقام قتل کی طرف کھینچ لے جاتا ہے کہ وہاں اس کے روحانی کرب کو سکون ملتا ہے مارا مارا پورے شہر پہنچا۔ اسی سڑک پر ان ہی اونچی عمارتوں کے سامنے کئی بار گذرا۔ عمارتوں نے مجھے حقارت سے دیکھا ان کے لمبے لمبے سائے مجھے لعنت ملامت کرنے لگے — میں جیسے چلا اٹھا — مجھے اقرار کر لینا چاہیئے — مجھے کہہ دینا چاہیئے کہ وہ روپیہ میں نے ہی اسے دیا تھا لیکن بوڑھے کے پاس پہنچ کر میری زبان گنگ ہو گئی اس نے سر اٹھا کر مجھے غور سے دیکھا۔

"کیا چاہیئے میاں؟"

"کیپٹن کے دو سگرٹ" میں نے چونی نکال کر اس کے ہاتھ میں دیدی جسے اس نے ٹٹولا "میاں یہ چونی کھوٹی تو نہیں ہے۔"

"میں نے کہا نہیں"۔

اس نے مجھے دو سگرٹ دیئے "وہ۔ بُرا نہ ماننا میاں" اس نے کہا "میں نے اس لئے پوچھا کہ کل کسی بھلے مانس نے مجھے بڑا دکھ دیا" میرا دل یوں دھڑکا جیسے کسی قاتل کے سامنے اس کے مقتول کے تڑپنے کا ذکر ہو۔

بوڑھے نے کہا "میاں وہ کل دن بھر کی کمائی تھی جو شام کو میں نے کھوٹے روپے کی ریزگاری میں دے دی"۔

میرا دل اور تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں خاموش رہا۔

"جانے کون بھلا مانس تھا میاں جو کھوٹا روپیہ دیکر میری سارے دن کی کمائی لے گیا اور میرے پاس اس روز صرف دو آنے باقی رہ گئے"۔

میں خاموش رہا مگر میرے سینے میں ہیجان بڑھنے لگا۔

"آپ سمجھئے میاں اس دن میں بھوکا سویا۔ اور دو آنے کی روٹی اپنی بیٹی کو کھلا دی جس کو کوڑھ کی بیماری ہے۔ میں اسی کی خاطر یہ چھوٹا موٹا دھندا کرتا ہوں"۔

میں اب بھی خاموش کھڑا اپنے دل کی دھڑکنیں سن رہا تھا جن میں درد کی پکار تھی میں نے محسوس کیا کہ بوڑھے کی آواز میں رقت بھر رہی ہے اور ڈرا کہ کہیں وہ رونے نہ لگے کہ آنسو دیکھ کر شکست کھا جانا میری فطرت کی کمزوری ہے میرے دل نے مجھ سے میرے جرم کا اقرار کرا لینا چاہا لیکن میرے ہونٹ یوں پیوست ہو گئے جس طرح کسی سنگین گناہ کا اعتراف کرنے سے پہلے کسی کنواری دوشیزہ کی زبان بند ہو جاتی ہے۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد میں نے سنا کہ میں کہہ رہا ہوں

"بڑے میاں وہ روپیہ مجھے دیدو"۔

"آپ کو دیدوں" بوڑھے نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"ہاں" میں نے اسی کھردرے لہجے میں کہا۔

"مگر کیوں میاں" بوڑھا حیرت زدہ سا مجھے دیکھنے لگا۔

"وہ روپیہ میں نے تم کو دیا تھا" میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

"آپ نے مجھے۔!" بوڑھا متحیر ہو کر اٹھ کھڑا ہوا تھوڑی دیر تک مجھے خاموش نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر جذبات بھرے لہجے میں بولا۔

"مجھے قسم اس پیدا کرنے والے کی میاں! وہ روپیہ آپ نے مجھے نہیں دیا۔ وہ اور کوئی تھا۔ آپ ہوتے تو مجھ سے اس کا اقرار نہ کرتے" بوڑھے کی آواز میں مسرت بھرے جذبات کی گونج تھی ایسی مسرت جو حقیقت کی تلاش میں کامیابی کے وقت ہوا کرتی ہے۔

"میاں آپ بڑے سچے انسان ہیں، خدا کی قسم، آپ بڑے سچے انسان ہیں"۔ اسکی آواز یوں رندھ گئی جیسے مسرت نے اس کے گلے میں آنسو بھر دیئے ہوں۔

"میں جانتا ہوں میاں وہ روپیہ مجھے کس نے دیا تھا۔ میری تہمد سے وہ روپیہ اسی وقت فرش پر گر پڑا تھا اور اسکی آواز سے اس کا کھوٹ کھل گیا تھا۔ روپیہ دینے والا دور نہیں گیا تھا۔ مگر میاں خدا جانتا ہے میں نے اسے آواز نہیں دی کیونکہ اسے اس وقت جو شرمندگی ہوتی وہ مجھ سے دیکھی جاتی"۔

میں نے اسکی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ چند لمحے گم سم کھڑا رہا۔ پھر جیسے میرے قدم آپ ہی آپ وہاں سے آگے بڑھنے لگے۔ اور جب میں دور نکل گیا تو مجھے محسوس ہوا جیسے میرے آس پاس، جیسے میرے وجود کے اندر کوئی رہا ہے — جانے یہ کیسی آواز تھی — خدا جانے یہ کون رو رہا تھا —!

غزل

عیش ٹونکی

حوادث سے جو دنیا میں لڑے ہیں
انھیں کے نام کے جھنڈے گڑے ہیں

یہ بادہ کش عبث ان سے لڑے ہیں
جنابِ شیخ تو چکنے گھڑے ہیں

ہنسی ہیں جب کبھی دو چار گھڑیاں
جبینِ گلستاں پر بل پڑے ہیں

زمانہ سر کے بل گذرے ادھر سے
یہاں ٹوٹے ہوئے ساغر پڑے ہیں

نہ پہنچیں گے مری حدِ وفا تک
ستم کے حوصلے کتنے بڑے ہیں

کوئی دیوانہ گذرا ہے ادھر سے
سرِ راہِ وفا پتھر پڑے ہیں

ٹھہر اے اضطرابِ عزمِ طوفاں
ابھی کچھ لوگ ساحل پر کھڑے ہیں

نہ داغِ دل نہ اشکِ غم فروزاں
نگینے قصرِ ہستی پر جڑے ہیں

جنابِ خضر بھی رخصت ہوئے عیش
وفا کے کوس بھی کتنے کڑے ہیں

افتخار جلیل

موزمبیق

جنگ آزادی کی راہ پر



۲۵ ستمبر ۱۹۶۴ء موزمبیق کے حریت پرستوں کی تاریخ کا یادگار دن رہے گا۔ اسی دن محاذ آزادی کے صدر ایڈوارڈو مانڈلین نے مسلح جدوجہد کے آغاز کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔

"۔ نوآبادکاروں کے ظلم و استحصال کی پالیسی نے عوام کو مسلح جدوجہد کیلئے مجبور کر دیا ہے کیونکہ اسکے سوا ہمارے پاس کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ سالازار کی حکومت پرامن ذرائع پر اعتماد نہیں رکھتی اس لئے ہم نے بھی ہتھیار اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم نے لڑنے اور فتح حاصل کرنے کا پورا تہیہ کر لیا ہے۔

اس اعلان کے ساتھ ہی موزمبیق میں مسلح جدوجہد آزادی کی ابتدا ہو گئی۔ موزمبیق کے عوام محاذ آزادی کے اولوالعزم انقلابیوں کی رہنمائی میں اپنے ملک میں پھیلے ہوئے پرتگال کے فوجی اڈوں پر مسلسل حملے کر رہے ہیں اور پورا ملک میدان کارزار بن گیا ہے پرتگال پچھلے پانچ سو سال سے موزمبیق پر قابض ہے اور اس کے ایک ترجمان کے کہنے کے مطابق ہمیشہ قابض رہنے کا خواہشمند ہے۔ کیونکہ استعماری طاقتیں آسانی سے اپنے مقبوضات چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتی ہیں جب تک انہیں ملک چھوڑنے پر مجبور نہ کر دیا جائے۔

——— الجزائر، ہندچینی اور انڈونیشیا اس کی بہت اچھی مثالیں ہیں جہاں استعماری طاقتوں کو ذلت اور رسوائی کے ساتھ پسپا ہونا پڑا ——— لیکن پرتگال تاریخ کے اس اٹل فیصلے کو ماننے کو تیار نہیں پرتگال آج بھی موزمبیق کے عوام کو غلام بنائے رکھنا چاہتا ہے ـــ حالانکہ یہ دور عوام کا دور ہے ـــ یہ دور استعماری طاقتوں کے زوال کا دور ہے لیکن پرتگال کی حکومت موزمبیق اور دوسری افریقی نوآبادیات کو چھوڑنے پر کسی طرح تیار نہیں جب کہ افریقہ کا ایک ایک ملک آزادی سے ہمکنار ہو تا جا رہا ہے۔

پرتگالیوں کے نقطۂ نظر کے مطابق خدا کی طرف سے انہیں "غیر مہذب" قوموں پر حکومت کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ یہ نظریہ واسکوڈی گاما کے وقت سے پروان چڑھا اور آج بھی پرتگال کے آئین کی دفعہ ۱۳۳ کے مطابق ہے۔

"یہ پرتگالی قوم کی فطرت ہے ـــ کہ وہ دوسرے ملکوں کو نوآبادی بنانے کے "تاریخی مشن" (!) کی تکمیل کرے اور دریافت شدہ علاقوں کو زیر نگیں لا کر اپنی "تہذیب" کے فوائد سے بہرہ ور کرے۔ اسی طرح سے اخلاقی دباؤ کا سہارا لیکر مشرق کی "حفاظت" کے مقصد کی تکمیل کرے۔

——— اور پانچ سو سال اس "مہذب" قوم کی غلامی میں رہ کر موزمبیق کے عوام نے اس نام نہاد تہذیب کے حسن کی بھاری قیمت ادا کی ہے!

محاذ آزادی نے ابتدا میں پرامن ذرائع سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ڈکٹیٹر سالازار کی حکومت نے گفت و شنید کی ہر پیشکش کو مسترد کر دیا اور اسی قسم کی آخری کوشش نوافریقی ممالک کے جلسے میں گزشتہ سال کی گئی تھی جس میں پرتگال سے اقوام متحدہ کے ذریعے گفت و شنید کی پیشکش کی گئی تھی لیکن پرتگال نے ہمیشہ کی طرح اس آواز پر کان دھرنے سے انکار کر دیا اور آخر کار وہ حالات پیدا کر دیئے کہ آزادی کے متوالوں کو ہتھیار اٹھانا پڑا۔

موزمبیق کے عوام اپنے ملک کی آزادی کیلئے سر بکف میدان میں نکل آئے ہیں۔ ان کی یہ مقدس جنگ اس نوآبادی نظام کے خلاف ہی جس میں ایک ملک کے ذرائع اور وسائل دوسرے ملک اپنے مفاد میں استعمال کرتے ہیں اس بربریت اور درندگی کے خلاف ہے جو ان مہذب قوموں نے افریقی ایشیائی اور لاطینی امریکہ کیلئے روا رکھا ہے اس لوٹ کھسوٹ کے خلاف ہے۔ جس کی وجہ سے ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ بیماری، بھوک اور جہالت کے مرکز بن گئے ہیں اور اس جدوجہد میں موزمبیق کے عوام وطن پرستوں کی پوری مدد کر رہے ہیں مثلاً خوراک کی بہم رسانی کی ذمہ داری انہوں نے قبول کر رکھی ہے ایل فیشر کو حال ہی میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے محاذ آزادی کے صدر ایڈوارڈو مانڈلین نے ملک میں مسلح اقدامات کی نوعیت کا ذکر کیا انہوں نے کہا "ہماری حکمت عملی کا ایک اہم جزو ایسے فوجیوں کا انتخاب ہے جو مقامی قبائل کی زبان بولتے ہیں اس طرح ہمیں صرف مقامی آبادی کی حمایت ہی نہیں حاصل ہوتی بلکہ محفوظ پناہ گاہیں بھی مل جاتی ہیں یہ طریقہ موثر ثابت ہوا ہے کیونکہ ہماری فوج کا ایک سپاہی بھی نہ تو گرفتار کیا جا سکا اور نہ اسے نقصان پہنچایا جا سکا۔

مسلح جدوجہد جب سے شروع ہوئی ہے پرتگالی نوآبادکاروں نے موزمبیق کی پرامن آبادی پر اپنے ظلم و ستم میں بھی شدت پیدا کر دی ہے انتقامی کارروائیوں کے سلسلے میں دیہات پھونک دیئے جاتے ہیں معذور بوڑھے عورتیں اور بچے قتل کئے جا رہے ہیں پھر غلے کے ذخیرے تباہ کر دیئے جاتے ہیں اور اس طرح کسانوں کو فاقہ کشی پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ ان سب حرکتوں کا مقصد آبادی کو دہشت زدہ کرنا ہی نہیں ہے بلکہ وطن پرستوں کو خوراک کی بہم رسانی کا سلسلہ تباہ کرنا بھی ہے۔

اس وقت موزمبیق میں پرتگالی فوجیوں کی تعداد ۳۵ ہزار ہے ہر انتظامی علاقے میں ہوائی اڈے اور فوجی اڈے قائم کر دیئے گئے ہیں سفید فام آبادی پر مشتمل "شہری مدافعتی" دستے بنائے گئے ہیں اور انہیں فوجیوں کی حیثیت دی گئی ہے پولیس کو بھی اچھی طرح مسلح کر دیا گیا ہے ریاستی پولیس کے مرکزوں میں خاص سبروسوں

نفسیاتی سماجی مرکزیتی اداروں اور اطلاعات کی ہم آہنگی کے شعبوں کا جال بچھا دیا گیا ہے۔ عالمی رائے عامہ کو دھوکا دینا ان میں پرچار کرنا۔ اور افسوس ناک نوآبادیاتی حقائق پر پردہ ڈالنا ان سروسوں کا مقصد ہے۔

ان تمام ہتھکنڈوں کے باوجود ان پرتگالی نوآبادیوں کی صحیح صورت حال کے حقائق لوگوں کو معلوم ہو ہی جاتے ہیں نوآبادکار ان لوگوں کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں جن پر انہیں تحریک آزادی کے تصور سے ہمدردی رکھنے کا شبہ ہوجاتا ہے۔ ۱۹۶۱ء کی ابتداء میں برطانوی اخبار "اسکاٹس مین" نے ایک افریقی میکنک کی روداد چھاپی تھی جسے پولیس نے مار مار کر بے ہوش کر دیا تھا اور اور اس لئے کہ انہیں یہ شبہ تھا کہ وہ ایک انقلابی گیت گنگنا رہا ہے۔ انہوں نے اسے ایک صندوق میں بند کیا چاروں طرف کیلیں ٹھونک دیں اور صندوق جیل بھیج دیا گیا۔

ان تمام مظالم سے موزمبیق کے عوام کا حوصلہ پست ہونے کے بجائے جدوجہد آزادی کی رفتار میں تیزی پیدا ہوتی جا رہی ہے وہ اس ظلم کی آگ میں جل کر کندن کی طرح چمکنے لگے ہیں اور اب ان کے اٹھے ہوئے سر کو کوئی سالازار کوئی آمر جھکا نہیں سکتا انہوں نے غلامی سے نجات حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا ہے اور وہ اس مقصد کو حاصل کر کے ہی دم لیں گے۔

موزمبیق کے عوام بنیادی شہری حقوق سے محروم ہیں پرتگالی حکمرانوں نے ان کے نام نوآبادی کے "غیر مہذب" باشندوں کی فہرست میں لکھ رکھا ہے یا "مقامی باشندوں" کی فہرست میں ایک "مہذب" یا "ہم پلہ شہری کا درجہ حاصل کرنے کیلئے ایک افریقی باشندے کو متعدد اہانت آمیز آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ مثلاً اسے اپنا گاؤں اپنا قومی لباس ترک کرنا پڑتا ہے پرتگالی زبان بولنی پڑتی ہے گرجے میں برابر جانا پڑتا ہے اور ان سب کے علاوہ ایک مخصوص آمدنی تک پہنچنا پڑتا ہے اسلئے اگر افریقی آبادی پوری تعداد میں ۱۶ء فی صدی لوگ یا کل پانچ ہزار افراد "ہم پلہ" "شہریوں کی حیثیت کے مالک ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

موزمبیق میں آباد ۶۰ لاکھ عوام میں صرف ایک افریقی نے اب تک اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے اور اسے بھی ایک لاٹری میں حصول تعلیم کا حق ہاتھ آگیا۔ ملک کی آبادی کا ننانوے فیصد حصہ ان پڑھ ہے۔

پرتگالی نوآبادیات "موزمبیق" انگولا" اور گنی" سے زیادہ عرصہ تک کوئی بھی افریقی ملک غیر ملکی استبداد میں نہیں رہا ہے اور پرتگال کے استعمار پرست ان ممالک میں ظلم اور استحصال کا بھیانک ناٹک کھیل رہے ہیں۔ اس جگہ پر جنگل کا قانون نافذ ہے۔ جہاں پرتگال کے نوآبادکار انتہائی نخوت سے کہتے ہیں۔

"صرف مُردوں کو کام سے آزادی ملتی ہے۔" موزمبیق کے عوام کو انتہائی معمولی اجرت پر دن اور رات کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ ان کو غلاموں کی طرح نسل پرست رہوڈیشیا اور جنوبی افریقہ کی کانوں میں کام کرنے کیلئے زبردستی بھیج دیا جاتا ہے۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ موزمبیق کی نصف سے زائد آبادی ان نسل پرست حکومتوں کے کانوں میں کام کر رہی ہے

موزمبیق کا نظم و نسق اس طرح کیا گیا ہے تاکہ نوآبادکاروں کو ملک کی آبادی اور دولت کے استحصال میں کوئی دقت پیش نہ آئے امریکہ کے پروفیسر ہیرسن نے جو عرصہ دراز تک موزمبیق میں رہ کر وہاں کے حالات کا جائزہ لے چکے ہیں لکھا ہے کہ پرتگالی انتظام کار ملک کے اپنے علاقے میں عملی طور پر ایک مطلق العنان بادشاہ کی حیثیت رکھتا ہے اگر وہ کسی کو پسند نہیں کرتا تو اسے گرفتار کر سکتا ہے۔ سزا دے سکتا ہے اور اذیتیں پہنچا سکتا ہے۔ اس تانا شاہ کی اجازت کے بغیر نہ تو کوئی افریقی کسی دوسرے علاقے میں منتقل ہو سکتا ہے اور نہ ہی تھوڑے سے وقفے کیلئے کہیں آجا سکتا ہے۔

موزمبیق ایک ایسا ملک ہے جس کا استحصال صرف پرتگال ہی نہیں کر رہا ہے بلکہ اس کے دوسرے اتحادی بھی اپنا حصہ پاتے ہیں۔ موزمبیق کے تیل کے ذخائر امریکہ کے قبضے میں ہیں اور اسے ۴ ہزار مربع میل کے رقبہ پر خصوصی اختیارات حاصل ہیں چائے اور دوسری زراعتی اشیاء برطانیہ کی اجارہ داری ہے۔ فرانس کے حصے میں یورینیم کی کانیں آئی ہیں اور بلجیم کو کوئلہ کی کانوں کا حصہ ملا ہے رہوڈیشیا، جنوبی افریقہ اور دوسرے یورپی ممالک موزمبیق کو روزمرہ استعمال کی اشیا بہم پہنچاتے ہیں اور اس طرح اس ملک کے تمام وسائل کو تمام سامراجی ممالک مل جل کر کھا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پرتگال جیسا چھوٹا اور محدود وسائل کے حامل ملک ایک عرصے سے موزمبیق، انگولا اور گنیا پر قابض ہے اور اس کے اس نوآبادیاتی نظام کو جاری رکھنے میں اس کے ناٹو (NATO) کے اتحادی پورا پورا تعاون کرتے ہیں۔ گزشتہ دس سال میں امریکہ سے ۵ کروڑ ڈالر کی فوجی امداد مل چکی ہے۔ برطانیہ پرتگال کی فوجی امداد دینا اپنا "اخلاقی فرض" سمجھتا ہے۔ فرانس نے پرتگال کو آٹھ بحری جہاز اور آبدوز ... دیئے ہیں۔ مغربی جرمنی کے اسلحہ سے لدے ہوئے جہاز کچھ عرصہ پہلے پرتگال پہنچے تھے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ جنوبی افریقہ۔ اور ... رہوڈیشیا کی نسل پرست حکومتیں پرتگال سے مکمل تعاون کر رہی ہیں۔

معاہدہ ناٹو اور دوسرے فوجی معاہدوں نے ایشیا اور افریقہ کی تحریک جدوجہد آزادی میں پورا پورا منفی کردار ادا کیا ہے ان معاہدوں نے سامراجی ملکوں کے نوآبادیاتی نظام کو قائم رکھنے اور دوسرے ملکوں پر زبردستی مسلط رہنے نیز ان کی معاشرتی و معاشی استحصال کرنے میں ہر ممکن اعانت کی ہے۔ الجزائری مجاہدوں کی جدوجہد کو دبانے کیلئے ناٹو کے اسلحہ استعمال ہوتے تھے اور یہی کھیل کانگو ملائیشیا اور عدن میں کھیلے جا رہے ہیں۔ ان جارحانہ معاہدوں کا مقصد ایک اور صرف ایک ہے کہ ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہو سکیں۔ وہ ہمیشہ مغربی ممالک کے دست نگر رہیں اور ان ممالک کی منڈیاں سرمایہ داروں کے لوٹ کھسوٹ کیلئے کھلی رہیں۔

اس صورت حال میں مغربی طاقتوں کی طرف سے پرتگال کو ملنے والی فوجی امداد قطعی تعجب خیز نہیں ہے۔ یہ بات قطعی واضح ہے کہ اگر سالازار حکومت کو باہر سے اتنی امداد نہ مل رہی ہوتی تو موزمبیق میں قومی آزادی کی تحریک کے مقابلے میں اسے کب کی شکست ہو چکی ہوتی۔

موزمبیق کے وطن پرستوں کی جائز تحریک آزادی کو تمام آزاد افریقی ملکوں کی ہمدردیاں اور حمایتیں حاصل ہیں۔ افریقی اتحاد تنظیم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ محاذ آزادی کو ہر ممکن امداد دے گی۔ ایڈوارڈو ماندلین نے بتایا کہ "سوشلسٹ ملکوں کو ہمارے ملک سے صرف ایک ہی دلچسپی ہے اور وہ ہے ہمارے عوام کو آزاد دیکھنے کی خواہش اور یہ ملک ہماری جدوجہد میں ہماری مدد کر رہے ہیں۔"

براعظم افریقہ پر موزمبیق اُن آخری ملکوں میں ہے جہاں نوآبادیاتی راج قائم ہے اور اس ملک میں بھی آزادی کی کرن پھوٹنے ہی والی ہے!





سمجھوتے

انور خواجہ

نجمہ نے غسل خانے سے برآمدے کی طرف دیکھا
نرم نرم سنہری دھوپ آنگن کی دیوار سے اتر کر برآمدے میں پچھی ہوئی آرام کرسی پر چمک رہی تھی اسکی حدت و تپش میں ایک ساحرانہ کشش تھی۔

وہ کشش سے چور چور تھی اور سوچنے لگی کہ اگر تھوڑی دیر کے لئے اس نرم و گداز کرسی پر ستائے لیکن ابھی تو بہت سا کام باقی تھا صبح چھ بجے وہ بیدار ہوئی تھی اور ابھی نو بج رہے تھے اور اسے ایک منٹ بھی فرصت نہیں ملی تھی ننھے کے چھوٹے کپڑے دھونے تھے۔ اعجاز اور اپنے شوہر کے کپڑے دھوبی کو بجوانے تھے دوپہر کا کھانا تیار کرنا تھا گھر وں کو جھاڑنا تھا اس کے سوا نہ جانے کتنے بے شمار چھوٹے چھوٹے کام تھے۔ ہر دس منٹ کے بعد وہ کھڑکی سے جھانکتی۔ کہ کہیں اعجاز کھیلتے ہوئے دور جرنیلی سڑک پر نہ نکل جائے اور خدانہ خواستہ کہیں برق رفتار گاڑی کی لپیٹ میں نہ آجائے رات اور صبح کے ڈھیر سارے برتن آخر اس نے دھو ڈالے جھکے جھکے اسکی کمر میں ٹیس اٹھنے لگی تھیں غسل خانے کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اس نے آنکھیں موندلیں نیند ایک نشہ کی طرح اسکے رگ و پے میں سرایت کرنے لگی۔ ایک غبار کی طرح اس پر چھانے لگی وہ سوچنے لگی کہ آج ہی اس مائی کمبخت کو چھٹی لینی تھی کم از کم برتن دھو ڈالتی تو تھوڑی دیر آرام تو کر لیتی۔ نیند میں اس کا ہاتھ برتنوں سے ٹکرایا۔ تانبے کی تھالی گری چھناکا ہوا اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی شکر ہے کوئی چینی کا برتن نہیں ٹوٹا اس نے برتن اٹھائے اور باورچی خانے کی الماری میں جا کر ترتیب سے رکھ دیئے
ٹھنڈے غسل خانے میں دیر تک بیٹھنے سے اس کے پاؤں سن ہو گئے اسکی ٹانگوں میں سردی کی لہریں رینگ رہی تھیں۔ اب اس میں مزید کام کرنے کی سکت باقی نہیں تھی۔ نرم آنچ والی دھوپ اور گدے دار آرام کرسی اسے بلا رہی تھی وہ آرام کرسی پر آ کر دراز ہو گئی

پچھلی کئی راتوں سے ننھی نے اسکی نیند حرام کر رکھی تھی اور اس رات تو ایک پل کے لئے بھی اسکی آنکھ نہیں جھپکی تھی رات بھر ننھی کو سینے سے لگا کر ٹہلتی رہی لیکن اسکے شوہر کی نیند میں ذرا برابر بھی فرق نہیں آیا وہ مزے سے خراٹے بھرتا رہا۔ نجمہ کو اپنے شوہر کی خود غرضی پر بے حد غصہ آیا۔ کیا وہ بہرہ ہو گیا ہے اس کے کان میں ننھی کی چیخوں کی آواز نہیں جاتی ——— یہ مردوں کی ذات ہوتی ہی خود غرض ہے عورتوں کو عذاب میں مبتلا کر کے خود کس مزے سے سو رہے ہیں۔

صبح ناشتے پر حفیظ نے اسکی لال انگارہ سوجی ہوئی آنکھوں اور سست طبیعت کو ذرا بھی محسوس نہ کیا وہ مزے سے چائے کی چسکیاں لیتا اور اخبار پڑھتا رہا۔ اعجاز نے دو دفعہ اپنے آپ پر چائے گرائی ایک دفعہ ننھی کا بسکٹ چھین کر کھانے کی کوشش کی لیکن اس کے شوہر نے اخبار سے نظریں نہیں ہٹائیں۔

ننھی کی پیدائش کے بعد اعجاز پر وہ بہت کم توجہ دے رہی تھی اس بات کو وہ سخت محسوس کر رہا تھا اس لئے وہ بے حد ضدی اور چڑچڑا ہو گیا تھا۔ اور جان بوجھ کر ایسی

حرکتیں کرتا جن سے اسکی امی کو غصہ آئے۔

نجمہ نے چائے کی پیالی ہاتھ سے رکھ دی۔ نیند کے جھونکے آرہے تھے اس کا جی چاہتا تھا کہ یہاں سے بھاگ جائے کسی اندھیری کوٹھری میں چھپ جائے۔ سب چیزوں سے بے خبر اور بے نیاز ہو کر۔

حفیظ نے ناشتہ کر کے کوٹ پہنا ٹائی کی گرہ درست کی بچوں کو پیار کیا اور انہیں تھپتھپایا۔

"اچھا بیگم صاحب آداب۔ ہم چلے۔ شام کو ملیں گے۔"

اس نے اپنی پرانی سائیکل اٹھائی اور گلی میں چلا گیا وہ اسے کھڑکی میں سے دیکھنے لگی شادی کے بعد وہ کافی موٹا تازہ ہو گیا تھا۔ قریب سے وہ بھدا لگنے لگا تھا۔ شادی سے قبل وہ بڑا بانکا جوان تھا۔

جب وہ گلی کے نکڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو غصہ کے ساتھ ایک محبت کی لہر بھی اس کے دل میں ابھری جو تمام کدورت اور نفرت کے جذبوں پر حاوی ہو گئی۔ وہ ایک مرد کی حیثیت سے تمام چیزیں محسوس بھی تو نہیں کر سکتا جو وہ ایک عورت کی حیثیت سے محسوس کرتی ہے۔ عورت بچے کو دامن پھیلا کر سنبھالتی ہے اسے نرمی نمی اور حرارت بخشتی ہے اسکی نازک نازک شاخوں اور کونپلوں کو اس طرح پھیلاتی اور سنوارتی ہے کہ کوئی کومل، کونپل زخمی نہ ہونے پائے تخلیق کا یہ گہرا جذبہ — یہ کامل احساس صرف دھرتی کا سینہ اور عورت کا پیٹ محسوس کر سکتا ہے

آرام کرسی پر وہ گہری نیند میں ڈوبی پڑی تھی۔ کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اسکی آنکھ کھل گئی۔

دھوپ کمروں تک پہنچ چکی تھی اس نے لپک کر دروازہ کھولا بھنگن کو دیکھ کر اسے بڑا غصہ آیا لیکن وہ خاموش رہی اگر بھنگن نہ آتی تو شاید وہ دوپہر تک اسی طرح سوتی رہتی اور سارے کام دھرے رہ جاتے اس نے کھڑکی سے گلی میں جھانکا۔ اعجاز ڈیوڑھی کی سیڑھیوں پر تصویروں والا رسالہ لئے افسردگی سے بیٹھا اس کے ورق الٹ رہا تھا۔ اسے اپنے بیٹے پر ایکدم پیار آیا۔ وہ بے اختیار ہو کر اسے بلانے لگی تھی کہ پھر رک گئی وہ اندر آ گیا تو پھر کوئی کام نہ کرنے دیگا۔

باورچی خانے میں جا کر اس نے کھانا پکایا اور اپنے شوہر کو بھجوایا اور پھر ننھی اور منے کو دودھ پلا کر سلا دیا اور آرام کرسی پر دراز ہو گئی۔ اس نے خود بھی کھانا کھا لیا۔ اب نیند کا خمار پھر چڑھنے لگا وہ اعجاز کا انتظار کرنے لگی۔ وہ آ کر کھانا کھالے اور وہ پھر آرام کرسی پر دراز ہو جائے۔ اس نے تین چار بار اسے بلایا مگر وہ آتا ہی نہیں تھا۔ خدا خدا کر کے اندر آیا۔ اب کھانے میں اس نے نخرے شروع کر دیئے اس کے بعد باہر جانے لگا۔

"جازی مری جان اب باہر نہ جاؤ۔ میری مانو تو اب اندر لحاف اوڑھ کر سو رہو۔"

"نہیں نہیں میں جاتا ہوں — چھو کے گھر جاتا ہوں"

"شام کو چلے جانا — باہر سڑک پر بھیڑ ہے۔"

"نہیں میں ابھی جاؤں گا۔"

"ضد نہ کرو میری جان اچھے بچے ضد نہیں کرتے۔"

نجمہ نے اسے گلے لگا کر پیار کیا۔ وہ غصہ اور محبت کی ملی جلی نظروں سے اپنی ماں کو دیکھنے لگا۔ نجمہ نے اسے دوبارہ اپنے سینے سے بھینچا اور بازوؤں میں لے کر بستر پر ڈال کر لحاف اڑھا دیا۔

جب وہ آرام کرسی پر دوبارہ آ کر بیٹھی تو دھوپ کی گرم گرم شعاعیں اسے تھپکیاں دینے لگیں اسے یوں لگا کہ وہ سفید سفید روئی کے گالوں جیسے بادلوں میں اڑتی چلی جا رہی ہے۔ اور اس کے چاروں طرف ایک مدہوش کن خوشبو پھیلی ہوئی ہے اس پر ایک انجانی اور لذیذ سی غنودگی طاری ہو رہی ہے

اچانک کسی نے اس کی قمیض کھینچی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اعجاز اسکی کرسی کے ساتھ لگا کھڑا تھا — اسکی آنکھوں میں خوف اور غصے کے گڈمڈ احساسات تھے۔

"امی مجھے وہ بسکٹ دو جو ابا لائے تھے۔"

"جاؤ دفع ہو جاؤ — ابا کی الماری سے لے لو — ذرا بھی آرام نہیں کرنے دیتے۔"

اسکی پلکیں ایک دھارے کی طرح آنکھوں پر گرنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد اسے پھر کسی نے جھنجھوڑا۔ اس نے آنکھیں کھولدیں اور غصے سے چیخی۔

"کون ہے"

اعجاز سہما ہوا اس کے سامنے کھڑا تھا اس کے کپڑے مٹی سے اٹے ہوئے تھے اور ہاتھوں اور منہ پر بسکٹ کی چکنائی تھپی ہوئی تھی۔

"اب کیا چاہتے ہو؟"

"امی مجھے کہانی سناؤ۔"

"یہ کوئی کہانی سنانے کا وقت ہے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے — دور ہو جاؤ خدا تمہیں غارت کرے۔

اس نے اعجاز کے گال پر ایک زوردار چپت رسید کی۔ اعجاز روتا بسورتا باہر نکل گیا اور نجمہ نے پھر آنکھیں بند کر لیں اعجاز کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو چمک رہے تھے۔ یہ دردناک منظر اس کی ماں نہ دیکھ سکی اس پر نیند کا ایک دیوانہ نشہ طاری تھا۔

وہ گلی میں آہستہ آہستہ چلنے لگا ایک آواز آہنی ہتھوڑے کی طرح اس کے ننھے سے دماغ سے ٹکرا رہی تھی — نکل جاؤ — دور ہو جاؤ — کسی کو تمہاری پرواہ نہیں ہے کوئی تمہارا خیال تک دل میں نہیں لاتا — یہ سوچتے ہوئے وہ سڑک پر نکل گیا۔

جب سے ننھی پیدا ہوئی تھی نجمہ کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ اب ننھی تین مہینے کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ لیکن ان تین مہینوں کی راتوں میں ایک رات بھی ایسی نہ آئی تھی جب اس نے تمام رات سو کر گذاری ہو — اسے یوں لگتا تھا کہ وہ صدیوں سے جاگ رہی ہے اور نیند کی تلاش میں بھٹک رہی ہے اور اب تو اس کے بدن کا بند بند ٹوٹ چکا ہے۔ فنا ہو چکا ہے

آرام کرسی پر دوبارہ لیٹتے ہوئے نجمہ کو نیند تو آ رہی تھی مگر اب اس کے نشے میں تندی اور سرکشی غائب ہو چکی تھی۔ ایک ہلکی ہلکی غنودگی — ایک ٹوٹا ہوا نشہ ایک اندھیرے اجالے کی کیفیت — پھر ہر سمت دھیرے دھیرے ایک دھند چھا گئی جس میں ذہن اور سوچ کی ساری کائنات ڈوب گئی۔ دھوپ کی آنچ یوں لگ رہی تھی جیسے کوئی اسے دھنکی ہوئی روئی کے گودام میں دفن کر رہا ہو۔ اس کے دماغ میں ایک الاؤ سا روشن ہو گیا تھا — پانچ سال کے دن اور راتیں ایک فلم کی طرح چلنے لگے۔

ٹاہلی کی گدے دار آرام کرسی پر بے حس پڑا جسم اب کچھ ڈھل رہا تھا۔ اس کا جوان توانا بدن پریشانیوں کے بوجھ تلے دب کر کتنی جلدی زوال کی طرف مائل ہو رہا تھا لیکن وہ اپنے جسمانی انحطاط سے بے خبر تھی اس کے ذہن میں ایک طوفان کھول رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اسکی زندگی ایک گائے کی طرح بے مقصد اور بے کار ہے — اس وقت بھی وہ اپنی اس بیزار کن اور بے مصرف زندگی کے بارے میں سوچ رہی تھی — اگرچہ اس کا ذہن نیند کے غلبے کے نیچے دبا ہوا تھا لیکن پریشانیوں کی لہریں برابر اٹھ رہی تھیں۔

اچانک ایک غبار اٹھا۔ آندھی آئی اور تڑ تڑ گولیاں چلنے لگیں وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی کوئی زور زور سے اس کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا ایک جوان شخص خون میں لت پت اعجاز کو بازوؤں میں اٹھائے کھڑا تھا۔ نجمہ نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔

نجمہ اور حفیظ نے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی۔ چند مہینوں بعد ہی وہ اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس کرنے لگے تھے دونوں نے انفرادی طور پر ایک بیزاری اور اکتاہٹ محسوس کرنی شروع کر دی۔ وہ حیران تھے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے اب شادی سے قبل کے زمانے کے جوش و خروش کا کوئی نام و نشان نہیں تھا اور آخر یہ طوفان کدھر کو چلا گیا تھا۔ کیا زندگی کی وہ اقدار جو ان کو اس وقت اتنی عظیم نظر آ رہی تھی صرف چند ملاقاتوں میں فنا ہو گئیں۔ بہر حال ان سے کوئی نہ کوئی غلطی ضرور سرزد ہوئی ہے

حفیظ اپنی بیزاری کو دنیاوی جھگڑوں میں غرق کر دیا کرتا تھا لیکن نجمہ کی تنہائی اور افسردگی اسے زہر کی طرح کاٹتی۔ کوئی تیز نشتر سینے میں اترتا چلا جاتا۔ حفیظ نے نجمہ کو بہلانے کے لئے طرح طرح کی تدابیر اختیار کیں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا

ایک دن نجمہ نے اسے خوشخبری سنائی کہ وہ باپ ہونے والا ہے۔ خوشی کے مارے وہ ناچنے لگا۔

نجمہ کے یہاں چاند سا لڑکا پیدا ہوا۔ حفیظ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔

نجمہ کی تنہائی اور افسردگی کا علاج تو ہو گیا اس کی اپنی تنہائی میں اضافہ ہو گیا وہ اب اپنے آپ کو اس گھر

میں اجنبی سا محسوس کرتا۔ نجمہ بچے کو پاکر اسے بالکل بھول گئی تھی۔ اسے شوہر کی ضرورتوں کا کوئی احساس ہی نہ رہا تھا حفیظ اب دفتر کے بعد زیادہ گھر نہیں آتا۔ شام کا وقت دوستوں یاروں کے ساتھ گھوم پھر کر گذارتا۔

منا اعجاز ابھی ایک سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ نجمہ نے اسے ایک خوشخبری اور سنائی وہ سخت جھنجھلایا۔

"یہ کیا حماقت شروع کر دی تم نے ؟"

"حماقت کی کیا بات ہے اس میں۔"

"ہاں تم تو اس معاملے میں عقل سے کام لینا کفر سمجھتی ہو۔"

"تو پھر کیا کروں۔"

"علاج کرواؤ۔"

"واہ علاج کرانا جیسے مذاق ——— چار مہینے تو گذر چکے ہیں۔"

"تو پہلے بتاتیں ——— تو کچھ کیا جاتا۔"

"مجھے ڈر تھا کہ تم اسوقت بھی یہی مشورہ دو گے۔"

"دیکھو نجمہ تم پڑھی لکھی ہو کر بھی بعض دفعہ ایسی احمقانہ باتوں پر عمل کرتی ہو کہ تمہاری تعلیم و تربیت پر دکھ ہوتا ہے ——— بچے زیادہ ہو جائیں تو نہ انکو اچھی طرح تعلیم دے سکو نہ ان کو سماج کے کارآمد افراد بنا سکو۔ سوچنے کا یہ انداز غلط ہے ہمیں زمانے کے ساتھ چلنا ہو گا۔"

"تو کیا میں زمانے کے ساتھ نہیں چلتی۔"

"زمانے کے ساتھ چلتی تو ہو مگر بددلی سے ——— اب بتاؤ کہ تم منے کو سنبھالو گی یا اس ننھی بلا کو ——— دونوں پر پوری توجہ نہ دے سکو گی ——— نتیجہ تکلیف اور بے آرامی کے سوا کچھ اور نہیں نکلے گا۔"

"تکلیف ہو گی تو مجھے ہو گی۔ آپ کو کیا ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے ——— لیکن میری زندگی بھی حرام ہو جائے گی۔ تمہیں واحد متکلم میں سوچنے کا حق نہیں۔ جمع متکلم میں سوچا کرو ——— آخر تم شادی شدہ عورت ہو۔"

"اچھا بابا معاف کر دو ——— تم تو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہو۔"

نجمہ کے ہاں دوسرا بیٹا پیدا ہوا پھر ایک لڑکی۔ حفیظ نے ایک دو دفعہ کوشش کی۔ لیکن جب تک نجمہ اس سے تعاون نہ کرتی وہ بے بس تھا۔

حفیظ نجمہ کو بے حد چاہتے ہوئے بھی اسکی دقیانوسیت سے سخت بیزار تھا۔ وہ اتنی پڑھی لکھی ہو کر بھی تعویذ گنڈوں اور جن پریوں پر ایمان رکھتی تھی ——— اب اسکی حماقت اور ضد کے سبب تین چار بچے اوپر تلے پیدا ہو گئے تھے جنکی پوری طرح نگہداشت نہیں ہو رہی تھی انکی صحت کا ستیاناس ہو رہا تھا۔ گھر کی حالت سخت خراب رہتی تھی۔

بڑا لڑکا اعجاز اب بہت چڑچڑا ہو گیا تھا۔ بات بات پر ضد کرتا اور چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیتا۔ یہ اس بات کا صاف ردعمل تھا کہ ماں اسکی پر پوری توجہ نہیں دے رہی ہے۔ اس کے چھوٹے بھائی اور ننھی بہن کی وجہ سے اسکی اہمیت بالکل کم ہو کر رہ گئی تھی۔

حفیظ اکثر گھر دیر سے آتا کھانا کھاتے ہی اس کی آنکھیں مندنے لگتیں۔ تھوڑی دیر میں خراٹے لینے لگتا۔ نجمہ ننھی کی وجہ سے دیر تک جاگتی رہتی۔ بعض دفعہ ننھی رونے لگتی تو کسی طرح چپ نہ ہوتی وہ اسے کندھے سے لگا کر گھوما کرتی لیکن وہ روئے جاتی حفیظ کے خراٹوں کے تواتر میں ذرا بھی فرق نہ پڑتا نجمہ کا جی چاہتا کہ اس چیختی گڑیا کو اس پر دے مارے۔ تاکہ اس کے خراٹوں کی یہ منحوس آواز بند ہو جائے جو ایک ہی وقفہ اور آہنگ کے ساتھ تمام رات اس کے نرخروں سے نکلتی رہتی تھی۔

پچھلے تین چار مہینے تو بس جہنم میں گذرے تھے اسکول میں پڑھاتے اسے نیند آنے لگتی اور جب اونچی کرسی پر بیٹھ کر وہ کرسی کے ساتھ سر لگاتی تو خودبخود اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں۔ لڑکیوں کے چہرے دھندلا جاتے تختہ سیاہ پر حروف مدھم پڑ جاتے اور وہ خمار کے تالاب میں ڈوبتی جاتی کہ لڑکیوں کا بڑھتا ہوا شور اسے چونکا دیتا اور وہ انھیں ڈانٹنے ڈپٹنے لگتی۔

بعض اوقات وہ سوچتی کہ ملازم پیشہ عورتوں کو شادی نہیں کرنی چاہیئے شکر ہے کہ حفیظ اس کی تکلیف کو دیکھ کر ایک بوڑھی مائی کو گھر کے کام کاج کرنے کے لئے لے آیا تھا۔ پھر ایک منحوس دن جب اسے چھٹی تھی اور مائی اپنے کسی کام سے گاؤں گئی ہوئی تھی وہ عظیم سانحہ پیش آیا اور اعجاز ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو گیا۔

اعجاز کی موت نے نجمہ کو ایک لمبی چپ لگا دی تھی اس نے اتنا بڑا صدمہ کبھی برداشت نہیں کیا تھا۔ وہ حیران تھی کہ وہ کس طرح زندہ بچ گئی۔ اس کا دل اتنا کمزور تھا کہ وہ اعجاز کی معمولی سی تکلیف سے بھی تڑپ اٹھتی تھی لیکن اب اسکی موت کے بعد بھی زندہ تھی ——— اعجاز کی موت کی وہ خود ذمہ دار تھی۔

ایک سال اور گذر گیا ان کے گھر میں اب ایک مستقل اداسی اور جمود چھایا رہتا۔ حفیظ اکثر دیر سے آتا۔ اور بعض دن کھانا کھائے بغیر ہی پلنگ پر دراز ہو جاتا تھوڑی دیر بعد اس کے خراٹوں کی آواز سے معلوم ہوتا کہ وہ سو گیا ہے صبح کے وقت تو انکی شاذونادر ہی ملاقات ہوتی وہ صبح سویرے اٹھ کر اسکول چلی جاتی مائی بچوں کو سنبھالتی اور حفیظ کے لئے چائے وغیرہ بناتی۔

اسے اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے حفیظ سے شادی نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ جب عشق ایک غبار بن کر اڑ جاتا ہے اور تلخ حقیقتیں منہ پھاڑے سامنے آ جاتی ہیں اور ان چیزوں پر صرف عورت مرد کی ذہنی ہم آہنگی کے ذریعہ ہی قابو پایا جا سکتا ہے۔ یہ اسی کے شوہر کی فکر کا نچوڑ تھا۔

یہ ذہنی ہم آہنگی کوئی خارجی چیز نہیں ——— ہم دونوں مل کر اسے پیدا کر سکتے ہیں ایک دفعہ اس کے شوہر نے اسے سمجھایا۔

"کس طرح ؟"

"ارے بھئی سیدھی سی بات ہے جب تم اپنے آبائی تعصب قربان کرو کچھ میں قربان کروں ——— اس طرح ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔"

"آبائی تعصب سے آپکی کیا مراد ہے ؟"

"یہ ایک ایسی چیز ہے جو کسی منصوبہ بندی کو کامیاب نہیں ہونے دیتی۔"

"بھئی میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ توبہ آپ سے کون بحثے۔"

اب وہ پھر امید سے تھی۔ لیکن گرنے سے معاملہ خراب ہو گیا۔ اس نے رو رو کر برا حال کر دیا اور حفیظ کو قصوروار گردانے لگی۔

ایک دن وہ گھر واپس آیا تو نجمہ رو رہی تھی۔

"آخر کب تک سوگ مناؤ گی ——— پیاری اس طرح زندگی گذر نہیں سکتی۔"

"ہائے آپ کو کیا دکھ تو مجھے ہوا ہے۔"

"خدا کے لئے اب اس جھگڑے کو چھوڑو ——— اس کے بغیر بھی زندگی گذر سکتی ہے۔ تمہاری اس حماقت سے پہلے ہی ایک عظیم صدمہ گذر چکا ہے۔ اپنا نہیں تو منے اور منی کا خیال کرو ——— ابھی تو انھوں نے اچھی طرح چلنا پھرنا بھی نہیں سیکھا۔"

"آپ کو تو بچے اچھے نہیں لگتے۔"

"بچے اچھے لگنے کا مطلب یہ نہیں کہ ایک فوج پیدا کر دو۔ نہ انکی تربیت ہو سکے نہ ان کا پیٹ بھر سکے ——— یہ کہاں کی عقلمندی ہے بھلا۔"

"آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔"

"پانچ سال سے سمجھا رہا ہوں تم سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتی ہو ——— بخدا گھر جہنم لگتا ہے۔"

"چلیئے آپ کا نسخہ آزما لیتے ہیں ہم آہنگی والا۔"

"لیکن کس طرح آزمائیں۔"

"کچھ آپ اپنے آبائی تعصب قربان کریں کچھ میں کرتی ہوں۔"

"میرے آبائی تعصب کون سے ہیں۔ ؟"

"مثلاً دیر سے گھر نہ آئیں۔ ان دو لڑکیوں سے قطع تعلق کر لیں۔ جن کو آپ نے دھوکے میں رکھا ہوا ہے کہ آپ ان سے شادی کریں گے۔ حالانکہ نئے شادی قانون کی رو سے آپ میری زندگی میں ایسا نہیں کر سکتے۔"

حفیظ نے قہقہہ لگایا۔

"منظور۔ منظور ——— اب کہو۔ تم کون سے آبائی تعصب قربان کرو گی۔ ؟"

"وہ جو آپ نے کہے ہیں۔"

"مثلاً۔"

"بھئی مجھے شرم آتی ہے۔"

"یعنی منصوبہ بندی کرو گی۔"

"منظور۔"

"خوب۔"

حفیظ نے نجمہ کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا اور دونوں ہنسنے لگے ؂

راہِ خدا

سدرشن بالی



سفید گیہوں کے آٹے کی ایک بوری کے لئے میں فلور مل کے مالک سیٹھ نیمی چند سے فرمائش کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسکی بچی منجو ہماری بے بی کو اپنی سالگرہ کا دعوت نامہ دینے کے لئے آگئی اور بیوی حسب عادت اس سے محو گفتگو ہوگئی ۔ میں اپنے لکھنے کے کمرے میں بیٹھا ہوا بیزار ہوا تھا۔ مونگ پھلی کے تیل کے بیشمار کنستر ان کے ہاں کس لئے گئے مجھے یہ اسے معلوم ہی تھا وہ اخبار میں پڑھ ہی چکی تھی کہ سیٹھ نیمی چند نے سیکڑوں من آٹے کی بوریاں تلوا کر دان کی ہیں۔

میں شہر کی اس خوبصورت کالونی کے جس بلاک میں رہتا ہوں اتفاق سے اس بلاک کے سبھی بنگلوں میں یا تو مرکزی و صوبائی حکومت کے افسران رہتے ہیں یا بڑے بڑے بزنس مین و مل مالکان ۔ لیکن اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں ۔ کیونکہ سرکاری افسران اور بزنس مینوں کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور ایک دوسرے کے طفیل ہی وہ عیش و عشرت و آسودگی کی زندگی بسر کرتے ہیں ۔

پانچ سال پہلے نیمی چند سیٹھ ہمارے قریب کے ایک بنگلے میں آکر سکونت پذیر ہوئے اور ایک بڑے کائیاں بزنس مین کی طرح اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا "صاحب آپ بھی رفیوجی ہیں اور ہم بھی رفیوجی ہیں۔"

"آپ پاکستان میں کہاں تھے؟"

"ہم پاکستان سے نہیں کلکتہ سے آرہے ہیں ۔ آپ گاندھی اور جناح کے بنائے ہوئے رفیوجی ہیں اور ہم مزدور لیڈروں کے۔"

"وہ کیسے ۔؟"

"دیکھئے نا بنگال و آسام میں ہم سب مارواڑیوں کی ملوں میں ہڑتالیں کرا کرا کر اور مزدوروں کو ہمارے خلاف بھڑکا بھڑکا کر ہمیں مجبور کیا گیا کہ ہم اپنا سب کاروبار وہاں سے سمیٹ کر راجستھان لے آئیں اس شفٹنگ میں ہمارا لاکھوں کروڑوں روپے کا نقصان ہوگیا اور ہم بالکل رفیوجی ہو کر رہ گئے ۔"

ایک سرکاری افسر ہونے کے باوجود میرا فلور مل سے کچھ بھی واسطہ نہ تھا میرا کام تو صرف لوہے اور دھات کے کارخانوں کا معائنہ کرنا تھا ۔ اس کے باوجود سیٹھ نیمی چند نے بہت اصرار کیا کہ میں ایک روز اسکی مل کا معائنہ کروں اور دیکھوں کہ وہاں مشینوں کے ذریعہ کس طرح گیہوں کو صاف کیا جاتا ہے ۔ دھویا اور سکھایا جاتا ہے ۔ پھر اس کا آٹا یا میدہ بنایا جاتا ہے ۔ بوریوں کے منہ بھی مشینوں سے ہی سئے جاتے ہیں کسی اسٹیج پر بھی انسانی ہاتھ آٹے کو نہیں لگتا اور اس نے نمونے کے طور پر ایک چھوٹا پیکنگ آٹے کا بھجوا بھی دیا ۔ لیکن میری بیوی جو کھانے پینے کے معاملے میں شروع ہی سے بہت محتاط چلی آرہی تھی، وہ آٹا استعمال کرنے سے





بالکل انکار کر دیا۔ وہ ہمیشہ فارم کا بڑھیا گیہوں منگوا کر اسے اپنے سامنے صاف کروا کر چکی سے پسوایا کرتی تھی میرے بتلانے کے باوجود کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں کہ مل کے اندر گیہوں کو کس طرح صاف کیا جاتا ہے پھر پیسا جاتا ہے اس نے مل کا آٹا استعمال کرنے سے تذبذب کیا۔ بلکہ دو تین دن کے بعد ایک شام جب میں دفتر سے واپس لوٹا تو چائے کے پیالے بجاتے ہی میری بیوی نے کہا۔

"جانتے ہیں آج سیٹھ نمی چند کی بنگالی آیا کیا بتا رہی تھی۔؟"

"کیا بتا رہی تھی؟"

"وہ بتا رہی تھی کہ بنگال کے پہلے چیف منسٹر کو انہیں فلور ملوں کے مالکوں کے باعث ہی مستعفی ہونا پڑا تھا۔ یہ سب ملوں والے آٹے میں سوپ سٹون ملاتے تھے وہ اس ملاوٹ کو فوراً بند کرنا چاہتا تھا تب مل مالکوں نے اسمبلی میں بہت سے ممبروں کو رشوت دے کر ان سے عدم اعتماد کا نوٹس دلوا دیا۔ مگر چیف منسٹر بڑا بے غرض آدمی تھا اس نے خود بخود ہی استعفے دے دیا۔"

"میں نے کہا" یہ آیا بھی کوئی کمیونسٹ معلوم دیتی ہے میں نے تو اس مل کا آٹا پسنے کا شروع سے آخر تک کا طریقہ دیکھا ہے مجھے تو کہیں بھی آٹے میں سوپ اسٹون ملاد کھائی نہیں دیا۔"

"آپ کو پتہ بھی کیسے لگنے دیتے۔ آٹا بھی سفید اور سوپ سٹون بھی سفید۔ ملاوٹ کرتے کیا دیر لگتی ہے؟"

اس پیکنگ کا رنگ بھی بالکل سفید تھا جسکے اندر آٹا مجھے بھیجا گیا تھا اور جسے میں نے اپنی بیوی کے اصرار پر سیٹھ نمی چند کو واپس کر دیا تھا۔

لیکن وہ پانچ سال پہلے کی بات تھی۔ تب خریدار بڑے نخرے سے کسی بھی دکان سے اپنی مرضی کے مطابق گیہوں خرید سکتا تھا۔ مگر آج جب کہ گیہوں عنقا ہو چکا تھا۔ دکانداروں نے اسے تہہ خانوں میں دبا دیا تھا یا کسانوں نے ہی اپنے گھروں میں بند کر رکھا تھا سرکار کو آسٹریلیا یا دیگر ممالک سے گیہوں درآمد کرنا پڑ رہا تھا یہ گیہوں بھی عجیب قسم کا تھا۔ لال رنگ کا بڑا باریک و جھریاں زدہ گیہوں، اس کو دیکھتے ہی میری بیوی کا چہرہ ایکدم مرجھا گیا "ہے رام اب یہ کھانا پڑے گا۔ وہ فارم کا گیہوں کہاں چلا گیا ستیاناس ہو ان اسٹاک ہولڈروں کا۔ آپ نے سنا کیا ایک آدمی باہر گیا ہوا تھا۔ پیچھے برسات کا پانی اس کے تہہ خانے میں چلا گیا جس کے اندر ہزاروں بوریا گیہوں کی اس نے چھپا کر رکھی ہوئی تھیں۔ وہ گیہوں ایکدم خراب ہو گیا ہے بو آنے لگی ہے اس سے اور وہ کھانے کے قابل نہیں رہا۔"

"یہ خبر بھی اسی بنگالی آیا کی دی ہوئی ہے؟"

"ہاں" میری بیوی نے قدرے خفگی سے کہا "نہ جانے آپ یہ سب باتیں جھوٹ کیوں سمجھتے ہیں۔"

"بالکل جھوٹ نہیں سمجھتا میم صاحب۔ میں نے تو ویسے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ خبر اس آیا نے پہنچائی ہوگی"

اس علاقے میں برسات کی کمی کے باعث کم اناج پیدا ہوتا ہے لیکن قدرت کے کام بھی بڑے عجیب و غریب ہیں کبھی کبھی تو غصہ آنے لگتا ہے اس سال اتنی زیادہ بارش ہوئی اتنی زیادہ بارش ہوئی کہ تمام فصلیں تباہ ہو گئیں فصلوں کے ساتھ ساتھ کسان بھی تباہ ہو گئے ان کے کچے مکانات گر گئے گھروں میں کئی کئی فٹ پانی جمع ہو جانے کے باعث تمام سامان یا زندگی کی پونجی زیر آب ہو گئی کئی جانیں تلف ہو گئیں نتیجہ کے طور پر گاؤں کے گاؤں خالی ہو گئے اور وہ سب لوگ رفیوجی، بنکر شہر میں آ گئے یہ لوگ سیاسی لیڈروں کے طفیل رفیوجی نہیں بنے بلکہ یہ قدرت کے بنائے ہوئے رفیوجی ہیں جو تین تین، کپڑوں میں جانیں بچا کر شہر میں آ گئے اور انھیں اسکولوں اور کالجوں کی عمارتوں میں ٹھہرا دیا گیا۔ طلبا اور طالبات بھی چھٹیاں منانے پر مجبور کر دیئے گئے قدرت کے ستم ظریف ہاتھوں ستائے ہوئے یہ ہزار ہا رفیوجی جب تک واپس اپنے گھروں کو نہ چلے جائیں تب تک کے لئے چھٹیوں کا اعلان کر دیا گیا۔

اس موقع پر سیٹھ نمی چند نے بڑی فراخدلی کا ثبوت دیا۔ اس نے ان ہزار ہا بھوکے لوگوں کے لئے بوریاں تلوا کر ٹرکوں میں بھروا کر ان کے پاس بھجوا دیں خالی آٹا دینے سے ان لوگوں کا پیٹ کیسے بھر سکتا تھا نہ ان کے پاس کوئی برتن تھے نہ چولہا۔ نہ توا۔ وہ لوگ کھانا کیسے پکاتے سیٹھ نمی چند کے اس اقدام کا خیر مقدم سرکاری افسران وزرا اور گورنر تک نے کیا اور ادھر اخباروں میں اسکی بہت تعریف کی گئی۔ تصویریں بھی شائع ہوئیں۔

گیہوں کی نایابی کے باعث میں نے ارادہ کر لیا کہ سیٹھ نمی چند سے اچھے گیہوں کے آٹے کی ایک بوری کے لئے ضرور درخواست کروں گا۔ لیکن ساتھ کے کمرے میں میری بیوی کے پوچھنے پر کہ ایکدم سیکڑوں بوریاں آٹے کی پوریاں کیسے بنوا دی گئیں منجو نے جواب دیا۔

"بات یہ تھی آنٹی کہ مل میں رکھے ہوئے آٹے میں کیڑے پڑ گئے تھے تب پاپا نے کہا اب یہ کس کام آئے گا۔ مونگ پھلی کا تیل منگوا کر اس میں اس آٹے کی پوریاں تلوا کر دیہاتوں سے آئے ہوئے بے گھر لوگوں کے لئے بھیج دیتے ہیں اس کے بدلے میں سرکار سے اتنی گندم کا کوٹہ مل جائیگا"

یہ سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ کان ہی نہیں جسم کے رونگٹے بھی کھڑے ہو گئے۔ یہ بات بنگالی آیا بتاتی تو شاید میں نہ مانتا لیکن اب تو یہ منجو بتا رہی تھی سیٹھ نمی چند کی آٹھ سالہ لڑکی جو نہ تو کمیونسٹ ہو سکتی تھی اور نہ ہی جھوٹ بول سکتی تھی۔ میں غصہ سے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن پھر بیٹھ گیا کیونکہ سرکاری افسران اور مل مالکوں کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ٭٭

غزل

نہال رضوی

یہ بھول کر کہ عمرِ خوشی کم ہے دوستو
تم ہنس رہے ہو آنکھ مری نم ہے دوستو

یہ میکدہ ہے محفلِ دیر و حرم نہیں
یاں احترامِ جام مقدم ہے دوستو

کوئے غمِ جہاں سے گزرنے کا حوصلہ
ہم کو تو ہے تمہیں کو بہت کم ہے دوستو

کیوں قابلِ جواب سمجھتا نہیں کوئی
شاید سوالِ شوق ہی مبہم ہے دوستو

عقل و جنوں میں کب ہو تصادم خبر نہیں
امکانِ انقلاب تو ہر دم ہے دوستو

شاید حدیثِ خندۂ گل سے ہوئے خبر
ہنسنے کی فکر کیوں تمہیں پیہم ہے دوستو

میری تباہیوں میں کہیں وہ نہ ہوں شریک
میری تباہیوں کا جنھیں غم ہے دوستو

اندیشۂ سحر ہے جہاں اور نہ خوفِ شام
دار و رسن کے بعد وہ عالم ہے دوستو

جیسے خوشی کی شام ہمارے لئے نہیں
کچھ دن سے زندگی کا یہ عالم ہے دوستو

تم کچھ کہو نہال کی اب بھی یہ رائے ہے
یہ دور دورِ جراتِ پیہم ہے دوستو

روبنس

پندرھویں صدی کا عظیم مصوّر

نادر شاہ عادل

تین حسین اور کنواری دوشیزائیں ایک قدیم طرز کے مکان میں سلائی کے کام میں مصروف تھیں کہ اتنے میں ایک سنہرے بالوں والا ہنس مکھ شخص جس کے سر پر نقش ونگار سے مزین ٹوپی تھی بغیر دستک دیئے مکان میں داخل ہو کر ان دوشیزاؤں کی جانب گھور گھور کر دیکھنے لگا اور چند لمحے دیکھنے کے بعد وہ ایک لڑکی سے مخاطب ہوا "محترمہ اپنے حسین جسم سے کپڑے ہٹا دیجئے؟" وہ لڑکی ایک چیخ مار کر اٹھی اور غصہ سے اسکا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن اس کے قریب بیٹھی ہوئی دونوں دوشیزاؤں نے اسے یہ کہہ کر تسلی دی کہ وہ کوئی غنڈہ یا بدمعاش نہیں اور وہ شخص قطع کلامی کرتے ہوئے بولا "واقعی میں کوئی آوارہ یا ذلیل آدمی نہیں بلکہ میں آپ کے جسم کو کپڑوں سے اس بنا پر بے نیاز دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ آپکے حسین جسم کی ساخت کو تصور کے سانچے میں ڈھال کر اسے ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھوں۔"

یہ شخص مشہور فرانسیسی مصوّر پیٹر پال روبنس تھا جسے فرانس کی ملکہ میریڈی میرلیس کی جانب سے لکسمبرگ کے ایوان میں ۲۱ لافانی اور خوبصورت تصاویر بنانے کی پیشکش کی گئی تھی اور یہ وہی شخص تھا جس نے عورتوں کی تصاویر ایسی محنت سے تخلیق کیں کہ ٹٹیان اور ریمبیر بھی اسے عظیم مصور تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بلاشبہ اسکی تخلیقات میں زندگی کی حقیقت اور اصلیت کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے لیکن ممکن ہے کہ میں جب یہ کہہ دوں کہ روبنس عریاں عورتوں کی تصاویر تخلیق کرنے میں ید طولیٰ رکھتا تھا تو کچھ لوگ مجھے عریاں پسند کہہ دیں لیکن دنیا کے کم وبیش ہر عجائب خانے میں اسکی عریاں تصویریں آویزاں رہتی ہیں۔ جن میں عورتوں کو ننگا درخت سے ٹیک لگائے جنگل میں ناچتے، اظہار عشق کرتے ہوئے اور غسل خانہ سے نکلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ مگر ان تصاویر کو بغور دیکھنے کے بعد کوئی شخص اس کے فن کی داد دیئے بغیر خاموش نہیں رہ سکتا چونکہ باوجود عریانیت کے ہر عورت کے چہرے سے معصومیت کے گہرے نقوش ابھرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ صرف عریاں تصویر تخلیق کرتے میں ماہر تھا بلکہ جہاں تک دوسرے مناظر و موضوعات کا تعلق ہے اس نے بیشتر ایسی تصویریں بنائی ہیں جن میں خشکی کے مناظر شکار گاہیں، شکاری مناظر اور سیکڑوں بہترین شبیہ بنا کر اپنی انفرادیت کو اجاگر کیا اور یسوع مسیح کے تاریخی اور مذہبی واقعات کو جس فنکارانہ صلاحیت سے تصویری روپ دیا ہے۔ کوئی دوسرا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا یسوع مسیح کے مظالم کے مناظر کی جتنی تصویریں روبنس نے پیش



مصوّر روبنس

کی ہیں نایاب اور قیمتی ہیں اس لئے کہ اس فطری مصور نے واقعات کو جس حقیقت پسندی اور موثر انداز میں واضح کیا ہے اس کی یہ خصوصیت اسے زمانہ ماقبل کے تمام نامور مصوروں سے ممتاز کر دیتی ہے اور مختلف تکنیکی اصولوں سے کام لے کر اس نے اپنی ہر تخلیق کو فن کی معراج تک پہنچا دیا ہے۔ علاوہ بریں وہ جس خلوص محنت اور اشتیاق کے ساتھ تصویر کشی کرتا تھا۔ وہ اس کے سچے فنکار ہونے کی دلیل ہے۔ بعض لوگ اسے "استاد اعظم" کا خطاب دے چکے تھے جبکہ اس وقت اسکی عمر ۲۱ برس تھی لیکن اس نے اپنی تمام زندگی، مشاہدہ، مطالعہ اور تربیت میں صرف کر کے اپنی انکساری کا ثبوت پیش کیا۔ حتیٰ کہ ۵۰ سال تک وہ ٹٹین (TITIAN) کی تصویروں کی نقل اتار کر اس میں رنگ پر کرتا رہا لوگوں کا کہنا تھا کہ جس برق رفتاری کے ساتھ وہ تصویریں بناتا تھا کسی دوسرے مصور کے بس کی بات نہیں اور جو تصویر ایک مرتبہ مکمل کرتا اس میں ہرگز کمی بیشی اور تصحیح نہیں کرتا اور یہ اس کے فن کی پختگی کا بین ثبوت ہے۔

اس کی برق رفتاری کی مثال اسکی ایک تخلیق "ADORATION OF MAGI" ہے جسے اس نے صرف ۶ دن کے اندر اندر مکمل کر لیا۔ دوسرے مفلس و نادار مصوروں کی طرح اس نے صرف چند دشواریوں کا سامنا کیا۔ لیکن ان کے مقابلے میں روبنس تمام عمر امن و سکون کے ساتھ رہا۔ اسکی بیوی نے مرتے دم تک اس کی محبت کا دم بھرا۔ بچے بھی والد کو بحیثیت ایک نامور مصور کے عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھتے تھے جب وہ ۶۲ برس کی عمر میں راہیٔ ملک عدم ہوا تو دنیا کے گوشے گوشے سے تعزیتی پیغامات ارسال کئے گئے اور بھاری تعداد میں لوگوں نے اس کے جنازے میں شرکت کی، وہ انتہائی خوش اخلاق ملنسار اور ذہین انسان تھا اور خود سری و غرور اسکی سرشت میں نہ تھا اور نہ ہی اپنے فن کی افضلیت اور انفرادیت کے بل بوتے پر خود کو بڑا



روبنس کی مشہور تصویر" سسانا فورمنٹ"

ایک گھوڑا خرید کر اٹلی جانے کا مشورہ دیا وہاں پہنچ کر روبنس نے ایک دن کسی مشہور مصور کی تخلیق کی نقل اتارنا چاہی گرد و نواح میں کئی لوگ کھڑے تھے جب تصویر تکمیل کے مراحل طے کر چکی تو پچھلی جانب سے ایک شخص چلایا ۔ بہت خوب یہ تو اصل سے بھی کہیں بہتر ہے ۔ میں تمہیں اپنے رفیق ڈیوک ونسن زوگان زیگا آف مونٹا کے پاس لے جاؤنگا جہاں تمہاری تقدیر بدل جائے گی ۔

کچھ دنوں کے بعد روبنس اس اجنبی شخص کی بدولت کورٹ پینٹر بن گیا اور روزانہ شاہی خاندان کی فرمائش پر بے مثال تصاویر تخلیق کر کے لوگوں پر سحر کر دیتا تھا ۔ روبنس ۸ سال تک اٹلی میں مزے کی زندگی بسر کرتا رہا اور اس عرصہ میں اسے یہ خبر ملی کہ اسکی والدہ سخت علیل ہیں تو وہ فوراً اینٹورپ پہنچا لیکن اس کے آنے سے قبل ہی اسکی شفیق والدہ عدم کو کوچ کر گئی تھی ۔ اس درد انگیز واقعہ کو روبنس تمام عمر نہ بھلا سکا ۔ مگر انہی دنوں آرک ڈیوک آل برٹ اور انفینٹا اسبیلا نے جو ان دنوں نیدر لینڈ کے حکمران تھے روبنس کے فن سے متاثر ہو کر اسے شاہی دربار کا مصور ہونے کا شرف بخشا اور وہاں پر اس نے اپنی شہرۂ آفاق تخلیق " ADORATION OF MAGI " بنائی اور اس کے علاوہ ۲۸ دوسری خوبصورت تصاویر بنا کر اپنے فن کی عظمت کا سکہ جما لیا لوگوں نے اس عظیم مصور کے فن کو سراہا اور اسے کلیسا کی دیواروں کے لئے چند تصاویر بنانے کی پیش کش کی جسے اس نے بخوشی قبول کر لیا اس نے

مصور تصور کرتا بلکہ اس کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ گویا کہ وہ ایک کلرک ہے جو ابھی ابھی دفتر سے کام کر کے نکلا ہو سحر ہوتے ہی وہ بیدار ہو جاتا اور کچھ دیر تک چہل قدمی کے بعد ناشتہ کرتا اور اس کے بعد شام کے ۵ بجے تک اپنے کمرے سے باہر نہ نکلتا کھانے کے معاملے میں وہ کٹر سبزی خور تھا گوشت کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ یہ چیز فنکار کی ذات کے علاوہ اس کے فن کے لئے بھی نقصان دہ ہے مصوری کے کام سے فراغت پا لے کے بعد وہ گھوڑے پر سوار ہو کر دوستوں اور احباب کی محفل میں شریک ہوتا جہاں نصف رات تک مصوری کے متعلق بحث و تمحیص جاری رہتی روبنس ۱۵۷۷ء میں فرانس کی ایک بستی سیگن میں پیدا ہوا اس کے والد اینٹورپ کے باشندے تھے جوان دنوں بدکاری کے الزام میں قید کی سختیاں جھیل رہے تھے اور بعد میں جلاوطن کر کے خاندان سمیت نیدر لینڈ بھیج دیئے گئے اور وہاں اسے سزائے موت کا حکم سنایا گیا مگر بیوی کی فریاد پر اسکی جان بچ گئی لیکن روبنس مرتے دم تک والد کے اس قابل تذلیل اور ناروا فعل پر اس سے نفرت کا اظہار کرتا رہا اور جونہی نیدر لینڈ میں والد کا انتقال ہو گیا تو وہ اپنی والدہ کو لے کر واپس اینٹورپ چلا آیا ۔

فن مصوری سے چونکہ اسے دلی شغف تھا چنانچہ بچپن ہی سے وہ فنی تربیت حاصل کر کے بہت جلد ممتاز مصوروں کی صف میں شامل ہو گیا ۔ ۲۳ سال کی عمر میں والدہ نے اسے



ہیلنا فورمنٹ اور اس کے بچے ۔ روبنس کی شہرۂ آفاق تصویر

کلیسا کی دیوار کے لئے مشہور عالم تصویر
"DESCENT FROM THE CROSS"
بنا کر لوگوں سے داد تحسین حاصل کیا ۳۲ سال کی عمر میں اس نے ایک لڑکی اسبیلا برانٹ سے شادی کرلی جس کے بطن سے تین بچے پیدا ہوئے سترہ برس تک میاں بیوی امن وسکون کی زندگی بسر کرتے رہے لیکن ایک دن اسکی بیوی پراسرار طور پر انتقال کر گئی اور یہ مسئلہ روبنس سے بھی حل نہ ہو سکا اسی غم میں روبنس نے چند دنوں تک مصوری ترک کردی اور سفیر کے عہدہ پر فائز ہو گیا اور مدتوں اس عہدہ پر معمور رہ کر اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیتا رہا اور ایک دن اس نے ڈیوک آف بکنگھم کی ایسی بہترین شبیہ تخلیق کی کہ پوری دنیا اس کی صلاحیتوں کی معترف ہو گئی بعد میں روبنس فلپ پنجم اور چارلس اول کے دربار میں گیا جہاں اسی کی کوششوں سے اسپین اور انگلستان کی پرانی دشمنی رفع دفع ہو گئی چار سال کے بعد وہ ایک خوبصورت لڑکی میں دلچسپی لینے لگا اور کچھ دنوں کے بعد اس سے شادی کرلی بلاشبہ وہ عورتوں کی تصاویر اتارنے کا ماہر اور مشتاق تھا لیکن اس نے اپنی اس نوعمر بیوی کی صرف ۹ تصویریں، تخلیق کیں جبکہ اسکی پہلی بیوی کی کئی تصویریں وہ بنا چکا تھا۔

روبنس کے بارے میں ایک بات مشہور ہے کہ اس کی چند تصاویر ایسی ہیں جو اس کے شاگردوں نے بنائی ہیں چونکہ روبنس تصویر کے خاکے بنا کے ان کو دیتا اور وہ اس میں رنگ پر کرلیا کرتے ایسے شاگردوں میں انتھونی وین ڈائک۔ جین بروگل اور فرانس سنائی ڈرس قابل ذکر ہیں۔ جہاں تک انکی تنخواہ کا تعلق تھا روبنس نے ہر وقت دل کھول کر انکو انکی محنت کا صلہ دیا اور کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے خریداروں سے کبھی بے ایمانی نہیں کرتا تھا بلکہ وہ اپنی ہر تخلیق کو اس قیمت پر فروخت کرتا کہ خریدار بھی ہنسی، خوشی اسکی تصویر خرید لیتے۔ ایک مرتبہ برطانوی لارڈ کو خط کے ساتھ اپنی دو تازہ تخلیقات بھی روانہ کیں اور خط میں یہ وضاحت کی کہ پہلی تصویر۔
"PROMETHEUS BOUND"
میرے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی ہے صرف عقاب میرے شاگرد نے بنائے ہیں اور قیمت ۵۰۰ فلورنس ہے دوسری تصویر "LEOPARD" بھی میری اپنی بنائی ہوئی ہے صرف خشکی کے مناظر میرے دوست نے بنائے ہیں اور قیمت ۶۰۰ فلورنس ہے مگر یہ دونوں تصاویر جب خریداروں کے سامنے پیش کی گئیں تو انھوں نے یہ کہہ کر انکو لینے سے انکار کر دیا کہ یہ روبنس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی نہیں ہیں تو روبنس نے یہ جواب دیا کہ اگر میں اپنے ہاتھ سے پوری تصاویر بناتا تو قیمت بھی دگنی وصول کرتا۔

یہ تھی اس عظیم مصور کی مختصر داستان حیات وفن آپ جب کبھی اینٹورپ کے گرجے کے سامنے سے گزریں گے تو روبنس کا ایک بڑا مجسمہ آپ کو سلام دیتا ہوا نظر آئے گا۔

فائلاتن فائلات

والی آسی

میں "کلرکی پیشہ ہوں" لوور ڈویژن ذات پات
ایم اے ہے کوالیفکیشن اور ہوں عالی صفات
جی۔ او کے چکر سے ہرگز پا نہیں سکتا نجات
فکرِ ڈی اے اور ٹی۔ اے ہے مری کل کائنات
خواب میں بھی بارہا بکتا رہا ہوں ساری رات
فائلاتن، فائلاتن، فائلاتن، فائلات

صبح کا ہونا مجھے اک وار ہے شمشیر کا
شام ہونا میرے حق میں ظلم ہے تقدیر کا
سامنا دفتر میں دن بھر افسرِ بے پیر کا
دس بجے کو پانچ تک "لانا ہی جوئے شیر کا"
مار جو تم مار ڈنڈم مار گھونسم مار لات
فائلاتن فائلاتن فائلاتن فائلات

آسی ہونے کو میں کہہ دوں تو فرمائیں گے کیا؟
آرسی ہونے تلک پیچھے نہ بڑھ جائیں گے کیا؟
ذکرِ کوارٹر میں کروں! پوچھیں گے! بنوائیں گے کیا؟
میں نے یہ مانا کہ "کوارٹر" میں رہیں کھائیں گے کیا؟
ہیں یہ رگڑے اور جھگڑے سارا دن اور ساری رات
فائلاتن فائلاتن فائلاتن فائلات

مجھ پہ اک چشم کرم از روئے افسر ہو گئی
میں یہ سمجھا مجھ سے کوئی بات بہتر ہو گئی
لیکن اک چشم کرم خنجر سے بڑھ کر ہو گئی
یعنی سنڈے کی بھی چھٹی نذرِ دفتر ہو گئی
پھر وہی میں ہوں وہی انبارِ پینڈنگ کاغذات
فائلاتن فائلاتن فائلاتن فائلات

عشوہ وناز وادائے "افسرانا" یاد ہے
"عینکی نظروں" سے خنجر کا چلانا یاد ہے
ایک طرزِ خاص سے پھر مسکرانا یاد ہے
اپنا جانا یاد ہے ان کا بلانا یاد ہے
"پی۔ یو سی" دیکھ کر "ڈی۔ ایف اے" دو "ایف سی" کے سات
فائلاتن فائلاتن۔ فائلاتن فائلات

رات گزری نور کا تڑکا "ہوا اے بابو! آ!
رات بھر سوتے رہے جلدی سے بستر سے اٹھو
روکھی سوکھی ہاتھ منہ دھو کر چلو کھا کے پیو
پھر اٹھا کر سائیکل کو جانبِ دفتر چلو
اور وظیفہ یہ پڑھو اس کے علاوہ واہیات
فائلاتن فائلاتن فائلاتن فائلات

خبرنامہ

پی آئی اے یونین کے مطالبات منظور ہو گئے

مزدوروں کو گذشتہ سالوں سے زیادہ بونس دیا گیا

مطالبات کی جد و جہد میں یونین کی شاندار تاریخی کامیابی

ایئر ویز ایمپلائیز یونین، پی۔ آئی۔ اے برانچ کیجانب سے گزشتہ سال دسمبر میں جنرل باڈی کی منظوری کے بعد مطالبات کا چارٹر انتظامیہ کو پیش کیا گیا تھا۔ ان مطالبات میں "بونس" کی بروقت اور معقول ادائے گی، کرایہ مکان کی منظوری، تنخواہوں پر نظر ثانی، مہنگائی الاؤنس کی بنیادی تنخواہ میں شمولیت، عملے کے لئے مکانات کی تعمیر تین ہٹی پر پی۔ آئی۔ اے ڈسپنسری کا قیام، شفٹ الاؤنس میں اضافہ اور دوسرے اہم مطالبات شامل تھے

ان مطالبات پر غور کرنے کے بعد جنوری ۱۹۶۴ء میں ایڈمنسٹریٹیو مینیجر نے جو اس وقت انتظامیہ کے سربراہ تھے۔ یونین کو ایک خط لکھا جس میں بڑا ہی غیر معقول اور نامناسب رویہ اختیار کرتے ہوئے تمام اہم مطالبات کو کسی نہ کسی بہانے سے ناقابل قبول قرار دیا گیا تھا۔ یہ صورت حال یونین کے لئے بے حد تشویشناک تھی کیونکہ انتظامیہ کی طرف سے اس درجہ غیر معقول طرز عمل کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ فوراً ہی دو گھنٹے کے مختصر نوٹس پر یونین کی مجلس عاملہ کا ایک ہنگامی جلسہ طلب کیا گیا جس میں یونین کے رہنماؤں نے عاملہ کے اراکین کے سامنے پوری صورت حال کا جائزہ پیش کیا مجلس عاملہ نے فیصلہ کیا کہ انتظامیہ کے موجودہ غیر مصالحانہ رویئے کو دیکھتے ہوئے ہڑتال کا نوٹس دے دیا جائے۔ جلسہ ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ مینیجنگ ڈائرکٹر نور خاں صاحب نے یونین کے نمائندوں کو بات چیت کے لئے بلا لیا اور اس گفتگو کے نتیجے میں ایک ناخوشگوار صورت حال پیدا ہونے سے بال بال بچ گئی۔ مزدوروں کو دوسری شکل میں بونس ادا کیا گیا اور دوسرے مطالبات پر ہمدردانہ غور کا وعدہ کیا گیا۔

یہ وعدہ ایک بار پھر انتظامیہ کی لیت و لعل کی پالیسی کا شکار ہو گیا۔ یونین کی جانب سے متواتر یاد دہانیوں کے باوجود مطالبات کو فیصلہ کن شکل نہ دی گئی۔ آخر کار اگست میں آپریشنز ڈائرکٹر صاحب نے مطالبات کا مالی جائزہ لینے کے بعد یونین کے نمائندوں سے گفتگو کی اور کرایہ مکان کے لئے ایک شرح مان لی۔ یہ شرح افسروں کو پیش کی گئی شرح سے کم تھی لہٰذا یونین نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور بات ٹوٹ گئی۔

اس کے بعد نئے ایڈمنسٹریٹیو ڈائرکٹر مسٹر پراچہ سے گفتگو ہوئی۔ ابتدا میں یہ بات چیت بڑی حوصلہ افزا رہی مگر آخر میں پراچہ صاحب نے بتایا کہ اوڈی اور ایم ڈی کے پاس اختیارات نہیں ہیں لہٰذا مطالبات بورڈ آف ڈائرکٹرز کے سامنے رکھے جائیں گے۔ اس مرحلے پر یونین کے عہدے داروں نے اندازہ لگایا کہ انتظامیہ مطالبات کو ٹال مٹول کی نذر کرنے کی خواہشمند ہے اور معقولیت کے ساتھ کسی فیصلے پر پہنچنے کے لئے تیار نہیں ہے چنانچہ ۱۶ر نومبر ۱۹۶۴ء کے تاریخی دن یونین نے پی۔ آئی۔ اے کے تمام مزدوروں کا ایک جلسہ عام طلب کیا اس جلسے میں انتہائی جوش و خروش کے ساتھ ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں مطالبات تسلیم کرنے کا آخری بار مطالبہ کیا گیا تھا۔ اور انتظامیہ کو متنبہ کیا گیا تھا کہ اگر پندرہ دن کے اندر اندر تمام مطالبات نہ منظور کئے گئے تو یونین کی مجلس عاملہ مزدوروں کی خواہش کے مطابق آخری قدم اٹھائے گی اور صورت حال کے خراب ہونے کی پوری پوری ذمہ داری انتظامیہ پر ہوگی۔ اس جلسے میں یونین کے سکریٹری صغیر احمد، نائب صدر محمد عالم اور صدر الطاف حسین کے علاوہ یونین کے بانی و رہنما طفیل عباس نے بھی تقریر کی۔

جلسۂ عام اور قرارداد کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ انتظامیہ نے دیکھ لیا کہ مزدور پوری طرح متحد ہیں اور ہر قیمت پر اپنے مطالبات منوانے کے لئے تلے بیٹھے ہیں، اگر دانشمندی سے کام نہ لیا گیا تو صنعتی امن قائم نہ رہیگا چنانچہ ۲ر دسمبر ۱۹۶۴ء کو یونین اور انتظامیہ کے نمائندوں نے مل کر بہت سے مطالبات کا تصفیہ کیا اس سال چونکہ پی۔ آئی۔ اے کو منافع گزشتہ سالوں سے زیادہ ہوا تھا۔ اس لئے یونین اس دفعہ ہمیشہ سے زیادہ بونس حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ مختلف گریڈ کے ملازموں کو ۱۷۵ر روپیے سے لیکر ۶۵۰ر روپیے تک بونس ملا۔ اس کی ادائے گی بھی ۸ ار دسمبر تک کر دی گئی۔ شفٹ الاؤنس اور زونل الاؤنس میں اضافے کا مطالبہ یونین کی خواہش کے مطابق تسلیم کر لیا گیا۔ ہاؤسنگ اسکیم پر عمل کرنے کا فیصلہ ہوا۔ ۵ سرکاری چھٹیوں پر ڈبل ریٹ اوور ٹائم منظور ہوا۔ اس کے بعد مزید گفت و شنید جاری رہی جسکے نتیجے میں ۱۰ ار دسمبر سے تین ہٹی کے پاس ڈسپنسری کا قیام عمل میں آیا۔ کرایہ مکان کا کئی سال پرانا مطالبہ بالآخر تسلیم کر لیا گیا۔ یہ طے ہوا کہ عملے کو کم از کم بارہ روپیئے ماہوار سے لے کر گروپ کے لحاظ سے پندرہ روپیئے، بیس روپیئے، تیس روپیئے پینتالیس روپیئے ماہوار تک کرایہ مکان ادا کیا جائے گا۔ اور اسکا نفاذ دسمبر ۱۹۶۴ء سے ہوگا۔

اعداد و شمار کے مطابق بونس کے مطالبے پر قریباً ۲۰ر لاکھ روپیہ، کرایہ مکان پر ۱۸۔ لاکھ، شفٹ الاؤنس کے اضافے پر تین لاکھ، زونل الاؤنس کی بڑھی ہوئی شرح پر ڈھائی لاکھ۔ ریگریڈنگ (Regera ding) پر چھ لاکھ اور مکانات کی تعمیر پر تقریباً ۳۵ لاکھ روپیہ صرف کیا جائے گا۔

سال رواں میں پی۔ آئی۔ اے یونین کی یہ شاندار کامیابی مزدور تحریک کا ایک سنہرا ورق ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اگر انتظامیہ کے نمائندے معقولیت پسندی اور دانشمندی سے کام لیں تو ہر صنعتی ادارے میں مزدور مسائل پر امن اور خوشگوار ماحول میں طے ہو سکتے ہیں، باہمی گفت و شنید کے ذریعے فیصلہ کن نتائج تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ملکی صنعت بغیر کسی بحران کے ترقی کی راہ پر گامزن رہ سکتی ہے۔ مگر یہ صرف اور صرف اسی وقت ممکن ہے کہ انتظامیہ کے نمائندے مزدور مسائل پر ہمدردی اور حقیقت پسندی سے غور کریں مزدور مسائل کو مزدوروں کے ہی مسائل نہ سمجھ لیں بلکہ پوری صنعت کا مسئلہ سمجھیں۔ اسے اپنے جھوٹے وقار کا سوال نہ بنائیں بلکہ یہ سمجھ لیں کہ انکا وقار مسئلے کا مناسب حل تلاش کر لینے سے اور بلند ہو جاتا ہے۔ ہار جیت کا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ناعاقبت اندیش انتظامیہ مزدوروں سے ٹکراتی ہے۔ پی۔ آئی۔ اے یونین شاندار تاریخ کی حامل ہے

ٹیکس، خام فلموں کی درآمد پر ٹیکس غرضیکہ کافی کچھ دینا پڑتا ہے اور اس کا براہ راست اثر عوام پر پڑتا ہے اور انہیں اس واحد تفریح کیلئے کافی پیسے ادا کرنے پڑتے ہیں۔ کافی سرمایہ ٹیکسوں میں ادا کرنے کے بعد فلمساز اپنے فنکاروں اور ٹیکنیشنوں کو کیا دے سکتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ روزگار کی طرف سے پریشان رہتے ہیں اور یکسوئی سے اپنے فن کا مظاہرہ نہیں کر سکتے ہیں۔

حکومت کو اس طرف فوراً توجہ کرنی چاہیئے کیونکہ یہ صرف فلم کا ہی مسئلہ نہیں بلکہ اس صنعت سے متعلق تقریباً ۵۰ ہزار افراد کی روزی کا سوال ہے۔

اچھی مشنری کے کمیاب ہونے کا اثر فلم کی پروڈکشن ویلیو پر پڑتا ہے جس کے نتیجے میں ہم اچھی کوالٹی نہیں دے سکتے۔ کچھ روز سے فلمسازوں نے عوام کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے گھٹیا رقص و نغموں اور عریانی کا سہارا لیا ہے جس کی مثال لچر اور لغو پنجابی فلموں کی بے پناہ مقبولیت ہے میں جس دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ سوہنی، ہیر، اور وارث شاہ کا پنجاب اتنا بے شرم نہیں ہو سکتا جتنا ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ پنجاب کی سرزمین راوی اور چناب کے سنہرے پانی کی طرح مقدس ہے نہ معلوم سنسر بورڈ اس حقیقت کو نظر انداز کیوں کر دیتا ہے۔ سنسر بورڈ کو یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی چاہیئے کہ فلم ذہنوں کو متاثر کرنے کا واحد اور سب سے سستا ذریعہ ہے۔ پھر ان لغو حرکات، نیم عریاں رقص اور چوری چھپے کی ملاقاتوں کا کچے ذہنوں پر کیا اثر پڑے گا۔

فلم کو نمائش کیلئے اجازت دینا یا اسے ممنوع قرار دینا بھی غالباً سنسر بورڈ پر منحصر ہے۔ کبھی تو اچھی کہانیوں کی کاٹ چھانٹ کر دی جاتی ہے اور کبھی عریاں فلموں کو نمائش کا مستحق قرار دیدیا جاتا ہے۔ اگر کبھی غیر ملکی عریاں فلموں پر اعتراض کیا جائے کہ صاحب اسکو نمائش کیلئے کیونکر قرار دیدیا گیا تو جواب دیا جاتا ہے کہ ان کا کلچر ہے۔ چلئے مان لیا یہ ان کا کلچر ہے اس ملک میں جو افراد اس کو دیکھ رہے ہیں ان کا کلچر تو یہ نہیں کہ سرعام "بوس و کنار" کیا جائے۔ اگر ایسا ہی ہے تو اپنی فلموں کو بھی اس قسم کی اجازت ہونی چاہیئے تاکہ ملکی فلموں کی کھپت بڑھ جائے اور فلمسازوں کا فائدہ ہو جب کبھی کسی انگریزی فلم میں کوئی اس قسم کا منظر دکھایا جاتا ہے تو ہال کے مختلف گوشوں سے سیٹیوں اور نعروں کی آواز آتی ہے۔ یہ سیٹیاں اور نعرے اس تاثر کی دلیل ہیں جو دیکھنے والوں نے اس منظر سے قبول کیا۔ سنسر بورڈ کو سختی کے ساتھ اس طرف قدم اٹھانے چاہیئے۔ جو یہ فلموں کیلئے بھی سنسر بورڈ کو سختی برتنی چاہیئے پچھلے دنوں ذرا سختی کی گئی تھی تو رجحان ذرا کم ہو گیا تھا لیکن ابھی تک ان کے ذہن پاک نہیں ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ ملکی وقار کو ٹھیس پہنچاتے ہیں اس کی اجازت ہرگز نہیں ہونی چاہیئے۔

حکومت کی سرپرستی اس صنعت کے استحکام کیلئے ضروری ہے۔ مشنری کے لئے زیادہ سے زیادہ لائسنس اور زرمبادلہ کی سہولت بہم پہنچائی جائیں۔ اوسطاً مشرقی پاکستان نے گذشتہ ایک سال میں بے پناہ ترقی کی ہے حالانکہ وہاں صرف ایک نگارخانہ ہے۔ تاہم اس میں تقریباً چالیس فلمیں زیر تکمیل ہیں جنمیں تین سینما اسکوپ اور رنگین بھی ہیں۔

پہلی کی پہلی رنگین فلم پیش کرنے کا سہرا بھی انہیں کے سر ہے اور غالباً پہلی مرتبہ سینما اسکوپ فلم پیش کرنے کی سعادت بھی انہیں کو نصیب ہوگی وجہ کیا ہے ۔۔۔؟" مشرقی پاکستان کی صوبائی حکومت نے حوصلہ افزائی کی ہے ڈھاکہ کا ایف ڈی سی اسٹوڈیو حکومت کی زیر سرپرستی چلتا ہے وہاں اچھی مشنری اور دیگر ضروری سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ اب تو مشرقی پاکستان کے بیشتر فلمساز اپنی فلموں کی فلمبندی نیپال، برما، اور سیلون وغیرہ میں کرتے ہیں ظاہر ہے نئی چیز نئے مناظر عوام میں مقبول ہوں گے۔ اگر مغربی پاکستان کی صوبائی اور مرکزی حکومت بھی اس قسم کی سرپرستی کرے تو یہاں بھی رنگین اور سینما اسکوپ فلمیں بن سکتی ہیں۔

ایک اور بات ۔۔۔! ہم نے ابھی تک بیرونی ممالک میں اپنی فلموں کیلئے مارکیٹ تلاش نہیں کی اگر ہم معیاری اور تفریحی فلمیں پیش کریں تو مشرقی وسطیٰ میں کافی کھپت ہو سکتی ہے۔ اچھی موسیقی معیاری کہانی سنجیدہ مزاح بہت آسانی سے بیرونی ممالک کے ذہنوں میں اپنے لئے جگہ بنا سکتا ہے۔ ہر ملک کے لوگ دوسرے ممالک کا کلچر اور وہاں کے لوگوں کی زندگی کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں جس طرح ہم دوسرے ممالک کی فلمیں دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں تو کیا دوسرے ممالک ہماری فلمیں دیکھ کر متاثر نہیں ہوں گے شرط یہ ہے کہ کہانیوں کا انتخاب ایسا کیا جائے جس میں بین الاقوامی ہمہ گیری ہو۔ بیرونی ممالک میں اپنی فلموں کے لئے جگہ پیدا کر کے نہ صرف اپنی فلموں کا معیار بلند کریں گے بلکہ کافی مقدار زرمبادلہ کمانے میں بھی معاون ثابت ہوں گے ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ حکومت کی سرپرستی ۔۔۔ اور ۔۔۔ سنسر بورڈ کی پالیسی میں خاطر خواہ تبدیلی بہت ضروری ہے۔



ھدایت کار عابدی

متحرک فلموں کی تاریخ

متحرک فلم جو متعدد ملکوں میں مقبول ترین فن کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ اسکی تخلیق اور ترقی میں متعدد ملکوں نے حصہ لیا ہے ۔ دنیا کے بیشمار آدمیوں کے نزدیک فلمیں تفریح آرام وسکون ۔ تعلیم ۔ مفاہمت اور وسیع النظری کا ذریعہ ہیں فلموں کو بسا اوقات بیسویں صدی کا آرٹ قرار دیا جاتا ہے ۔ ایک متحرک فلم دراصل کئی حیثیتیں رکھتی ہے ۔ وہ قوت ایجاد اور صنعتی وفنی ترقی کی پیداوار ہے ۔ وہ ایک عوامی آرٹ ہے جو اپنے تماشبینوں سے رہنمائی حاصل کرتا ہے ۔

وہ ایک اجتماعی آرٹ ہے ۔ جسکے لئے متعدد اشخاص کی مہارت صلاحیت اور کوشش کی ضرورت ہوتی ہے ۔ وہ ایک بہت بڑی صنعت ہے جو تمام دنیا میں سب سے بڑی صنعت ہے ۔ پاکستان نے بھی اسکی ترقی میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے (" اے بسا آرزو کہ خاک شدہ") آجکل پاکستانی فلمیں اگر یہاں کے صنعت کار چاہیں تو دنیا بھر میں دیکھی جاسکتی ہیں ۔ اور ایسا بڑا ذریعہ بن سکتی ہیں جسکی مدد سے دوسرے ملکوں کے باشندے پاکستان کی زندگی اور رسم ورواج کے بارے میں اپنے نظریات قائم کرسکتے ہیں ۔ پاکستانی باشندوں کے لئے انکی اپنی اور دیگر ملکوں کی فلمیں اتحاد پیدا کرنے کی بڑی طاقتور ثقافتی اور تعلیمی قوت نیز ایک مقبول تفریح کی حیثیت رکھتی ہیں ۔

زیر نظر مضمون میں متحرک فلموں کی تاریخ کا ایک خاکہ پیش کیا جارہا ہے ۔ اور اسکی جدید حیثیت اور اثرات کا کچھ حال بھی بیان کیا گیا ہے ۔

متحرک فلموں کی ابتدا ایک اہم واقع اور تجربہ کی رہین منت ہے ۔ یہ واقعہ ۱۸۲۴ء کا ہے ایک رات انگلستان کی رائل سوسائٹی کے ممتاز ارکان "پیٹر مارک راجٹ" کا ایک مقالہ سننے کے لئے جمع ہوئے تھے جسکا عنوان یہ تھا ۔ "متحرک چیزوں کے سلسلہ میں نگاہ کا خصوصی فعل" پیٹر مارک راجٹ" ایک ڈاکٹر تھے اور انھوں نے ہم معنیٰ الفاظ کی لغت تیار کرکے بڑی شہرت حاصل کی تھی ۔ اس مقالے میں ان کا نظریہ بیان کیا گیا تھا کہ کوئی شکل واقعتاً جتنی دیر تک سامنے رہتی ہے اس سے ایک لمحہ زیادہ دیر تک انسانی آنکھ اسے دیکھتی رہتی ہے اس مقالے نے ہلچل سی مچادی اور میکائیل فریڈے ۔ جیسے سائنسدانوں نے اس نظریہ کے لئے آزمائشی تجربے کئے لیکن "راجٹ" اوران کے ساتھی یہ نہ جان سکے کہ اسکی وجہ سے ایک نئے فن کی داغ بیل پڑ گئی ہے اور اس سے آجکل کی متحرک فلموں کی دنیا وجود میں آئے گی ۔

اس نظریہ کے تحت وجود میں آنے والی پہلی قابل ذکر چیز ایک کھلونے کی شکل کی تھی ۔ کھلونا "زندگی کا پہیہ" تھا جسے بلجیم کے "جوزف پلیٹو" اور آسٹریا کے "سائمن فان" نے ایجاد کیا تھا ۔ یہ کھلونا مختلف شکلوں میں بنایا گیا تھا لیکن وہ سب ایک ہی اصول پر کام کرتے تھے ۔ کسی ایک عمل کے مختلف مرحلوں کی اشکال سلسلہ وار کسی گول چیز یا ڈھول پر چپکا دی جاتی تھی اور جب اسے گھمایا جاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اشکال حرکت کر رہی ہیں ۔ یہ کھلونا متحرک فلموں کا بانی ثابت ہوا ۔ اس قسم کے کھلونوں میں غالباً سب سے زیادہ مشہور کھلونا تھا جسے غالباً "زوٹروپ" کہا جاتا تھا ۔ یہ کھلونا ساری دنیا میں پہنچ گیا تھا ۔ جن میں فلاڈلفیا کے ایک انجینئر کیلیں سیلرز کا گھر بھی شامل تھا اس کھلونے کی وجہ سے ان کا تجسس کا جذبہ بیدار ہوگیا اور انھوں نے اپنے بچوں کے حرکت کرتے ہوئے مختلف مرحلوں کی سلسلہ وار تصویریں لے کر انھیں ایک چرخی پر لگادیا ۔ جب اس چرخی کو گھمایا گیا تو ان کے سامنے "متحرک تصویریں" تھیں اس آلے کو انھوں نے ۱۸۶۱ء میں کینماٹو اسکوپ کے نام سے پیٹنٹ کرالیا تھا ۔

اس کے کوئی دس سال سے بھی زیادہ عرصہ کے بعد ایک گھوڑے کی چال کے بارے میں اختلاف رائے کی وجہ سے اس سلسلہ میں غیر ارادی طور پر اگلی اہم ترقی ہوئی ۔ یہ پتہ لگانے کے لئے کہ آیا گھوڑ دوڑ کے گھوڑے کے چاروں پیر کبھی بھی ایک ہی وقت میں زمین سے اوپر اٹھے ہوتے ہیں ۔ کیلیفورنیا کے ایک ضعکار لیلینڈ اسٹیفرڈ نے ایک دوڑتے ہوئے گھوڑے کی تصویریں لینے کے لئے گھوڑدوڑ کے میدان کے کنارے ۲۴ کیمرے لگوادیئے ۔ "ایڈویرڈ موئی برج" نے یہ تصویریں لیں ۔ ان تصاویر سے یہ ظاہر ہوگیا کہ بعض اوقات گھوڑے کے چاروں پیر ایک ساتھ زمین سے اوپر اٹھ جاتے ہیں "لیلینڈ اسٹیفرڈ نے پیرس کا دورہ کرتے ہوئے "جین لوئی مائیونیر" نامی فنکار سے ان متحرک تصویروں کا تذکرہ کیا جو "موئی برج" نے کھینچی تھیں اسوقت فرانسیسی اکیڈمی کے ارکان اسکی بنائی ہوئی تصویروں میں گھوڑوں کے چلنے کے انداز پر سخت نکتہ چینی کررہے تھے اس نے آئینوں سے آراستہ "زندگی کے پہیئے" کی مدد سے جسے پریکیناسکوپ" کہتے ہیں بڑی تفصیل کے ساتھ "موئی برج" کی تصویریں دکھا کر اپنے آپ کو الزامات سے بری ثابت کردیا ۔

"موئی برج" کی تصاویر انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ حرکت کرنے والی چیزوں کی لی جانے والی پہلی تصویریں تھیں ۔ لیکن ان تصاویر کے لینے میں جس قسم کے کیمرے استعمال کئے گئے تھے انکی وجہ سے متحرک چیز ایسی معلوم ہوتی تھی گویا وہ ایک جگہ رکی ہوئی ہے اور پس منظر بدلتا جارہا ہے اس مسئلہ کو جلد ہی حل کرلیا گیا تاہم موجدوں کو ایسے کیمرے بنانے کی کوششوں میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی جو زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ تصویریں لے سکیں ۔ بہرصورت متحرک چیزوں کی تصاویر سب سے پہلے "موئی برج" نے لیں ۔ یہی متحرک فلم کی بالکل ابتدائی کڑی ہے ۔

(باقی آئندہ)

خبرنامہ

اس صنعت کے باہمت محنت کش کتنی ہی بار ایسی شاندار کامیابیوں سے ہمکنار ہو چکے ہیں اور آئندہ بھی اپنے اتحاد کے ذریعے ایسی ہی کامیابیاں حاصل کرتے رہیں گے۔

جوٹ ملوں کے مالکوں کو ہتھیار ڈالنے پڑے

ڈھاکہ (نمائندہ منشور) مشرقی پاکستان کی جوٹ ملوں کے مزدوروں نے ۵۳ دن تک مسلسل ہڑتال کر کے مالکان کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ ان کے مطالبات تسلیم کر لیں۔ ہڑتال کے دوران ملکوں نے ہڑتال کو توڑنے کا حربہ استعمال کیا یہاں تک کہ غنڈوں کے ذریعہ پرامن ہڑتالی مزدوروں پر حملہ بھی کروایا جس کے نتیجے میں مزدور تحریک اپنے کئی جیالے ساتھیوں سے محروم ہو گئی۔ لیکن مزدور نہ تو دباؤ میں آئے اور نہ ہی انہوں نے عزم، استقلال اور تنظیم کو کمزور ہونے دیا۔ بالآخر مالکوں اور حکومت کو ہار ماننی پڑی اور مزدوروں کے مطالبات تسلیم کر لیے گئے۔ اس معاہدے میں سب سے اہم مطالبہ کم از کم اجرت کا تعین بھی شامل ہے۔ اب مزدوروں کی کم از کم اجرت ۸ روپے ۱۹ پیسے فی ہفتہ مقرر ہوئی ہے جس میں ساڑھے سات روپے مہنگائی الاؤنس بھی شامل ہے اس طرح اصل اجرت تقریباً پچاس روپے ماہوار ہوتی ہے جو کہ موجودہ اور روز بروز بڑھتی ہوئی گرانی کے پیش نظر بہت کم ہے۔ لیکن مزدور اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ ان کے مطالبات چاہے کتنے ہی جائز ہوں سرمایہ دار کبھی بھی سب کے سب تسلیم نہیں کرتے بلکہ ان کی کوشش ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ محنت کرنے والے کو کم سے کم دیا جائے۔ گو کہ مزدور اس معاہدے سے پوری طرح مطمئن نہیں ہیں پھر بھی وہ اپنی اس شاندار فتح کا جشن منانے میں حق بجانب ہیں۔

آدم جی کاٹن ملز کے مزدوروں نے ہڑتال کا نوٹس دے دیا

لانڈھی (نمائندہ منشور) آدم جی کاٹن ملز کے مزدوروں کے ۱۳ ر دسمبر کے فیصلے کے مطابق مزدوروں کے پانچ نمائندوں نے منتظمین ملز کو ہڑتال کا نوٹس دے دیا ہے۔ ہڑتال نوٹس میں تنخواہ میں اضافہ، برطرف شدہ مزدوروں کی واپسی" بدلی" مزدوروں کو مستقل کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ آدم جی کاٹن ملز کے مزدوروں نے اس سے قبل بھی اپنے مطالبات پر ایک ہڑتال نوٹس دیا تھا۔

غنی ٹیکسٹائل ملز کے مزدوروں کے ساتھ مالکان کا غیر انسانی رویہ

کراچی۔ (نمائندہ منشور) غنی ٹکسٹائل ملز ایک چھوٹا سال ہے جو سندھ انڈسٹریل ایریا میں واقع ہے اور اسے قائم ہوئے تقریباً ایک سال ہوا ہے۔ مالکان کی ہوس نفع اندوزی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس مل میں مزدوروں کو ہفتہ وار چھٹی نہیں دی جاتی۔ فیکٹری ایکٹ کے تحت ہفتہ وار چھٹی لازمی ہے۔ اگر مالکان فیکٹری انسپکٹر سے اجازت حاصل کر لیں تو وہ اتوار کو بھی کام کروا سکتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہوتی ہے کہ ہر مزدور لازماً ہفتے میں ایک دن چھٹی کر سکے چاہے وہ کوئی دن ہو۔ اس قانون کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس مل کی انتظامیہ مزدوروں کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ ہفتے کے ساتوں دن کام کریں۔ اگر اسکے نتیجے میں کوئی مزدور بیمار ہو جائے یا کسی اور معقول وجہ سے ایک آدھ دن کام پر نہ آسکے تو اسے ذلیل کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات جرمانہ بھی ہوتا ہے ورنہ عام طور پر اسے چھ یا آٹھ دن کے لیے معطل کر دیا جاتا ہے اور اسکی جگہ نیا مزدور بھرتی کر لیا جاتا ہے۔ مروجہ قوانین کے تحت کسی بھی مزدور کو چار روز سے زیادہ کے لیے معطل نہیں کیا جا سکتا۔

اور ملک کی فیکٹریوں اور ملوں کی طرح یہاں بھی بارہ گھنٹے کی شفٹ چلائی جا رہی ہے جس سے مزدوروں کی صحت پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ ایک اور نمایاں خصوصیت اس مل کی یہ ہے کہ یہاں مزدوروں کو سالانہ اتفاقی۔ یا بیماری کی کوئی چھٹی نہیں دی جاتی اور سرکاری چھٹیوں میں یا تو مل بند ہی نہیں کیا جاتا۔ اگر کبھی بند بھی کیا جاتا ہے تو اس دن کی تنخواہ کاٹ لی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اوور ٹائم یا بونس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ مل نے ایک سال کے اندر اندر غیر معمولی ترقی کی ہے۔ یعنی لوموں کی تعداد بیس سے بڑھ کر چالیس ہو گئی۔ مالکان نے ایک احتیاط یہ بھی برتی ہے کہ چھانٹ کر ایسے مزدوروں کو ملازم رکھا ہے جو ٹریڈ یونین سرگرمیوں کی بنا پر دوسرے ملوں سے نکالے جا چکے ہیں۔ اور کوئی بھی پرانا مل انھیں ملازم رکھنے پر تیار نہیں ہے۔ یہاں کے مزدوروں نے نمائندہ منشور کو بتلایا کہ بیکاری کے زمانے میں وہ کافی مقروض ہو چکے ہیں اور ان میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ مزید بے کاری کا خطرہ مول لیں اور اپنے بال بچوں کو فاقوں کا شکار بنائیں۔ ان کی اس مجبوری سے مالکان پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ چونکہ محکمہ محنت کے فیکٹری انسپکشن ڈپارٹمنٹ کو مل کی طرف سے باقاعدہ ماہانہ مشاہرہ ملتا ہے۔ اس لیے فیکٹری انسپکٹر کو درخواست دینا اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونے کے برابر ہے۔ انہوں نے اس اندیشے کا بھی اظہار کیا کہ ان حقائق کے منشور میں شائع ہونے کے بعد ممکن ہے کہ ان پر شبہ کیا جائے اور انھیں ایک بار پھر بے کاری اور فاقہ کشی کا مقابلہ کرنا پڑے۔

شفیق میٹل انڈسٹریز کی انتظامیہ کا مزدور دشمن رویہ ناقابلِ برداشت ہے

مالکان یونین کے سرگرم کارکنوں کو پریشان اور خوفزدہ کر رہے ہیں

کراچی۔ (نمائندہ منشور) شفیق میٹل انڈسٹریز ورکرز یونین کے نائب صدر محمد حسن نے نمائندہ منشور کو ایک ملاقات میں بتایا کہ جب سے مزدوروں نے مالکوں کو ہڑتال کا نوٹس دیا ہے اور اپنی یونین بنائی ہے مالکان مزدوروں کو دبانے اور پریشان کرنے کے تمام حربے اختیار کئے ہوئے ہیں پہلے تو مالکان نے ہڑتال نوٹس پر دستخط کرنے والے پانچ نمائندوں کو دھوکہ دے کر ایک معاہدے پر دستخط لینے اور صنعتی عدالت سے مقدمہ واپس کروا دینے کی کوشش کی۔ جب اس میں انھیں کامیابی نہ ہوئی تو چمچوں کے ذریعہ ایک سرگرم کارکن محمد طفیل کی اتنی پٹائی کروائی کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ یہ حادثہ مل کے اندر اوقات کار کے دوران پیش آیا۔ مالکان نے اس وقت مزدوروں کی خوشامد کی اور معاملے کو پولیس تک لے جانے سے روکا۔ لیکن چند ہی دن بعد انھوں نے دوبارہ یونین کے سرگرم کارکنوں پر اپنے خریدے ہوئے ایجنٹوں کے ذریعے حملہ کروایا اور پھر ان کارکنوں کو چارج شیٹ دے کر معطل کر دیا۔ جب مزدوروں نے اس پر احتجاج کیا تو آدھے سے زائد مزدوروں کو غیر قانونی طریقے پر بغیر کسی

خبرنامہ



مسلم کمرشیل بنک اسٹاف یونین کے جشن میں شریک ہونے والے معزز مہمانان

نوٹس کے ملازمت سے علیحدہ کردیا۔ جس پر دفعہ ۲۰ کے تحت صنعتی عدالت میں مقدمہ دائر کیا گیا جس پر عدالت نے تمام ملازمین کی بحالی کے احکام جاری کر دیئے اور معطل شدہ مزدوروں کے لئے یہ فیصلہ کیا کہ جب تک انکوائری مکمل نہ ہو جائے انھیں باقاعدہ تنخواہ ملتی رہے گی۔ لیکن مالکان نے عدالتی حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ان تمام مزدوروں کو ان کی معطلی کے دن سے ملازمت سے علیحدہ کردیا۔ نہ تو انکوائری کی گئی نہ ہی گواہی لی گئی۔ اس طرح مالکان تمام قوانین کو پس پشت ڈال کر مزدوروں کو خوفزدہ کر رہے ہیں تاکہ وہ اپنے مطالبات سے دست بردار ہو جائیں۔

انھوں نے خاص طور پر اس بات کی شکایت کی کہ محکمہ محنت مزدوروں سے تعاون کرنے کی بجائے ان کی راہ میں مزید مشکلات پیدا کر رہا ہے۔ اسکی نمایاں مثال یہ ہے کہ شفیق میٹل انڈسٹریز کے مزدوروں کی طرف سے ۳۰ راگست ۱۹۶۴ء کو یونین کے رجسٹریشن کے لئے درخواست داخل کی گئی تھی لیکن ابھی تک رجسٹریشن ملنا تو دور کی بات ہے۔ ابتدائی کارروائی بھی عمل میں نہیں لائی گئی ہے۔

جناب محمد حسن نے نمائندہ منشور کو بتایا کہ ایسی صورت میں اگر مزدور ہڑتال کر دیتے ہیں تو اس ہڑتال کو غیر قانونی قرار دے دیا جاتا ہے اور مزدوروں کو مل مالکان کی شہ پر دفعہ ۱۰۷-۱۱۷ کے تحت گرفتار کر کے مقدمات کے چکر میں پھنسا دیا جاتا ہے۔ اور یہ مقدمے برسوں عدالت میں چلتے رہتے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ مزدوروں کی پریشانیاں اس وقت تک دور نہیں ہو سکتیں جب تک کہ مزدور قوانین میں صحت مند تبدیلیاں نہیں کی جائیں اور ایک مضبوط ٹریڈ یونین تحریک کے ذریعہ محکمہ محنت کے افسران کو اس بات پر مجبور نہیں کیا جاتا کہ وہ غیر جانبداری کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دیں۔ اسکے بغیر دیرپا صنعتی امن کا قیام ممکن ہی نہیں۔

مسلم کمرشیل بنک اسٹاف یونین
کا دوسرا جشن سالگرہ

کراچی (نمائندہ منشور) ۲۲ دسمبر ۱۹۶۴ء کو ہوٹل میٹروپول کے لان میں ایک رنگارنگ تقریب منعقد ہوئی۔ یہ تقریب مسلم کمرشیل بنک اسٹاف یونین نے اپنے دوسرے جشن سالگرہ کے سلسلے میں منعقد کی تھی۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی بنک کے جنرل منیجر جناب مصطفےٰ صاحب تھے۔ لیکن وہ تشریف نہ لا سکے کیونکہ پچھلے دنوں وہ ایک حادثے میں زخمی ہوئے تھے اور ابھی تک اس قابل نہیں ہیں کہ چل پھر سکیں۔

کارروائی کا آغاز سپاسنامے کی پیشکش سے کیا گیا۔ سپاسنامے میں یونین اور انتظامیہ کے درمیان خوشگوار تعلقات کو سراہتے ہوئے ان مسائل کا ذکر بھی کیا گیا تھا جو بنک کے ملازمین کو درپیش ہیں۔

مصطفےٰ صاحب مہمان خصوصی کی طرف سے اس سپاسنامے کا تحریری جواب واسع صاحب نے پڑھ کر سنایا۔ اس جواب میں وہ ساری باتیں کہی گئیں تھیں جو انتظامیہ کے اعلیٰ عہدیداران ایسے موقع پر کہتے رہتے ہیں۔ بہرحال جنرل منیجر صاحب نے ملازمین کے مشکلات پر غور کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے ایک تجویز پیش کی کہ ادبی اور ثقافتی تقریبات کو زیادہ کامیاب اور زیادہ مفید بنانے کیلئے یونین کے اراکین اور بنک کے افسران پر مشتمل ایک ادبی ثقافتی کمیٹی بنائی جائے اور کوشش کی جائے کہ ان پروگراموں میں بنک کے ملازمین بھی حصہ لیں۔

اس کے بعد اس تقریب کی اعلانچی آنسہ غزالہ جعفتائی کی آواز نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ایسی تقریبات کے عام اعلانچیوں کے مقابلے میں آنسہ غزالہ اپنی انفرادیت کا ثبوت دیتی رہیں۔ فنکاروں کے تعارف کے ساتھ ساتھ فن کے متعلق فکر انگیز جملے واقعی داد کے مستحق تھے۔

رنگارنگ پروگرام میں حصہ لینے والے تقریباً سبھی فنکار پیشہ ور فنکار تھے گلوکاروں میں شبانہ مجید۔ نگہت سیما۔ ایس بی جون، وسیم فاروقی، جمیل اور فاضل احمد شامل تھے۔ پروین قاسم، راحیلہ روزینہ عذرا شائستہ نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ مہمان مزاحیہ فنکار رجب علی چاولہ نے بھی حاضرین سے خوب داد وصول کی۔ سازینہ وزیر حسین اور ساتھیوں پر مشتمل تھا۔

شبانہ نے اپنی روایتی سنجیدگی کے ساتھ خوب خوب جادو جگایا۔ لیکن بار ہا سنے فلمی گانوں کے باسی پن نے اس فنکار کی صلاحیت کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا۔ یہی کمزوری نگہت کے ساتھ بھی رہی اضافہ اس میں یہ ہوا کہ انہوں نے نورجہاں کی گائی ہوئی فیض کی نظم (جس کو اعلانچی صاحبہ نے فلم "قیدی" کا گانا قرار دیا تھا) گانے کی کوشش کی اور اس طرح خود اپنی کمتری کا مظاہرہ کیا۔ حالانکہ خود نگہت سیما نے غالب کی کئی غزلیں بڑے پیارے انداز میں گائی تھیں۔

گلوکاروں میں دوسرے فنکاروں نے بھی اپنے ماضی کو دہرایا ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کسی جدت کا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

رقاصاؤں میں پروین قاسم نے جس اعتماد اور مہارت کے ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ کیا وہ قابل داد ہے۔ خاص طور سے بھنگڑا ناچ کو جس ندرت اور جس اسلوب کے ساتھ اور حقیقت سے قریب ہو کر پیش کیا۔ وہ ذہن میں محفوظ رہنے والی چیز ہے

روزینہ اور راحیلہ کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اس عظیم اور ریاض طلب فن کے ساتھ کبھی انصاف کر سکیں گی۔ عذرا اور شائستہ میں بڑی

خبرنامہ

صلاحیت ہے کاش انہیں کسی اچھے فنکار کی رہنمائی حاصل ہوجائے۔

شوکت افضال مزاح سے زیادہ مسخرے پن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ پھر بھی افضال نے پرانی دھنوں کو نئے انداز اور نئی دھنوں کو پرانے انداز میں جس طرح پیش کیا وہ خاصے کی چیز ہے — رجب علی چاؤلہ گو کہ صرف ایک بار اسٹیج پر آئے لیکن نکھرے ہوئے مزاج کا ایک حسین نقش ضرور چھوڑا ہے ساڑھے تین گھنٹے کا یہ پروگرام ہلکی تفریح تو فراہم کر گیا۔ جس قدر محنت اور مصارف کے ساتھ یہ پروگرام پیش کیا گیا اس کو دیکھتے ہوئے یہ افسوس ہوتا ہے کہ یہ وسائل صرف بے مقصد تفریح پر صرف ہوئے۔ اگر مناسب منصوبہ بندی کے ساتھ ایسی تقریبات منعقد ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ تفریح اور مقصدیت کا ایک حسین امتزاج پیش کیا جاسکے۔ اس موقع پر یونین نے ایک یادگار مجلہ بھی شائع کیا ہے۔

مسلم کمرشیل بنک اسٹاف یونین اپنے اراکین اور ملک کے مزدوروں کے مفاد کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ادب و ثقافت کی جو خدمت کرنے کی کوشش کر رہی ہے وہ یقیناً قابلِ ستائش ہے۔



مسلم کمرشیل بنک اسٹاف یونین کے جشن میں ایک رقص کا منظر

موجودہ مزدور قوانین مزدوروں کے لئے ناقابل برداشت بوجھ ہیں

کراچی (نمائندہ منشور) ٹریڈ یونینوں کی مجلس رابطہ کے قائم مقام سکریٹری جنرل واحد بشیر صاحب نے نمائندہ منشور کو ایک ملاقات میں بتایا کہ موجودہ مزدور قوانین میں خامیوں کی موجودگی ایک ایسی نمایاں حقیقت ہے جسے خود حکومت کے ذمہ دار ارکان دو سال سے تسلیم کرتے چلے آرہے ہیں اور انہیں تبدیل کرنے کا اعلان کر رہے ہیں لیکن — باوجود یادداشتوں کے اور ٹھوس تجاویز پیش کرنے کے مداری کی یہ پٹاری کھل کر نہیں دیتی اور مزدوروں کے حالات کار خراب سے خراب تر ہوتے جارہے ہیں۔ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ کہنے کو تو ملک میں ایک دن میں کام کا زیادہ سے زیادہ وقت آٹھ گھنٹے مقرر ہے لیکن عملاً دس گھنٹے — بارہ گھنٹے اور سولہ گھنٹے تک مزدوروں سے کام لیا جاتا ہے۔ کراچی میں کم از ایک سو فیکٹریوں میں بارہ گھنٹے کی شفٹ چلائی جارہی ہے پچاس کے قریب فیکٹریوں اور بڑے ملوں میں دس گھنٹے کی شفٹ چلائی جارہی ہے بڑے ملوں میں ڈبل ڈیوٹی یعنی سولہ گھنٹے مسلسل کام لینا معمول میں داخل ہوچکا ہے۔ یہ صورت حال کئی خرابیوں کی جڑ ہے یہاں مزدور کی اجرت اتنی کم ہے کہ وہ کم سے کم غذائیت بھی حاصل نہیں کرسکتا۔ اس پر ظلم یہ کہ اسے زیادہ وقت کام کرنا پڑتا ہے جو ایک اچھی غذا کھانے والے صحت مند مزدور کیلئے بھی مضر ہے۔ اس کے نتیجے میں انہیں مصنوعی طریقے استعمال کرنے پڑتے ہیں مزدور ضرورت سے زیادہ چائے نوشی، تمباکو نوشی حتیٰ کہ منشیات یعنی چرس اور افیون کا سہارا لیتے ہیں جس سے ان کی اجرتوں کا ایک بڑا حصہ ان چیزوں پر ضائع ہوجاتا ہے اور صحت پر مزید برا اثر پڑتا ہے کراچی کے صنعتی مزدوروں میں ٹی بی سے متاثر مزدوروں کا اوسط بیس اور پچیس فی صد کے درمیان ہے یہ بلا صرف انہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کے خاندانوں پر بھی اس کا پورا پورا اثر پڑ رہا ہے۔ دوسری طرف ملک میں بیروزگاری میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس اضافہ میں اوقات کار کی زیادتی کا بھی ہاتھ ہے اس لئے کہ برسر روزگار مزدوروں کے روزانہ اوسطاً بارہ ہزار گھنٹے زائد کام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کم سے کم ڈیڑھ ہزار مزدوروں کو بے روزگاری کے منہ میں دھکیل دیا گیا ہے۔ زائد اوقاتِ کار سے مالکان کو لاکھوں روپے کا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ اس لئے کہ کم آدمیوں سے زیادہ کام لینے کی صورت میں انہیں ایک تو زائد اجرت ادا نہیں کرنی پڑتی دوسرے مزدوروں کی تعداد کم ہونے کے باعث انہیں بونس چھٹیوں کی تنخواہ — انشورنس کی قسط اور دوسری دیگر سہولتوں کی بچت ہوجاتی ہے۔

اس صورت حال کی ذمہ داری بنیادی طور پر مروّجہ مزدور قوانین پر ہے۔

اگر انہیں جلد تبدیل نہ کیا گیا تو سنگین صورت حال کے پیدا ہونے کا پورا پورا خطرہ موجود ہے۔ جو کچھ قوانین نافذ بھی ہیں ان پر عمل درآمد اس لئے نہیں ہوتا کہ محکمۂ محنت سے متعلق افراد اپنے ذاتی مقاصد کے تحت ان کی خلاف ورزی کی طرف سے چشم پوشی کرتے ہیں — اور مزدوروں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ فیکٹریز ایکٹ یا انڈسٹریل اینڈ کمرشیل اسٹیبلشمنٹ اسٹینڈنگ آرڈرز، آرڈیننس کی خلاف ورزی کی شکل میں مل مالک کے خلاف براہ راست عدالتی چارہ جوئی کرسکیں۔ یہ اختیار فیکٹری انسپکٹر کو حاصل ہے جو باوجود کم تنخواہ پانے کے بنگلے میں رہتا ہے اور سواری کے لئے موٹر رکھتا ہے۔ موجودہ قوانین کی رو سے محکمۂ محنت مل مالکوں کے ہاتھ میں ایک اور حربہ ہے جسے وہ ہمیشہ مزدوروں کے خلاف کامیابی کے ساتھ استعمال کرتے رہتے ہیں۔

اوپل انڈسٹریز میں یونین کا قیام

کراچی ۲۶ دسمبر۔ آج لانڈھی میں کوارٹر نمبر ۵۷۳ - B/ ۳۷ میں اوپل انڈسٹریز لانڈھی کے مزدوروں کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں فیصلہ کیا گیا کہ آپ کی فار اوپل انڈسٹریز ایمپلائز یونین کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جائے اس مقصد کیلئے ایک آئین بھی منظور کیا گیا۔ جلسہ میں رجسٹرار صاحب کو فارم ۹ پر دستخط کرنے کیلئے ۷ افراد کو بھی منتخب کیا گیا نیز عہدیداروں کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔ صدر مسٹر محبوب الٰہی اور جنرل سکریٹری مسٹر ابن ایوب کو منتخب کیا گیا۔ جلسہ میں ایک قرارداد کے ذریعے منتظمین سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ۵ نمائندوں سے کئے ہوئے معاہدہ پر فوراً عمل کریں ورنہ ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔

خبرنامہ

کراچی کے بیڑی کے مزدوروں کی یونین کا قیام

کراچی (نمائندہ منشور) کراچی کے بیڑی کے مزدوروں کا ایک جلسہ ۱۳ر دسمبر کو لیاقت آباد میں عبدالرحمن صاحب (بی ڈی انتخابی کالج... نومنتخب ممبر) کی صدارت میں منعقد ہوا جلسے میں لیاقت آباد۔ کھارادر۔ کیماڑی۔ لانڈھی۔ کورنگی۔ اور دوسرے علاقوں کے بیڑی کے کارخانوں کے مزدوروں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ جلسے نے بیڑی کی صنعت میں کام کرنے والے مزدوروں کے مسائل اور مشکلات پر غور کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ ان مشکلات کو دور کرنے اور بیڑی مزدوروں کے حالات کار کو بہتر بنانے کیلئے ایک سرگرم یونین کی تشکیل کی جائے جلسے نے فیصلہ کیا کہ اس یونین کا نام "سنٹرل یونین آف کراچی بیڑی ورکس" رکھا جائے۔ کیونکہ اس یونین کو پوری کراچی کی بنیاد پر منظم کیا جائے گا۔ جلسے نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ جلسہ عام بلا کر باقاعدہ انتخابات کروانے کیلئے ایک کنوینگ کمیٹی مقرر کی جائے۔ اس کمیٹی کے ذمے ممبر سازی اور دوسری ضروری کاروائیاں ہونگیں۔ سات افراد پر مشتمل اس کمیٹی کا صدر جناب عبدالرحمن صاحب اور سکریٹری جناب واحد بشیر صاحب کو مقرر کیا گیا ہے۔

جلسے نے ایک قرارداد بھی منظور کی جس میں کراچی کے طلبا۔ اساتذہ۔ اور صحافیوں پر پولیس کی طرف سے کی جانے والی زیادتیوں اور مظالم کی سخت مذمت کی گئی۔ شیخ محمد نسیم شہید کو خراج عقیدت پیش کیا گیا اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ فوری طور پر طلبا اور اساتذہ کے مطالبات تسلیم کرے یونیورسٹی آرڈی ننس اور دوسرے تمام کالے قوانین منسوخ کرے۔ مزدوروں کا ہڑتال کا حق بحال کرے اور مزدور قوانین میں مغربی پاکستان مزدور کارکن کانفرنس کی پیش کردہ ترامیم منظور کرے۔

مطالبات منوانے کیلئے

لانڈھی ٹیکسٹائل مزدوروں کا مشترکہ فیصلہ

مزدوروں کو متحد کرنے کے لئے کمیٹی کا قیام

لانڈھی (نمائندہ مزدور) مارچ اپریل ۱۹۶۳ء کی طویل خاموشی کے بعد بالآخر یہاں کے مزدور رہنما کٹھن جدوجہد کے بعد اس مرحلے پر پہنچ گئے ہیں کہ وہ مشترکہ مطالبات کے لئے لانڈھی انڈسٹریل اسٹیٹ میں ٹیکسٹائل ملوں کے مزدوروں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع کر دیں۔

اس سلسلے میں یکم دسمبر کو آدم جی کاٹن ملز لیبر یونین کے دفتر میں ٹیکسٹائل ملوں سے تعلق رکھنے والی آزاد ٹریڈ یونینوں کا ایک اجلاس زیر صدارت جناب صفدر حسین شاہ منعقد ہوا۔ جس میں مزدوروں رہنما مسٹر ابن ایوب۔ حاجی عدیل شوکت علی، اور عباس علی نے لانڈھی کے مزدوروں کے مسائل پر سیر حاصل تقاریر کیں۔ اس اجلاس میں ۲ نفری کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے ۸ر دسمبر کو ایک اور نمائندہ اجلاس طلب کیا مذکورہ اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ ٹیکسٹائل ملوں کے مالکان سے مندرجہ ذیل مطالبات پورے کرنے کیلئے زور دیا جائے۔

۱:۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی اور بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر تمام مزدوروں کی اجرتوں میں کم از کم ۲۵ فیصد کا اضافہ کیا جائے۔

۲:۔ حاضری الاؤنس کو تنخواہ کا حصہ قرار دیا جائے۔

۳:۔ پراونڈنٹ فنڈ اور گریجویٹی دی جائے۔

۴:۔ بونس میں پچاس فیصد اضافہ کیا جائے۔

۵:۔ ٹھیکہ سسٹم ختم کیا جائے۔

۶:۔ تمام مزدوروں کی ملازمت کا تحفظ کیا جائے۔

مزدوروں کے ایک ترجمان نے نمائندہ منشور کو بتایا کہ یہ بات انتہائی افسوسناک ہے کہ مارچ اپریل ۱۹۶۳ء سے لیکر اب تک ٹیکسٹائل کے مزدوروں کا کوئی بھی مطالبہ پورا نہیں ہوا جس کی وجہ یہ ہے کہ مالکان پاکٹ یونینوں کو پرورش کر کے مزدوروں کے مطالبات کو پس پشت ڈال رہے ہیں اور محکمۂ محنت کے ذمہ دار افسران بھی اس سلسلے میں ان کی ہمت افزائی کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت ٹیکسٹائل کے مزدوروں میں عام بے چینی۔ اور اضطراب پھیلا ہوا ہے۔

مذکورہ اجلاس میں مندرجہ بالا مطالبات کیلئے لانڈھی انڈسٹریل ایریا میں جگہ جگہ اجلاس طلب کر لئے گئے ہیں تاکہ مزدوروں کو اپنے مطالبات پر مشترکہ جدوجہد کیلئے تیار کیا جا سکے۔

ٹرانسپورٹ ورکرز

پھر ہڑتال کرنے پر مجبور ہونگے

لاہور (نمائندہ منشور) پاکستان ٹرانسپورٹ ورکرز یونین کے صدر اور مغربی پاکستان مزدور کارکن کانفرنس کی گورننگ باڈی کے ممبر جناب سید معین الدین نے متنبہ کیا ہے کہ اگر حکومت نے ٹرانسپورٹ ورکرز کے مطالبات کو تسلیم نہ کیا تو مزدور دوبارہ ہڑتال کرنے پر مجبور ہوں گے انہوں نے کہا کہ ہماری جدوجہد اپنے حقوق کے تحفظ اور سچائی کے لئے ہے اس لئے نہ تو ہم خوفزدہ ہوں گے نہ پیچھے ہٹیں گے۔ ہمارے مطالبات کے جائز ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ خود حکومت ان پر کوئی اعتراض نہ کر سکی۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے حکومت مغربی پاکستان کے چیف سکریٹری کی یقین دہانی پر اپنی ہڑتال ختم کی تھی اگر ہم دوبارہ ہڑتال پر مجبور ہوئے تو اس کی پوری پوری ذمہ داری حکومت پر ہوگی۔

انہوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ مغربی پاکستان کے مختلف شہروں میں ٹرانسپورٹ ورکرز کے خلاف ہڑتال کرنیکے جرم میں انتقامی کاروائیاں جاری ہیں جو حکومت کی یقین دہانیوں کے سراسر خلاف ہیں۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ یہ سلسلہ فوری طور پر بند کیا جائے۔

ٹرسٹ سرانگ انڈسٹریز کے

بارہ برطرف مزدوروں کو بحال کر دیا گیا

لانڈھی (نمائندہ منشور) مغربی پاکستان انڈسٹریل کورٹ کراچی نے ۸ر دسمبر کو ٹرسٹ سرانگ انڈسٹریز کے مزدوروں کی دفعہ (۲۰) کی درخواست پر اپنے فیصلے میں محمد عثمان اور دوسرے گیارہ مزدوروں کو ملازمت پر بحال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ منتظمین نے جن بارہ مزدوروں کو غیر قانونی طور پر کام پر لینے سے انکار کر دیا تھا انہیں بحال کیا جاتا ہے اور وہ مورخہ ۲۶ر ستمبر ۱۹۶۴ء سے تنخواہ کے حقدار ہوں گے۔ یاد رہے کہ پانچ منتخب نمائندوں نے ۲۶ر ستمبر کو اپنی دفعہ (۲۰) کی درخواست میں منتظمین سے شکایت کی تھی کہ وہاج الدین موسیٰ خان، جابر قریشی مظفر محی الدین عیسیٰ خان، محمد عثمان، عبدالخالق محمد بن عبداللہ، عبدالستار، امیر بیگ آغا محمد شیخ احمد کی غیر قانونی ناکہ بندی کر دی گئی ہے۔ جو انڈسٹریل ڈسپوٹ آرڈی ننس ۱۹۵۹ء کی سراسر خلاف ورزی ہے درخواست گذار نے کورٹ سے التجا کی تھی کہ منتظمین کو ہدایت کی جائے کہ ورکرز کو ملازمت پر بحال کرتے ہوئے۔ لاک آؤٹ (تالہ بندی) ختم کر دیں۔

اس مقدمے میں منتظمین کی طرف سے مسٹر محمود اے غنی اور مزدوروں کی طرف سے مسٹر عبدالمجید اور ابن ایوب نے پیروی کی تھی۔



- ذلیل وہ ہے جسے ہر حال میں اپنی اجرت کی فکر ہو، خواہ ملک کی حکومت اچھی ہو یا بُری ——— کونگ فوزی
- شکر اور بالائی کو مکھی پر لگادیا جائے تو اس کا مزا بھی رس بھری سا ہو جائے گا ——— ایڈگر ڈبلیو ھاؤ
- انسان کسی بات کے متعلق اتنا نہیں سوچتا جتنا وہ کھانے کے متعلق سوچتا ہے ——— سیموئیل جانسن
- مارنا ہے تو جڑ پر مارو شاخیں خود بخود گر جائیں گی ——— برٹرنڈ رسل
- لوگوں میں سب سے بڑے شر انگیز وہ ہیں جو رعایا کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتے ہیں ——— معری
- جب میں کسی جاہل کو عمدہ لباس میں پاتا ہوں تو مجھے اس لباس کی قسمت پر رونا آتا ہے ——— جوش بلنگش
- یہ حکومت کا آرٹ ہے کہ وہ شہریوں کی ایک جماعت سے دوسری جماعت کو دینے کے لئے جس قدر زیادہ سے زیادہ روپیہ لیا جاسکتا ہے لے ——— اسکر وائیلڈ
- ہمیں صرف ایک آزادی مطلوب ہے، وہ ہے ستم زدہ لوگوں کو آواز نکالنے کی آزادی ——— برنارڈ شا
- اس کی پرواہ نہیں کہ مستقبل مجھے یاد رکھے گا یا بھول جائے گا۔ تمنا صرف یہ ہے کہ وہ لوگ جو انسانوں کو تڑپا رہے ہیں، میری خونچکاں تحریر ان کے لئے پیام مرگ ثابت ہو ——— قاضی نذر الاسلام
- نظم ونسق اور لوٹ کھسوٹ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں ——— لارڈ کرزن
- ہمارے مزدور کی کمائی مہذب زندگی کی ابتدائی ضروریات کی بھی کفیل نہیں ——— لوکا ناتھن
- محبت کئے بغیر، بوسے دینے سے مر جانا بہتر ہے ——— چرنیشو سکائی
- ہند و پاکستان میں سب سے حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس کی مٹی زرخیز اور اچھی ہے۔ اور اس کے باشندے مفلس ——— ایم۔ ایل۔ ڈارلنگ
- سرمایہ داری نظام میں پیداوار کی ترقی کے تمام عناصر اپنے آپ کو پیدا کرنے والے (محنت کش) کے خون چوسنے اور اس کو مطیع و مغلوب بنائے رکھنے کے نظام میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ یہ عناصر مزدور کو ایک زندہ چیچھڑے کی طرح چوس لیتے ہیں۔ اور مشین کا ضمیمہ بنا ڈالتے ہیں۔ کام کی تمام دلچسپی ختم کر دی جاتی ہے اور محنت کو صرف قابل نفرت مشقت و بیگار بنا ڈالتے ہیں اور جیسے جیسے صنعت میں سائنس کی ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو مزید دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ محنت کے اوقات کو روز بروز تلخ اور گھناؤنا بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور انھیں اس دوران میں انتہائی تشدد اور بدسلوکی کا شکار بنایا جاتا ہے اور یہ تشدد اپنی کمینگی اور مکر کی وجہ سے اور بھی ذلیل، تکلیف دہ اور قابلِ نفرت ہو جاتا ہے۔ سرمایہ دار مزدور کی زندگی کو ایک مسلسل اور بدترین مشقت بھری زندگی میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس کے بیوی بچوں کو گھسیٹ کر سرمایہ کی جگمگاتی رتھ کے پہیوں کے نیچے پس جانے کیلئے پھینک دیتے ہیں ——— کارل مارکس
- ایک روز ایک عورت اپنا دکھڑا سنا رہی تھی، میں نے ہمدردی کے طریقے سے کہا "صبر کرو! صبر اچھی چیز ہے!" وہ شکایت آمیز لہجے میں کہنے لگی — "بیشک، صبر — مگر صبر کے بعد — قبر!" سوچتی ہوں تو اسے صحیح پاتی ہوں ——— سجاد حیدر یلدرم

لوگ کہتے ہیں



علی سردار جعفری

تن کی چاندی من کا سونا

ہم نے بیچی تن کی چاندی
ہم نے بیچا من کا سونا
[illegible] نے ہیرے
[illegible]
[illegible] لیکر نکلے
پھر بھی مفلس اور کنگال
[illegible]
ہم سے خریدی تن کی چاندی
ہم سے خریدا من کا سونا
چھین لئے آنکھوں سے ہیرے
پھیلے ہاتھوں کے دریا
اور کہلائے

صاحب دولت، صاحب مال
لیکن اک دن
تن کی چاندی
من بھی سونا
[illegible]
[illegible]
سب [illegible] بن جائے گے
اور زمانہ ہوگا نہال
اور دنیا ہوگی خوشحال
شام تمنا رنگیں ہوگی
روشن ہوگی صبح جمال

کراچی

پیارے بھائی - تسلیم

"منشور" کا باقاعدہ مطالعہ کر رہا ہوں ہر نئے شمارہ گزشتہ مہینے کے شمارے سے بہتر نکلتا ہوا معلوم ہوتا ہے بہت سی باتیں قابل تعریف ہیں۔ مثلاً "خبر نامہ" اور سرورق کا بہترین صرف وغیرہ۔ دسمبر ۱۹۶۴ء کے شمارے میں آپ کا فکر انگیز اداریہ بہت شاندار ہے۔ آپ نے حقائق (گو تلخ ہی سہی) کا جس بے باکی اور غیر جانبداری سے جائزہ لیا ہے وہ قابل تعریف ہے صرف واجبات کی عدم ادائیگی کی بنا پر انجمن مصنفین کے انتخابات میں دانشوروں کا بھاری تعداد میں حق رائے دہی سے محروم کیا جانا اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ یہ تنظیم واقعی گٹھ پتلیوں کا کھیل ہے اور کچھ بھی نہیں، ادارہ مصنفین پاکستان میں دھڑے بندیوں کا پول ضرور کھلنا چاہیئے تھا۔ سو آپ کے اداریئے نے بہت سارے لوگوں کو بتا دیا کہ اس ادارے کی حقیقت حال کیا ہے۔

اسی شمارے کے مضامین میں "الجزائر" افریقہ کے افق پر ایک ستارہ" افسانوں میں عورت اور نظموں میں "تن کی چاندی من کا سونا۔ اور "شعر کہنے کی فرمائش پر" بہت اچھی ہیں۔ طنز و مزاح میں جوہر میر صاحب کا طنزیہ" مانگنے والے" بہت پسند آیا۔

سلیم خواجہ

کراچی

برادرم مسنون

"منشور" بابت دسمبر ۱۹۶۴ء پیش نظر ہے اس دور میں جب کہ سبھی اچھے پرچے کسی نہ کسی طور "گھٹیا پن" کا شکار ہو رہے ہیں "منشور" کا دم غنیمت ہے میری دلی دعائیں اور بہترین تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

"منشور" کا اداریہ بعنوان "ادارہ مصنفین پاکستان" نہ صرف ایک جرأت مندانہ قدم ہے بلکہ اس سال کا بہترین تحفہ بھی ہے۔ میں نے اردو رسائل و اخبارات کے اداریے بہت کم ایسے دیکھے ہیں۔ جنہوں نے فوری طور پر دل و دماغ کو متاثر کیا ہو۔ حالانکہ پاک و ہند کے بے شمار اخبارات و رسائل اکثر و بیشتر میری نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔ "ادارۂ مصنفین پاکستان" کی کہانی چند ایسے افراد کے گرد گھومتی نظر آتی ہے جو آج کل "مملکت شعر و ادب کے جائز شہزادگان" کی فہرست میں اپنے اسمائے گرامی کو سر فہرست دیکھنے میں مصروف ہیں حالانکہ اس دور میں باشعور فنکار پر ان" خود ساختہ شہزادگان ادب" کی حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہے۔

آخر میں "منشور" میں شائع شدہ ایک نظم کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جو کہ اسی شمارہ میں چھپی ہے۔ اور وہ نظم ہے "عزم" جس کے خالق جناب حاجی عدیل ہیں اس نظم کے دو مصرعے بحر سے خارج ہیں۔ ملاحظہ کیجئے ع

تاریک مکانوں میں جلے شمع دانش
اس "شمع دانش" سے کئی دیپ جلا کر"

فیروز نظر

کراچی

مکرمی!

آداب!

مزاج گرامی!

میں "منشور" کا چند ماہ سے مطالعہ کر رہا ہوں

اتنا عمدہ، سستا اور وسیع تر رسالہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ آپ جس محنت اور لگن کے ساتھ رسالہ "منشور" نکال رہے ہیں اس کیلئے ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں مضامین کی ترتیب و نفاست بڑی دلکش اور معیاری ہے۔

ماہ نومبر کے پرچے میں رئیس امروہوی کا مضمون "سرمایہ دار دنیا کا سب سے بڑا مرض" بے حد پسند آیا۔

"صحرا بہ صحرا کو بہ کو" اے خالق کا "پرانے شکاری نئے جال" اور مظفر حنفی کا افسانہ "دل کے آئینہ میں" پسند آئے۔

سرورق پر حسن حمیدی کی نظم "قندیل سحر" تو بڑی پیاری لگی انکی خدمت میں میری جانب سے مبارکباد پہنچا دیجئے گا۔

مقبول خاں روشن اجمیری

سانگھڑ

بھائی
تسلیم

"منشور" لگاتار مل رہا ہے اس کرم فرمائی کے لئے ممنون ہوں۔ چشم بد دور، اس کا حسن روز بروز نکھرتا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ آپ کی محنتوں کا نتیجہ ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

منظر ایوبی

کیمبل پور

محترم بھائی!

"منشور" مجھے مل رہا ہے اس کیلئے آپ کا شکر گزار ہوں جو معیار آپ نے "منشور" کا بنایا ہے۔ لوگ اس کی یقیناً تقلید کرنا باعث فخر سمجھیں گے۔

وقار بن الٰہی

کراچی

مکرمی تسلیم!

میں ہر ماہ "منشور" کا مطالعہ بڑی دلچسپی اور پابندی سے کرتا ہوں۔ یہ پرچہ واقعی خوبیوں کا مالک ہے۔ ادبی اور سماجی لحاظ سے بھی غیر معمولی اہمیت اور افادیت کا حامل ہے اس کے ترتیب دینے والے بھی اچھے اور باشعور لوگ ہیں اور اس میں لکھنے والے بھی جی الانا۔ رئیس امروہوی۔ عبید اللہ علیم۔ جگن ناتھ آزاد۔ حسن حمیدی۔ اور علی سردار جعفری جیسے شہرت یافتہ اور مقبول فنکار ہیں۔ بہرحال "منشور" سے مفید کارآمد اور بلند پایہ تخلیقات کی توقعات وابستہ ہیں اور "سویرا" سے خائف ظلمت پسندوں کو "فنون" کی لطافت سے بے بہرہ وروں کو "ادب لطیف" سے بدظن حسن کوروں کو "نقوش" کے خطوط مٹانے والوں کو "نگار" کی نگارشات سے متنفر افراد کو۔ اور۔ "ہم قلم" کو اہمیت نہ دینے والوں کو۔ "منشور" کی مار مارنے والے دانشور بے شک علم و ادب کی بقا اور عظمت کے محافظ اور زندگی کے ترجمان ہیں

دسمبر ۱۹۶۴ء کے شمارہ میں اداریہ بعنوان "ادارہ مصنفین پاکستان" تلخ حقائق پر مبنی ہے جو بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ رئیس امروہوی، علی سردار جعفری، خالد حمیدی، اور یوسف عندلیب کی تخلیقات معاشرتی اور اصلاحی اعتبار سے بے حد مفید اور کارآمد ہیں۔

"منشور" سائز اور سادگی کے اعتبار سے بھی بڑی حد تک منفرد ہے۔

اختر امین بجنوری

رحیم یار خاں

برادرم

السلام علیکم!

احوال آنکہ "منشور" متواتر تین ماہ سے مل رہا ہے عزیز بھائی! ہم سب اتنے مصروف تھے کہ آپ کو کوئی خط نہ لکھ سکے۔ کبیدہ خاطر نہ ہوں "منشور" واقعی ایک بہت اچھا رسالہ ہے اور اسے آپ سب جس محنت سے ترتیب دے رہے ہیں اس کیلئے ہم سب ساتھیوں کی مبارکباد قبول فرمائیے۔ کلمۂ حق بہت بڑا جہاد ہے۔ خداوند تعالے آپ کو کامران و کامیاب کرے۔ آمین۔ ہم سب ساتھیوں کی تمام ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔

غلام محمد

جھنگ

سبط اختر جی۔

سلام

آپ دودھ سے وضو کر کے "منشور" کو ترتیب دیتے ہیں نومبر کا شمارہ چنبیلی کے پھولوں کا ڈھیر معلوم ہوتا ہے۔ آپ کی صاف اور ستھری ذہنیت رنگ لا رہی ہے۔

شیر افضل جعفری

دہلی

محترم بھائی!

آداب

اتنا شاندار، سستا، پیارا، ہر لحاظ سے مکمل ہر خوبی سے مزین بھرپور اور جامع پرچہ اور پھر اس پابندی سے نکالنا جادو نہیں تو اور کیا ہے آپ کو ہر اچھے سے اچھے ادیب کا تعاون حاصل ہے پرچہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے گا۔ ذرا سائز اکھرتا ہے اس پر بھی نگاہ رکھئے۔ اس طرف پہلے بھی کئی بھائی اشارہ کر چکے ہیں۔ واقعی یہ ذرا چھوٹے سائز کا بنا دیا جائے تو اس کا رنگ و روپ ہی اور نکل آئے۔ اس معمولی کمی کو اگر ہزاروں خوبیوں کے سامنے نظر انداز کر دیا جائے تو آپ کے ہاتھ چومنے کو جی چاہتا ہے اتنا شاندار پرچہ نکالنے پر میری دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

ہرچرن چاؤلہ

دہلی

ڈیئر

ایک بات میں بہت سنجیدگی سے کہنا چاہتا ہوں۔ "منشور" کو تم نے ایک بڑی جانی پہچانی شائستگی عطا کی ہے۔ یہ وہ ہے جو محض ستھرے ذوق کا غماز ہے اور جس کیلئے چیخنے چنگھاڑنے "ہمارا معیار" قسم کے نعرے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے یہاں مقابلہ تو نہیں کرنا چاہتا مگر یہ ضرور کہوں گا کہ بعض واقعی اچھے رسالے جس طرح بھونڈے پن سے اپنے اچھے ہونے کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ اور ایک خاص قسم کے "نودولتیئے" پن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس سے تمہارا اچھا اور سلجھا ہوا پرچہ پوری طرح پاک ہے اس کے لئے بڑے ظرف کی ضرورت ہے اور ظرف آتا ہے اچھے ادبی ماحول میں آنکھ کھولنے اور ایک پوری تہذیبی روایت میں پرورش پانے کے بعد۔

قیصر تمکین

بھوپال

محترمی تسلیم!

نومبر کا "منشور" ملا۔ نوازش کا شکریہ! یہ شمارہ بھی گذشتہ شماروں کی طرح کافی جاذب نظر ہے۔ مستقل عنوانات کے ساتھ حضرت رئیس امروہوی، مظفر حنفی، ہربنس لال ساہنی، حسن حمیدی، محبوب اللہ مجیب، سید احتشام حسین، افتخار اعظمی، وغیرہ کی تخلیقات خاص طور پر پسند آئیں باقی تخلیقات بھی اچھی ہیں یقین فرمائیے "منشور" کا ہر شمارہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے۔ آج کل ایسے خوبصورت اور معیاری پرچے دیکھنے کو ذرا کم ہی ملتے ہیں۔ بیباکی کے لحاظ سے تو "منشور" کا ثانی نہیں۔

واحد پریمی

کراچی

مکرمی تسلیم!

"منشور" اپنی انفرادیت کے ساتھ نظر نواز ہوا ہے۔ ادب اور زندگی کا حسین سنگم اگر دیکھنا چاہو تو "منشور" کافی ہے۔ زندگی کی ہمہ ہمی ہلچل، ولولے، کروٹیں، اور ادب کی ہموار سطح نرم نرم آنچ، بدلتے ہوئے وقت کی کروٹیں — الفاظ کے خوبصورت غلاف میں لپٹی ہوئی — یہ سب کچھ بڑا پرکشش ہے اور پھر "لوگ کہتے ہیں" اور یہی سب کچھ کہتے ہیں۔ اور جو لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ ہم تو نیک تمناؤں اور آپ کے ارادوں کی کامیابی کیلئے دعا ہی کر سکتے ہیں۔ وہ کر رہے ہیں

تاجدار عادل

کراچی

مکرمی!

السلام علیکم

"منشور" کا دسمبر کا شمارہ پڑھا دل کو خوشی ہوئی تحریریں وقت کی مطابقت کے ساتھ اوراق کا احاطہ کئے ہوئے ہیں گو کہ پاکستان میں لفظ بالغ، اور اظہار رائے، کو طبقاتی درجوں میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ لیکن میں ان طبقاتی تقسیم سے بالاتر ہو کر ادب کے بہی خواہوں سے اظہار رائے کر سکتا ہوں گو "منشور" کافی بالغ نظری کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔

انشاءاللہ پرچہ بہت جلد ترقی کرے گا میری طرف سے پیشگی مبارکباد قبول فرمائیے۔

ایم۔ ایم۔ آغا



کچھ توجہ اِدھر بھی

مسرور زبیدی

دن بدن بڑھتا ہوا فلم بینی کا ذوق اس فن کے موثر ہونے کی دلالت کرتا ہے ــ آج کے دور میں تفریح کا سب سے موثر ذریعہ فلم ہی ہے۔ بیرونی ممالک میں جہاں معیار زندگی بلند ہے وہاں فلم کے علاوہ تفریح کیلئے کلب، کیبرے تھیٹر وغیرہ میسر ہیں لیکن ہمارے ملک میں یہ تمام تفریحات ہر فرد کیلئے ممکن نہیں۔ پاکستان کی آبادی کا بیشتر حصہ مزدور طبقہ پر مشتمل ہے جو ان کلبوں، ہوٹلوں اور تھیٹروں کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہیں۔ فلم سے عوام کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ تفریح حاصل کرتے ہیں۔ موثر کہانی ہوشربا رقص مسحور کن موسیقی جذبات آمیز نغمہ اور دل میں اتر جانے والے مناظر وغیرہ وغیرہ ــ لیکن پھر بھی یہاں ٹکٹ کی شرح اس قدر زیادہ ہیں کہ دنیا کے دوسرے ممالک سن کر حیران رہ جاتے ہیں ــ

ہماری بد قسمتی ہے کہ آج سترہ سال بعد بھی فلمی صنعت شدید بحران میں مبتلا ہے حکومت نے اب تک ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جس سے استحکام کی کوئی صورت نکلتی۔ صرف غیر ملکی فلموں کو بین کر کے تھوڑی حوصلہ افزائی کی ہے۔ جس سے فلم سازی کی رفتار میں خاطر خواہ تیزی پیدا ہوگئی ہے۔ فلمسازی کی رفتار تیز ہو جانے سے ہم کسی معیار کی آس نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ محدود مشینری ــ محدود نگار خانے ــ اور محدود نمائش گھر اس تیز رفتاری کا کہاں تک ساتھ دے سکتے ہیں۔ اس وقت یہ عالم ہے کہ ایک فلم کی نمائش پر تقریباً چھ ہفتے نمائش گھر کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بعض اچھی فلمیں اچھے بالز نہ ملنے کی وجہ سے مار کھا جاتی ہیں ـ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے فلمسازی کی تیز رفتاری کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

سن	ریلیز ہونیوالی فلموں کی تعداد
۱۹۴۸	ایک
۱۹۴۹	سات
۱۹۵۰	تیرہ
۱۹۵۱	آٹھ
۱۹۵۲	سات
۱۹۵۳	دس
۱۹۵۴	سات
۱۹۵۵	انیس
۱۹۵۶	تیس
۱۹۵۷	ستائیس
۱۹۵۸	پینتیس
۱۹۵۹	اڑتالیس
۱۹۶۰	انتالیس
۱۹۶۱	اڑتیس
۱۹۶۲	انتالیس
۱۹۶۳	چالیس
۱۹۶۴	دو سو بارہ

(مجموعی طور پر زیر تکمیل اور ریلیز ہونیوال)

۱۹۶۴ء میں جس تیزی کے ساتھ فلمسازی میں اضافہ ہوا ہے وہ قابل غور ہے لیکن اس کے برعکس ہمارے نگارخانوں اور نمائش گھروں نے کوئی ترقی نہیں کی اس وقت کراچی، لاہور اور ڈھاکہ میں مجموعی طور پر صرف نو نگار خانے ہیں اور پورے پاکستان میں چار سو تین نمائش گھر ہیں ۱۹۶۴ء میں اگر دو سو بارہ فلمیں نمائش کیلئے پیش کر دی گئیں تو ہفتے میں چار فلموں کا اوسط پڑے گا۔ اس اعتبار سے نمائش گھروں کی قلت ایک نیا بحران کھڑا کر دے گی۔ اگر جلد ہی اس کا تدارک نہیں کیا گیا تو اس صنعت کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ مندرجہ بالا چار سو تین نمائش گھروں میں وہ بھی شامل ہیں جو انگریزی فلموں کیلئے مخصوص ہیں اور اردو فلموں کی نمائش سے گھبراتے ہیں حالانکہ نئے آرڈیننس کے تحت وقت کے اعتبار سے پچاسی فیصد اردو اور پندرہ فی صد غیر ملکی فلموں کا دکھانا لازمی ہے لیکن اس میں ایک "لوپ ہول" رہ گیا ہے جسکا فائدہ نمائش کار اٹھاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ سال میں جتنے گھنٹے نمائش گھر چلا اس میں اردو دستاویزی اور تشہیری فلمیں شامل کر کے پچاس فیصد وقت گھٹا دیتے ہیں اور بڑے آرام سے غیر ملکی فلموں کی نمائش کرتے ہیں۔ اسکے علاوہ سال میں ایک دو فیچر فلمیں بھی چلا لیتے ہیں نہ معلوم آرڈیننس نافذ کرتے وقت اس طریقے کی کمزوریاں کیوں چھوڑ دی جاتی ہیں۔

نئے نمائش گھروں اور نگار خانوں کے قیام میں کوئی قباحت نہیں ہمارے پاس سرمایہ موجود ہے اچھے ٹکنیشن موجود ہیں لیکن نمائش گھروں اور نگار خانوں کیلئے لائسنس بہت کم دیئے جاتے ہیں جس کی وجہ زرمبادلہ کی کمی بتائی جاتی ہے۔ زرمبادلہ اگر ایسا ہی کم ہے تو امریکی فلموں کی درآمد پر جو زرمبادلہ صرف ہوتا ہے اس میں کمی کر دی جائے۔

ایک تو اردو فلموں کیلئے پاکستان کا سرکٹ بہت محدود ہے اس پر اس قدر ٹیکس عائد کر دیئے گئے ہیں کہ یہ صنعت مکمل طور پر بوجھ کے نیچے دب گئی ہے فلمسازوں کو اتنے ٹیکس ادا کرنے پڑتے ہیں کہ ان کے پاس کچھ نہیں بچتا مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کے ٹیکس کے علاوہ میونسپلٹی ٹیکس، پبلسٹی ٹیکس، تفریحی

تماشائی

بچوں کی ایک تفریحی فلم

پریذیڈنٹ

فلمساز و ہدایت کار:۔ فضل الحق۔
مصنفہ:۔ رابعہ النساء
پیشکش:۔ فلم فیڈریشن ڈھاکہ

پاکستان کی پہلی فلم جو اردو اور انگریزی میں بنائی گئی ۔۔۔!
پاکستان کی پہلی فلم جو صرف بچوں کے لئے تیار کیگئی ۔۔۔!
پاکستان کی پہلی فلم جسکو پاکستان کے ہر بڑے شہر میں فلمایا گیا

۸ رفروری ۱۹۶۲ء کے "ڈان" نے اپنے اداریہ میں ایک اپیل کی تھی اور حکومت کی توجہ بچوں کے لئے تفریحی فلمیں فراہم کرنے اور خصوصی طور پر بچوں کے لئے نمائش گھر تعمیر کروانے کی طرف دلوائی تھی۔ حکومت نے اس طرف توجہ نہیں کی لیکن مشرقی پاکستان کے ایک ادارہ "فلم فیڈریشن" نے بچوں کے لئے فلمیں تیار کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور اس کی پہلی کوشش "پریسیڈنٹ" کی شکل میں ہم تک پہنچے گی کیونکہ یہ فلم بچوں کے لئے بنائی گئی ہے اس لئے اسکی کہانی بہت ہلکی پھلکی ہے اور بچوں کے ساتھ بڑوں کے لئے بھی تفریح فراہم کرے گی۔

ساگر اپنی بہن کیکا کے ساتھ صنعتی نمائش دیکھنے جاتا ہے جہاں اسکی بہن کیکا اغوا کر لی جاتی ہے ساگر اس غنڈے کو دیکھ لیتا ہے اور خاموشی سے اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ شور نہیں مچاتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر شور مچاتا ہے تو غنڈہ اس کو مار دے گا۔ غنڈہ کیکا کو لیکر چٹاگانگ جاتا ہے۔ اور وہاں سے کراچی آنے کے لئے پانی کے جہاز پر سوار ہو جاتا ہے۔ ساگر بھی اسی جہاز پر سوار ہو جاتا ہے ۔ غنڈہ اس کو پانی میں پھینکنے کی کوشش کرتا ہے لیکن بروقت امداد سے بچا لیا جاتا ہے ۔۔۔ ادھر ساگر اور کیکا کے ماں باپ پولیس کو مطلع کر دیتے ہیں اور پورے ملک کی پولیس کا عملہ حرکت میں آجاتا ہے ۔۔۔ کراچی پہونچ کر ساگر گلی گلی کیکا کو تلاش کرتا ہے اور غنڈے کا پیچھا کرتا ہے ۔۔۔ کراچی میں ساگر کو ایک نرم دل خاتون ملتی ہے جو اسکو پیسے وغیرہ دیتی ہے ۔۔۔ غنڈہ کیکا کو لے کر لاہور پہنچتا ہے ساگر بھی لاہور چلا جاتا ہے ۔۔۔ لاہور میں ساگر کو ایک پولس افسر ملتا ہے اور اس سے نام وغیرہ پوچھتا ہے۔ سادہ کپڑوں میں ہونے کی وجہ سے وہ اس کو بھی غنڈہ سمجھ کر بھاگ جاتا ہے اور پنڈی پہنچ جاتا ہے جہاں غنڈہ کیکا کو لے جا چکا ہے ۔۔۔ پنڈی میں ساگر کو دیکھ کر غنڈہ پشاور چلا جاتا ہے اور پشاور سے سوات چلا جاتا ہے ساگر بھی سایہ کی طرح اس کا پیچھا کرتا رہتا ہے

سوات میں ایک کسان گھرانہ اسکو اپنے یہاں پناہ دیتا ہے۔ سوات میں غنڈہ ساگر کو مارنے کی ایک اور ناکام کوشش کرتا ہے۔ لیکن قدرت پھر اس کا ساتھ دیتی ہے اور وہ بچ جاتا ہے ۔۔۔ سوات سے ساگر کیکا کو کسی طرح لیکر بھاگ جاتا ہے غنڈہ بھی بندوق لے کر اس کے پیچھے دوڑتا ہے لیکن ایک سواتی لڑکا اس کا راستہ روک لیتا ہے۔ اتنے میں پولیس آجاتی ہے اور ساگر اور کیکا کو اپنی حفاظت میں لے کر غنڈے کو گرفتار کر لیتی ہے سوات سے ساگر اور کیکا کو پی۔ آئی۔ اے کے جہاز میں بٹھا کر ڈھاکہ روانہ کر دیا جاتا ہے ۔ جہاز میں ان دونوں کی حیثیت عام آدمیوں کی سی، ہوتی ہے اور پی، آئی، اے کا اسٹاف ان سے بہت خلوص سے پیش آتا ہے۔ کچھ دیر میں ساگر اور کیکا ڈھاکہ پہونچ کر ماں باپ کی باہوں میں چلے جاتے ہیں۔

اس فلم میں ساگر کے ایڈونچر کے علاوہ بہت سے پہلو ہیں جن سے عام آدمی روشناس ہو جائیں گے مثلاً بحری بری اور فضائی ذرائع رسل و رسائل ۔ ڈھاکہ۔ کراچی لاہور ۔ چٹاگانگ ۔ سوات ۔ راولپنڈی وغیرہ کے حسین مناظر اور وہاں کے لوگوں کا کلچر۔ ساگر کی، دوستی سواتی کسان کے ساتھ۔ مشرقی اور مغربی ۔ پاکستان کی دوستی کا ایک سنبل ہے ۔۔۔ اس کہانی سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر پولیس کوئی موثر قدم اٹھاتی تو کیکا کو بہت پہلے برآمد کیا جا سکتا تھا ۔۔۔ اس کے علاوہ بچوں کے اغوا کی جو ایک عام وبا پھیلی ہوئی ہے یہ فلم اسکی طرف بھی ایک اشارہ کرتی ہے ۔۔۔ بہرحال مشرقی پاکستان کی عنقریب نمائش کیلئے پیش کی جانے والی فلم "پریسیڈنٹ" بہت سی خوبیوں کی حامل ہو گی



ساگر ۔ رانی سرکار ۔ اور کیکا
★
فلم پریذیڈنٹ میں

With

the Compliments

of

Aziz Jamall

